جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے کامیاب ایکسپورٹر بننے کا خواب حقیقت میں بدلیے ۶۴ الف

اُردو ڈائجسٹ

مئی 2015ء

www.urdudigest.pk urdudigest.com

ہندو سے مسلمان
پروفیسر بننے تک
۳۶

ہزاروں برس کی زندگی کا آرزومند انسان کیا مشین کے قالب میں ڈھل جائے گا؟

صفحہ ۷۸

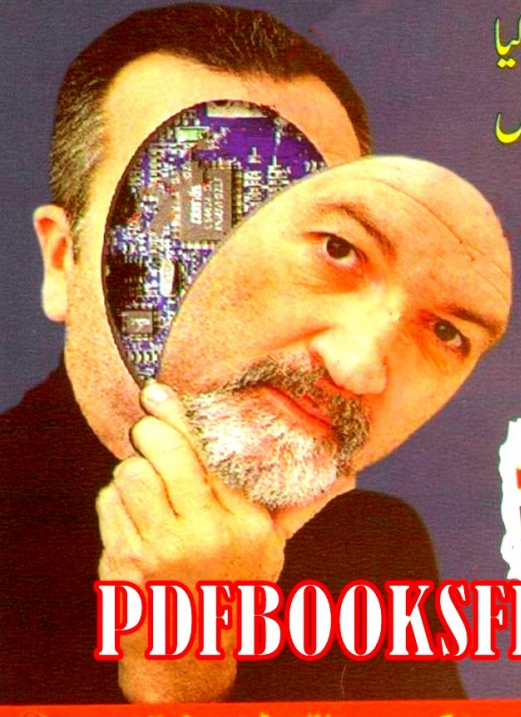

یمن میں
خانہ جنگی کی ڈرامائی کہانی
۱۹

PDFBOOKSFREE.PK

پنڈت نہرو کا عشق

کارگل جنگ میں ایک
مجاہد کی داستانِ شجاعت ۶۵

موبائل بیٹری محفوظ
رکھنے کے نادر گُر ۵۶

www.pdfbooksfree.pk

قارئین کے لیے نئے سال کا تحفہ

اپنے بچوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو ادب سے روشناس کرائیے، آپ گزشتہ شمارے اپنے دوستوں کو تحفتاً بھی بھجوا سکتے ہیں، یہ سہولت اندرون و بیرون ملک دونوں کے لیے میسر ہے۔

۱۲ شمارے	۶۰۰ روپے
۲۴ شمارے	۱۰۰۰ روپے
۳۶ شمارے	۱۵۰۰ روپے

ڈاک خرچ چیا کوریئر چارجز اس کے علاوہ ہوں گے

کامیاب افراد کے حالات زندگی، ملک کی نامور شخصیات کے دلچسپ و خصوصی انٹرویوز، سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی کہانیاں، حالات حاضرہ اور سیاست کے بدلتے رنگ، معاشرتی مسائل اور ان کا حل، شکاریات، اسلامی واقعات، سائنس، طب و صحت، ٹیکنالوجی، کیمیل، سیرت نبویؐ، اُردو ادب، افسانے، ڈرامے، تازہ ترین معلومات اور بہت کچھ.....

ایک شمارہ ۵۰ روپے میں

پہلے پائیے

شمارے حاصل کرنے کے لیے اپنا ایڈریس اور موبائل نمبر میسج کریں

subscription@urdu-digest.com

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

معبود

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے ارشاد فرمایا: اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، اس لیے میری ہی عبادت کرو۔ (الانبیا: ۲۵)

اللہ کی مدد

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیشک ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور قیامت کے دن بھی مدد کریں گے جس دن اعمال لکھنے والے فرشتے گواہی دینے کھڑے ہوں گے۔

(المومن: ۵۱)

رسول ﷺ کا فرمان

اہل جنت

حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”خطاب کے بیٹے! جاؤ، لوگوں میں یہ اعلان کردو کہ جنت میں صرف ایمان والے ہی داخل ہوں گے۔“

(رواہ مسلم، باب غلظ تحریم الغلول، رقم: ۳۰۹)

ایمان کا مزا

حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: ”ایمان کا مزا اس نے چکھا (اور ایمان کی لذت اُسے ملی) جو اللہ کو رب، اسلام کو دین اور محمد ﷺ کو رسول ماننے پر راضی ہو جائے۔“

(رواہ مسلم، باب الدلیل علی أن من رضی باللہ ربا، رقم: ۱۵۱)

www.pdfbooksfree.pk

مئی 2015ء
رجب المرجب 1436ھ
جلد نمبر 55 شمارہ نمبر 5
urdudigest.com www.urdudigest.p

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی
قاسم محمود
محمد اسلم لودھی، غلام جیلانی
حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ اعوان
فاروق اعجاز قریشی
افنان کامران قریشی
خالد محی الدین
عبدالرحمٰن، اشرف سکندر

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

advertisement@urdu-digest.cor
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: عمر اسلم 0300-4005579
لاہور: ندیم احمد گوجرانوالہ: احسان اللہ بٹ

خریداری کے لیے رابطہ subscri...n@urdu-digest.co
19/2 اے، سکیم، سمن آباد، لاہور فون 92 42 37589957
...ستان 1560 کے بجائے 1000 روپے ...
...ون ملک 160 امریکی ڈالر
...ن و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ ... ڈرافٹ
...ج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں
URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Ba... of Punjab (Samanabad, Lahore.)
B...nch Code No. 110

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G- جوہر ٹاؤن، لاہور
...نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
...میل: editor@urdu-digest.com

...ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24 سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

غیر جذباتی، پراسرار چینی قوم

شنگھائی میں مصروف ترین ایک ہفتہ گزارنے کے بعد ہماری اگلی منزل شینڈونگ کا دارالحکومت جینان شہر تھا۔ ہماری ہنستی مسکراتی چینی میزبان یانگ، جو جینان شہر کے دو روزہ دورے کے دوران مترجم کا کردار ادا کرتی رہی نے ریلوے اسٹیشن کے باہر ہمیں الوداع کہا۔ میں اور برادر ذکی اعجاز آرام دہ وین سے نکل کر اپنا سامان تھامے بیجنگ جانے کے لیے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک نگاہ عمارت کی پیشانی پر آویزاں ایک بہت بڑی اسکرین پر گئی، تو دیکھا چین کا سرکاری چینل (CCTV) چینی صدر شی جن پنگ کے دورۂ پاکستان کی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ چینی بڑی توجہ سے اپنے لیڈر کا پاکستان میں پُرتپاک استقبال دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

پچھلے بیس سال میں مجھے متعدد بار چین جانے اور مختلف صوبوں، شہروں اور قصبوں کی سیاحت کے ساتھ ساتھ ان کی صنعتیں بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اب ہر کاروباری شعبے کی سب سے بڑی عالمی نمائش کسی چینی شہر میں منعقد ہوتی ہے۔ چند سال پہلے تک یہ نمائش امریکا یا یورپ کے بڑے شہروں میں منعقد ہوتی تھی لیکن اب حالات بدل چکے۔ خصوصاً شنگھائی کا نیو انٹرنیشنل ایکسپو سنٹر بین الاقوامی نمائشوں کا مرکز بن چکا۔ اس دفعہ بھی دورے کا اہم مقصد شنگھائی میں منعقدہ ایک نمائش اور کانفرنس میں شرکت کرنا تھا۔

دورے کے دوران بہت سے کاروباری اور صنعتی اداروں کے سربراہان سے ہماری ملاقات ہوئی۔ وہ سب چینی صدر کے دورۂ پاکستان سے بہت خوش تھے۔ چاہتے ہیں کہ پاکستان سے معاشی تعلقات میں مزید مضبوطی آئے۔ چین کو اپنی معاشی ترقی کو برقرار رکھنے کے لیے پاک چین اقتصادی راہداری کی اشد ضرورت ہے۔ وہ یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم مصمم کر چکے۔ اس حوالے سے چینی حکومت نے پاکستان کے تمام سیاست دانوں خصوصاً مذہبی راہنماؤں کو بار بار چین بلا کر ان کے شکوک و شبہات ختم کیے۔ اکنامک کوریڈور سے صوبوں سے سنکیانگ کے لاکھوں مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ پاکستان کے جھنگ جیسے کم ترقی یافتہ علاقے بھی بے انتہا فوائد پائیں گے۔ اکنامک کوریڈور کے منصوبوں میں زیادہ تر چینی کمپنیاں ہی کام کریں گی۔ منصوبوں کی تکمیل کے بعد اپنا سرمایہ مع منافع اپنے ملک لے جائیں گی۔ لیکن بہرحال یہ منصوبے طویل مدت تک پاکستان کو فائدہ پہنچاتے رہیں گے۔

پست قامت، چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور ننھے منے ہاتھوں والے چینی جنھیں

www.pdfbooksfree.pk

انگریزی زبان کے چند فقرے سیکھنے میں کئی سال لگ جاتے ہیں، انھوں نے کرشمے کر دکھائے ہیں۔ ان کے کامیاب ہونے کی ایک بڑی وجہ ریاست اور حکومت کا طاقتور اور مستعد ہونا ہے۔ چین کی آبادی ایک ارب ۳۶ کروڑ ہے۔ پھر وہاں کروڑوں سیاح آتے ہیں۔ ان سب کی نقل و حرکت پر جگہ جگہ نصب کیے سی سی ٹی وی کیمروں اور خفیہ اداروں کے ذریعے ریاست ہر وقت نظر رکھتی ہے۔ کوئی بزنس مین، فنکار اور مذہبی شخصیت ریاست سے زیادہ طاقتور نہیں۔ وردی میں ملبوس کم عمر، پست قامت اور کمزور سے چینی کے سامنے امیر و غریب سب قطار لگا کر کھڑے ہوتے ہیں۔

چین میں شہری گوگل، واٹس ایپ، وائبر اور فیس بک کا استعمال نہیں کر سکتے، کیونکہ حکومت نے اپنے تیار کردہ متبادل سافٹ ویئر انھیں دیے ہیں تاکہ ان کے ڈیٹا پر اپنا کنٹرول رکھ سکے۔ ای میل کے نظام پر بھی حکومت کی کڑی نظر ہے اور کئی فلٹروں کے بعد ہی ای میل متعلقہ کمپیوٹر تک پہنچ پاتی ہے۔

چینی دراصل غیر جذباتی اور پُراسرار قوم ہے۔ نئی نسل مذہب سے بہت دور ہو چکی۔ آبادی پر کنٹرول کے لیے چین نے ایک بچے کی پالیسی اپنائی۔ اس کا فائدہ تو بہت پہنچا، لیکن اب حالت یہ ہے کہ ایک نوجوان کو اوسطاً ۱۲ بوڑھوں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ صحت کی اچھی سہولتوں سے عمریں طویل ہو گئیں اور اب بوڑھوں کا بوجھ نوجوان اٹھا رہے ہیں۔ نوجوان نسل میں اسلام اور پاکستان سے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن چینیوں کے دلوں میں پاکستان کے لیے احترام اور محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

بڑھتی ہوئی مہنگائی نے چینی عوام کے لیے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ مختلف وجوہ کی بنا پر امریکا، روس اور یورپ میں چینی اشیا کی ایکسپورٹ بتدریج کم ہو چکی جس کا منفی اثر چینی معیشت پر بھی پڑا۔ اسی لیے حکومت اکنامک کوریڈور جیسے منصوبوں پر تیزی سے عمل کر کے اپنی معیشت میں بہتری لانا چاہتی ہے۔

چینی ترقی کا بیشتر سہرا انفراسٹرکچر کی تعمیر پر ہے۔ بڑی بڑی ہائی ویز، تیز رفتار ریل کا نظام، بے شمار ہوائی اڈے، اونچے اونچے ٹاورز اور عمارتیں، آبی ڈیم اور مصنوعی زونز کسی اندرونی و بیرونی تنازع میں الجھے بغیر تعمیر کرتے چلے جانا بھی اس قوم کی ترقی کا راز ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ بڑے بڑے منصوبے بن تو رہے ہیں، لیکن چین اور پاکستان کے مابین براہ راست ذریعہ آمد و رفت صرف پی آئی اے ہے۔ پی آئی اے کی ہفتے میں صرف دو پروازیں بھگت جاتی ہیں۔ تھائی ایئرویز کے ذریعے جائیں، تو بنکاک ہوائی اڈے پر نو گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چین کی تو کوئی پرواز پاکستان آتی ہی نہیں۔ یہ مسئلہ مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان اور چین کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ دیگر تمام بڑے پاکستانی و چینی شہروں کے لیے اپنی ایئر لائنوں کی براہ راست پروازوں کا بندوبست کریں۔ یوں سفر جلد طے ہونے سے باہمی کاروبار و تجارت میں روز افزوں اضافہ ہوگا۔

سائنس و ٹیکنالوجی کی مدد سے

انسان ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے؟

ان نرالے انسانوں کی تحیر خیز کہانی جو سائنسی تجربوں کے سہارے لافانی حیات کا خزانہ پانے نکلے ہیں

سید عاصم محمود

www.pdfbooksfree.pk

فہرست

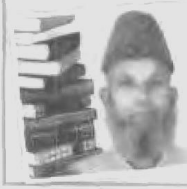

ہندو جو مسلمان ہو کر پروفیسر بنا

یہ ایک ایسے خوش قسمت انسان کی آپ بیتی ہے جو ہندو گھرانے میں پیدا ہوا لیکن اوائل عمری ہی میں خواب کی حالت میں نبی کریم ﷺ کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ مسلمان ہونے کی خبر جب خاندان کو پہنچی، تو انھوں نے اُسے دوبارہ ہندو بنانے کے لیے بے شمار ہتھکنڈے آزمائے لیکن وہ مذہب اسلام پر سختی سے قائم رہا۔ یہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز داستان مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۳۶

میں نے کینسر کا مریض صحت یاب کر دیا

یہ انٹرویو ایک ایسے معالج کا ہے جو پردہ چشم کے دائروں، رنگوں اور دیگر خصوصیات کا جائزہ لے کر قدرتی طریقہ علاج (جڑی بوٹیوں) سے تمام انسانی بیماریوں کا شافی علاج کرتے ہیں۔ بطور خاص سرطان، گھٹنوں کے درد، ذہنی دباؤ کے کتنے ہی مریض ان کی تحقیق سے شفا پا چکے۔ ان کی باتیں موذی مرض میں مبتلا مریضوں کے لیے مفید معلومات رکھتی ہیں۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۲۴

اردو ادب کے محتسب

راشد اشرف کا یہ مضمون اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور مزاح نگار مشفق خواجہ کی شخصیت، ادبی خدمات اور مزاحیہ تحریروں کا احاطہ کرتا ہے۔ آپ روزنامہ جسارت اور تکبیر میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ جن لوگوں پر آپ نے مزاحیہ کالم لکھے، اُن کے انتقال پر وہ سب سے زیادہ یہ کہتے ہوئے روئے کہ اب ہم پر کون قلم اٹھائے گا؟ یہ دلچسپ سوانحی مضمون مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۸۴

ایک روپے کا سوال

اردو کے ممتاز کہانی کار، بلونت سنگھ کا یہ منفرد افسانہ ایک افسر اور وفادار ہیڈ کلرک رگوناتھ کے درمیان ہونے والی پراثر گفتگو اور انسانی شبت رویّے کو زیر بحث لاتا ہے۔ زلزلے میں سب کچھ تباہ ہونے کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ہیڈ کلرک رگوناتھ کے گھر کچھ نہیں بچتا۔ لیکن غیرت نے اُسے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہ دی۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۷۲

شیطان کا وار

یہ ایسا معاشرتی موضوع اجاگر کرتی کہانی ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ بعض اوقات انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا عمل کر گزرتا ہے جو اس کی شان اور عزت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ توقیر عائشہ کی اس کہانی میں بھی ایک معزز و محترم شخص کے ذہن میں ایسی منفی سوچ پیدا ہوئی جس سے وہ خود کو قصوروار ٹھہرا کر مجرم تصور کرنے لگا۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۵۶

www.pdfbooksfree.pk

انٹرنیٹ کی مدد سے کامیاب ایکسپورٹر بنیے

کامیاب کاروباری بننے کی خواہش تو ہر دل میں موجود ہے لیکن جن راستوں پر چل کر یہ منزل حاصل کی جاسکتی ہے، وہ ہر کسی کی دسترس میں نہیں آپاتے۔ طیب طارق نے اس مضمون میں تحقیق کے ساتھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو خصوصاً ایکسپورٹ کے کاروبار کی بابت ہر سطح پر قارئین کی بہت راہنمائی کرتی ہیں۔ مزید تفصیل جاننے کے لیے پڑھیے صفحہ نمبر: ۶۴ الف

کھیوڑہ سے کلر کہار تک

اس منفرد سفرنامے میں مصنف نے دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان ''کھیوڑہ''، ہندومت کے تاریخی مقام ''کٹاس راج'' اور خوبصورت وادیوں کی سرزمین ''کلر کہار'' کی تاریخ اور قدرتی مقامات اپنے قلم کا موضوع بناتے ہوئے ان کے بارے میں بے شمار معلومات فراہم کی ہیں۔ دلچسپ سفرنامہ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۴۶

بیٹی گھر کی رونق بن گئی

بچے ہی ہر گھر میں رونق بڑھاتے ہیں۔ یہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا خاص تحفہ ہیں۔ جہاں بچے نہ ہوں، وہ گھر ویرانے کی شکل دھار لیتا ہے۔ اس آپ بیتی میں ایک والد نے اپنی حاضر دماغ بیٹی کی دلچسپ باتیں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کی ہیں۔ ان میں خوبصورتی، سادگی، محبت اور چاہت کا بھرپور احساس موجود ہے۔ اس دلچسپ اور محبتوں بھری کہانی کو مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۷۲

سرکہ کارگل کا دلیر جیالا

دنیا کے بلند اور مشکل ترین محاذ جنگ میں پاک فوج کے بہادر اور غیور جوانوں نے اپنے لہو سے بہادری کی ایسی داستانیں رقم کی ہیں جن کا ذکر تا قیامت دنیا کی عسکری تاریخ میں ہوتا رہے گا۔ لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن جو بھارتی فوج سے دست بدست جنگ کرتے ہوئے کارگل کے میدان میں شہید ہوئے۔ جرأت اور بہادری کی اس داستان کو مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۶۵

مردہ کا ٹیلی فون

سلیم اختر کی یہ پراسرار کہانی دولت کی ہوس اور لالچ کے اندھے پن میں مبتلا ایک نوجوان جبار کے گرد گھومتی ہے جو چودہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگا اور اس وقت واپس آیا جب والد سمیت جائداد کے تمام حقیقی وارث فوت ہو چکے تھے۔ اسی لالچ میں وہ اپنی بیگم کو ساتھ لیے تابوت خانے میں اتر گیا جہاں اس کے باپ دادا اور پردادا تابوتوں میں دفن تھے۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۹۰

www.pdfbooksfree.pk

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

15 کچھ اپنی زباں میں | 17 ہم کہاں کھڑے ہیں

اسلامی زندگی کی کہکشاں

33 خزانے کا مالک — بشیر احمد بھٹی
ایک ملازمہ کی کتھا جس نے قانونی پیچیدگی آسانی سے حل کر ڈالی

42 اسلام سے دور ہوتے مسلم — ڈاکٹر ندیم بھٹی
عالم اسلام میں پہنچنے والا دور جدید کا ایک المیہ

46 حضرت جنیدؒ بغدادی — پروفیسر خالد پرویز
نیکی کا راستہ دکھلانے والے نصیحت آموز واقعات

اُردو ادب

58 شاہ رخ خان! اس سے ڈرلو — نیلم احمد بشیر

86 من کا بوجھ — جاوید بسام

92 شیر یا دوشیزہ — ابوالاثر حفیظ جالندھری

113 وہ لڑکی تو ٹھگ نکلی — راحت عائشہ

120 میں نے قربانی کا بکرا نہیں بننا — سلمیٰ اعوان

142 دیکھنے والا اندھا — تنویر اقبال واگھوارہ

162 دنیا کا سب سے بڑا احمق — جیک رچی

181 مردہ دلھن زندہ ہوگئی — ناہید ہاشمی

209 شعرِ اقبال راہنمائے ملت ہے — محسن فارانی

طب و صحت

169 انسانی جسم کا ایک اہم غدہ — عالیہ فاطمہ

رنگارنگ تحریریں

29 یمن خانہ جنگی کا نشانہ — محمد علی صدیقی

50 بچے نے بزرگوں کو سبق سکھایا — صالحہ محبوب

54 مجھے مشوروں سے بچاؤ — عبدالغفار نوابشاہی

56 موبائل بیٹری تا دیر چلائیے — ابوصارم

89 گدھے کا گوشت — ہادی خان

98 ورلڈ کپ کی وبا — عائشہ ظاہر

109 دنیا کے رنگ برنگے تہوار — محمد خلیل چودھری

128 اُڑنے والا انجن — فقیر اللہ خاں

131 مجھے اپنے باپ پر فخر ہے — محمد اسلم لودھی

152 شادی کی سلامی — سراج دین

177 پاکستان مسلم اکثریتی علاقوں سے محروم — رضی الدین سیّد

201 پانچ عظیم پاکستانی — حبیب اشرف صبوحی

206 تہمت لگا، پیسا کما — کنہیالال کپور

214 مجھے سمندر کی تلاش ہے — ملک محمد شاہد اقبال

217 شادی شدہ جوڑے — خادم حسین مجاہد

228 شاکی بیوی کا جواب — پروفیسر شبانہ اصغر

مستقل سلسلے

235 قصہ کوئز | 237 چمن خیال | 230 تبصرہ کتب

100 مشورہ حاضر ہے | 240 بوجھو تو جانیں

www.pdfbooksfree.pk

صدر شی چن پنگ کے دورۂ پاکستان کے موقع پر جو حیات افروز مناظر طلوع ہوئے' ان سے اُمیدوں کا ایک چمن کھل اٹھا ہے۔ اُمید ہی نوجوانوں کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے اور اب پوری قوم کو شاہراہ اُمید پر ایک نئے عزم اور ایک نئے اعتماد کے ساتھ سفر کا آغاز کرنا چاہیے۔ ایک ایسے وقت میں جب پاکستان سنگین آزمائشوں سے دوچار ہے' ہمارے سب سے قابل اعتماد اور آزمودہ دوست نے ہمارا ہاتھ مضبوطی سے تھاما' ہمیں اپنی اہلیت' صلاحیت اور عظمت کا احساس دلایا ہے اور یہ مژدہ بھی سنایا ہے کہ ہم جلد ایشین ٹائیگر بن سکتے ہیں۔ چین کے صدر نے پاکستان کو اپنا ''فولادی بھائی'' قرار دیا اور اعلان کیا کہ چین کے عوام اپنے بھائیوں کے استحکام' ترقی اور خوشحالی کے لیے تعاون کی راہیں کشادہ کرتے جائیں گے۔ پارلیمان کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے پاکستان کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ آپریشن ضربِ عضب دہشت گردی کے قلع قمع میں زبردست کردار ادا کر رہا ہے اور ہمارے مغربی علاقے بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس پر وزیراعظم نواز شریف نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا: ''چین کی سلامتی پاکستان کی سلامتی ہے۔'' ان مخلصانہ جذبات پر مبنی تقاریر سے پہلے ۴۶ ارب ڈالر کے معاہدوں اور منصوبوں پر دستخط ہوئے اور چین کے صدر نے بعض منصوبوں کی نقاب کشائی بھی کی جن میں پارلیمان ہاؤس کوئٹہ کی توانائی فراہم کرنے کا منصوبہ ایک بہت بڑی علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔

آئندہ دس پندرہ برسوں میں پاکستان کے اندر چھیالیس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری اسے ایک عظیم الشان اقتصادی تبدیلی سے ہمکنار کر سکتی اور توانائی کے شعبے میں زبردست انقلاب لا سکتی ہے۔ ان معاہدوں میں ۳۲ ارب ڈالر توانائی کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ چین پاک اقتصادی راہداری' جس پر ۲۰۱۳ء میں وزیراعظم کے دورۂ چین کے موقع پر دستخط ہوئے تھے' اس میں گوادر سے کنجراب تک ریل اور سڑکوں کا جال بچھانا اور صنعتی منطقے قائم کرنا اور چین کو گوادر کے ذریعے افریقہ اور یورپ کے براعظموں کے دل تک پہنچنے کا ایک مختصر اور محفوظ راستہ فراہم کرنا ہے۔ یہ وہی گزرگاہ ہے جہاں سے دنیا کی ساٹھ فیصد تجارت اور تیل کی رسد فراہم ہوتی ہے۔ چین اس وقت دنیا کی دوسری بڑی معاشی طاقت ہے۔ وہ اپنی تجارت کو فروغ دے کر سپر پاور بننے کی تیاری کر رہا ہے اور پاکستان اس کا ہم سفر ہے۔ ان معاشی سرگرمیوں سے پورے خطے کی تقدیر بدل سکتی اور پاکستان علاقائی تجارت کا مرکز بن سکتا ہے۔ قوموں کی

www.pdfbooksfree.pk

زندگی میں ایسے نادر مواقع شاذونادر ہی آتے ہیں۔ پاکستان نے چین کا ہاتھ اس آن استقامت اور جرأت سے تھاما جب وہ دنیا میں تنہا تھا اور اس کے ساتھ رابطے پیدا کرنا عظیم طاقتوں کی نگاہ میں بہت بڑا جرم تھا۔ امریکہ نے چین کو آزادی کے تیس برس بعد تسلیم کیا جبکہ پاکستان نے تمام خطرات کو خاطر میں لائے بغیر اسے تسلیم کرنے میں پہل کی تھی۔ اب اس دوستی کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔

اتنی بڑی سرمایہ کاری کے ثمرات عام آدمی تک پہنچانے کے لیے حکومت پاکستان اپنے اندر بڑی تبدیلیاں لانے کا عمل فوری طور پر شروع کر سکتی ہے۔ ہمارا انتظامی ڈھانچہ انتہائی فرسودہ ہے اور سیاسی نظام کے اندر بھی شفافیت لانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری کمپنیاں اور ہمارے مزدور عالمی معیار سے بہت نیچے ہیں اس لیے ہمیں اصلاحات کی ایک تحریک چلانا ہوگی اور استعداد کار میں اضافے کے لیے بڑے پیمانے پر تربیتی مراکز قائم کرنا ہوں گے۔ اس کے علاوہ اچھی حکمرانی اور قابل اعتماد ڈلیوری سسٹم کے قیام پر خصوصی توجہ دینا ہوگی۔ ایک اہم بات یہ کہ قوم کے اندر چینی زبان سیکھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ منصوبوں پر کام کرنے کے لیے لاکھوں چینی پاکستان آئیں گے اور سنکیانگ کے پس ماندہ علاقوں میں کام کرنے کے لیے اتنی ہی تعداد میں پاکستانیوں کی مانگ پیدا ہوگی۔ مناسب ہوگا کہ چینی زبان پڑھانے کے انتظامات اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں شروع کر دیے جائیں جو دائمی دوستی کو ایک عظیم تہذیبی معنویت اور بلندی سے ہم کنار کریں گے۔

ہمیں اس حقیقت کا ادراک بھی ہونا چاہیے کہ بعض ممالک اور عناصر کے لیے پاکستان اور چین کی اسٹریٹجک شراکت داری اور اتنے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری بڑی تکلیف دہ ہوگی۔ وہ اقتصادی راہداری کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات کو ہوا دیں گے۔ اس کا سب سے مؤثر دفاع حکومت کے دانش مندانہ اور منصفانہ اقدامات ہی سے ہو سکے گا۔ اقتصادی راہداری کے مختلف نقشے گردش کر رہے ہیں جن سے خدشات جنم لے سکتے ہیں۔ وہ علاقے جہاں سے شاہراہیں گزریں گی اور ترقیاتی منصوبے شروع ہوں گے وہاں کے نمائندہ لوگوں اور پارلیمانی جماعتوں کے سربراہوں کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ اب جمہوریت کا دور دورہ ہے اور اس واقعے پر جائز گرفت ہو رہی ہے کہ معاہدوں پر دستخطوں کی تقریب میں تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کیوں شامل نہیں کیے گئے۔ یہ معاملات غیر معمولی احتیاط اور چابک دستی اور دوراندیشی کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ معاہدے اور منصوبے دونوں طرف کے عوام کی پُرجوش تائید برسوں کی ریاضت سے وجود میں آئے ہیں اس لیے انھیں عوام کی تائید حاصل ہے۔ انشاءاللہ یہ وقت پر تکمیل پذیر ہوں گے۔ فوجی قیادت نے چینی کارکنوں کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک الگ ڈویژن قائم کر کے کامیابی کا سگنل دے دیا ہے۔

الطاف حسن قریشی

www.pdfbooksfree.pk

غیر ذمے دارانہ رویوں کے شرارے

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

ہماری تاریخ میں جہاں اچھے فیصلوں کے سہانے مناظر دکھائی دیتے ہیں، وہاں جذباتی لمحات میں اختیار کیے گئے سیاسی رویوں کی تپش بھی محسوس ہوتی ہے۔ آج ہم جن مشکلات کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں، اُن کے اسباب میں وقتہ نظر حکمرانوں کی بے تدبیریوں کے علاوہ بعض خودسر اور خود پسند سیاست دانوں کے غیر ذمے دار فیصلے بھی شامل ہیں۔ ہم اگر دیانتداری سے اُن کا محاسبہ نہیں کریں گے تو تاریخ ہمارا تیا پانچہ کر کے رکھ دے گی۔ قدرت نے پاک چین دوستی کی صورت میں ہمیں اپنی حالت بہتر بنانے کا ایک نادر موقع عطا کیا ہے۔ اس کا اولین تقاضا ہے کہ ہم اُمید کے چراغ فروزاں رکھیں۔ اپنی ملّی تاریخ کے مطالعے سے یہ تلخ حقیقت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ دو افراد کے درمیان اقتدار کی کشمکش یہ حد سے بڑھی ہوئی نفرت نے ہماری سیاست میں بہت بگاڑ پیدا کیا ہے۔ پاکستان کے وجود میں آتے ہی وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خاں اور حسین شہید سہروردی کے درمیان سیاسی رقابتوں کا سلسلہ چل نکلا جس سے مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان بدگمانیاں جنم لینے لگیں۔ اس کے ساتھ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمان کے مابین عوام کی حمایت حاصل کرنے کی خطرناک دوڑ شروع ہوگئی اور صوبائی خودمختاری کا مطالبہ علیحدگی کی حدوں کو چھونے لگا۔ مولانا بھاشانی نے ''جگتو فرنٹ'' بن جانے پر ۱۹۵۴ء ہی میں مغربی پاکستان کے عوام کو ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے السلام علیکم کہہ دیا تھا۔

پنجاب میں جناب افتخار حسین ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کے مابین سیاسی کشمکش ایک ایسی گمبھیر شکل اختیار کر گئی تھی کہ بابائے قوم قائداعظم بھی اس کا مداوا نہ کر سکے۔ اسی رسہ کشی میں جمہوریت کا چراغ گل ہوا۔ آپ تاریخ کریدتے جائیے اور آپ کو ہر مرحلے پر دو متحارب گروپ نظر آئیں گے جن کی حشر سامانیاں آج بھی آگ کو ہوا دے رہی ہیں اور شرارے شعلوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ دہشت گردی کا عفریت کیسے پیدا ہوا؟ انتخابات میں منظم دھاندلی کی تحریک میں پس پردہ عناصر کہاں کہاں تھے؟ ہمارے سعودی عرب سے تعلقات میں نقب لگانے کی سازش کہاں پر تیار ہوئی اور ایم کیو ایم کو حیات نو بخشنے کی تیاریاں کس طرف سے ہو رہی ہیں۔ ان عجیب و غریب واقعات کے پس منظر میں ہمارے بعض سیاست دانوں اور اداروں کے آمرانہ اور انتہائی غیر ذمے دارانہ رویے اور فیصلے شامل ہیں جن کی نشاندہی مستقبل میں پہنچنے والے نقصان کی روک تھام کے لیے ناگزیر ہے۔

☆☆

www.pdfbooksfree.pk

چین کے صدر کا دورۂ پاکستان ستمبر ۲۰۱۴ء میں طے پا چکا تھا جو آٹھ ماہ کی تاخیر سے ۲۰/اپریل ۲۰۱۵ء کو وقوع پذیر ہوا۔ یہ تاخیر ان دھرنوں کے باعث ہوئی جس کی دُھول عمران خاں اور علامہ طاہرالقادری کئی ماہ تک پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں اُڑاتے اور شاہراہ دستور پر قابض رہے۔ چیئرمین صاحب جب بارہ اگست کی رات لاہور سے روانہ ہوئے تو انھیں کمک پہنچنے کے انتظار میں دس بارہ گھنٹے گوجرانوالہ میں قیام کرنا پڑا۔ انھیں معلوم تھا کہ ستمبر میں چین کے صدر پاکستان کا دورہ کرنے والے ہیں' اس کے باوجود انھوں نے دارالحکومت میں لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کیا' پارلیمان ہاؤس کے گیٹ کا محاصرہ کیے رکھا' ایوانِ صدر کی طرف جانے والے راستے کنٹینر لگا کر بند کر دیے اور وزیراعظم ہاؤس پر حملے جاری رکھے۔ کچھ روز بعد ٹی وی اسٹیشن پر بھی بلہ بول دیا اور دنیا کو پیغام دیا کہ اُن کا حکومت پر قبضہ ہو گیا ہے۔ یہ ڈراما چار ماہ تک جاری رہا اور پولیس فورس کو بہت بڑے عذاب سے گزرنا پڑا۔ عمران خاں اس دوران فرماتے رہے کہ چین کے صدر کا پاکستان آنے کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا اور حکومت نے اُن کے فرضی دورے کا ایک افسانہ تراش رکھا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے رہے کہ امپائر کی انگلی اُٹھے گی اور سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ وہ اُن دنوں خواہشات کے گھوڑے پر سوار تھے اور سیاسی اخلاقیات اور انسانی قدریں بے دردی سے روندتے چلے جا رہے تھے۔ انھیں فوج کے اندر چند جرنیلوں اور ریٹائرڈ فوجی افسروں نے پورا یقین دلا دیا تھا کہ عدالت عظمیٰ کے ذریعے موجودہ حکومت معزول کر دی جائے گی اور ٹیکنوکریٹس کی حکومت ان کی سربراہی میں قائم ہو گی۔ وہ پارلیمان کو بھی تہس نہس کرنے پر تلے ہوئے تھے اور قومی اسمبلی سے استعفے دے دیے تھے' لیکن پارلیمان کا مشترکہ اجلاس ہفتوں جاری رہا جس نے وزیراعظم کی قانونی حکومت کا ساتھ دیا۔ دریں اثنا تحریک انصاف کے منتخب صدر مخدوم جاوید ہاشمی نے عمران خاں کا پورا خفیہ منصوبہ بے نقاب کر دیا اور کھلے بندوں کہا کہ خاں صاحب جو کچھ کر رہے ہیں' اسے کور کمیٹی کی تائید حاصل نہیں۔

۱۶/دسمبر ۲۰۱۴ء کی صبح آرمی پبلک اسکول پشاور پر دہشت گردی کے دلخراش واقعات کے بعد انھوں نے دھرنے ختم کر دینے کا اعلان کیا' مگر دنیا کو یہ پیغام دے گئے کہ پاکستان کا دارالحکومت غیر محفوظ ہے' ریاست ناکام ہوتی جا رہی ہے اور کسی سربراہِ مملکت کا وہاں آنا خطرے سے خالی نہیں۔ اُن کی ہٹ دھرمی اور عاقبت نااندیشی سے قومی مفاد اور ملکی معیشت کو ناقابلِ تصور نقصان پہنچا اور چین کی قیادت یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ پاکستان سے معاملات کرتے وقت سیکیورٹی کو اوّلین اہمیت دینا ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰/اپریل کو جو منصوبے اور معاہدے ہوئے' اُن کی اور چینی کارکنوں کی حفاظت کے لیے فوج کو ایک اسپیشل ڈویژن کھڑا کرنا پڑا ہے۔

۲۰۱۳ء کے انتخابات کے ایک سال بعد عمران خاں نے منظم دھاندلی کا شور مچا دیا اور تحقیقات کے لیے عدالت عظمیٰ کے جج صاحبان پر مشتمل عدالتی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا۔ ان کے مطالبے سے دو روز پہلے وزیراعظم نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو عدالتی کمیشن تشکیل دینے کے لیے خط لکھ دیا تھا' مگر حکومت اور تحریک انصاف کے درمیان کمیشن کی شرائط پر مہینوں مذاکرات ہوتے اور ٹوٹتے رہے' آخر کار وہ ایک مسودے پر متفق ہو گئے جس کے مطابق سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس نے حکومت کی درخواست پر بلاتاخیر کمیشن اپنی سربراہی میں تشکیل دے دیا اور دوسرے ہی روز سیاسی جماعتوں کو منظم دھاندلی کے ثبوت ایک ہفتے کے اندر پیش کرنے کے احکام صادر کیے۔ سات روز گزرنے کے بعد تحریک انصاف نے مزید مہلت طلب کی جو واضح اشارہ تھا کہ سرے سے ہوم ورک ہی نہیں ہوا۔ جناب عبدالحفیظ پیرزادہ نے کمیشن کے روبرو موقف اختیار کیا

www.pdfbooksfree.pk

کہ ۱۳ مئی ۲۰۱۳ء کی نصف شب نواز شریف نے ٹی وی پر اپنی کامیابی کا جو اعلان کیا' وہ منظم دھاندلی کے زمرے میں آتا ہے۔ کمیشن نے پوچھا آپ کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ اس نے متعلقہ سیاسی جماعتوں سے کہا ہے کہ وہ اس امر کا ٹھوس ثبوت لے کر آئیں کہ منظم دھاندلی کا منصوبہ کس نے بنایا اور اس پر کس نے عمل کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تحریک انصاف کے پاس منظم دھاندلی کے ٹھوس ثبوت موجود ہی نہیں اور وہ غیر متعلق واقعات کی ایک لاکھ چوبیس ہزار صفحات پر مشتمل رپورٹ کمیشن میں داخل کر کے معاملے کو الجھانا چاہتی ہے۔ کنونشن بورڈز کے حالیہ انتخابات نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات کی صحت پر بڑی حد تک مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عدالتی کمیشن کسی منظم دھاندلی کا سراغ نہیں لگا سکے گا اور عمران خاں کو ایک بار پھر خفت کا سامنا کرنا ہوگا کہ جذباتی فیصلے آخر کار تباہی اور ذلت کا باعث بنتے ہیں۔

عمران خاں نے اپنی جماعت کی اکثریتی رائے کے خلاف اپنی تنظیم کے اندر انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا اور ناتجربہ کاری اور وقت کے شدید دباؤ کے تحت قواعد وضوابط کی پاسداری نہ ہو سکی اور ان گنت شکایات منظر عام پر آئیں' جنھیں چیئرمین صاحب مسترد کرتے رہے۔ چند ہی ماہ پہلے ان داخلی انتخابات کے بارے میں جسٹس (ر) وحیدالدین احمد کی رپورٹ سامنے آئی تھی جو الیکشن ٹریبونل کے سربراہ کی حیثیت سے پیش کی گئی۔ اس کے مطابق پارٹی کے داخلی انتخابات میں بڑی دھاندلی ہوئی' بہت پیسہ چلا اور عہدے خریدے گئے۔ اس رپورٹ کے بعد چیئرمین عمران خاں نے تمام انتخابات کالعدم قرار دے دیے اور مختلف سطح پر انتخابات کے ذریعے قائم شدہ تنظیمیں توڑ ڈالیں۔ فرد واحد کے آمرانہ فیصلے کو یہ دوسری بڑی شکست ہوئی ہے۔ تیسری شکست بھی منڈلا رہی ہے' کیونکہ فاضل جسٹس (ر) وحیدالدین احمد نے اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ جو ارکان قومی اسمبلی سے چالیس دن سے زائد غیر حاضر رہے' اس کی رکنیت آئین کی رو سے ختم ہو گئی ہے۔ اس پر چیئرمین صاحب نے الیکشن ٹریبونل تحلیل کر ڈالا۔ یہ غیر جمہوری فیصلہ پارٹی کے اہم لوگوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فاضل جسٹس (ر) وحیدالدین احمد جو بڑے منصف مزاج اور زیرک انسان ہیں' انھوں نے عمران خاں کو بڑا صائب مشورہ دیا ہے کہ دنیا کو بدلنے سے پہلے انھیں اپنے رویے بدلنا ہوں گے۔

☆☆☆

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت عدالتی کمیشن قائم ہو رہا تھا' عین انھی دنوں یمن میں حوثی قبائل صدر ہادی کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے تھے اور دارالحکومت صنا کے علاوہ عدن بندرگاہ پر بھی حملے شروع کر رہے تھے۔ اسی خطرے کی پیش بندی کے لیے سعودی عرب کے فرمانروا سلمان بن عبدالعزیز نے وزیراعظم نواز شریف کو دورے کی دعوت دی۔ پہلی بار اُن کا ہوائی اڈے پر استقبال کیا۔ انھی دنوں ہمارے ہاں سینیٹ کے انتخابات آخری مراحل میں تھے' اس لیے شہباز شریف اسی رات واپس آ گئے' تاہم نواز شریف اور وفد کے ارکان کی سعودی عرب کی اہم شخصیتوں سے تفصیلی ملاقاتیں جاری رہیں۔ سرکاری سطح پر تو کچھ نہیں بتایا گیا' لیکن اس خطے کے حالات پر نگاہ رکھنے والے سیاسی تجزیہ نگار کہہ رہے تھے کہ ایران کے چھ ممالک سے کامیاب مذاکرات کے تناظر میں عرب اور عجم کے درمیان تناؤ بڑھنے والا ہے۔ چند روز بعد یمن سے بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ تب شاہ سلمان نے وزیراعظم نواز شریف سے ٹیلی فون پر طویل گفتگو کی اور پاکستان سے فوج کے علاوہ طیارے اور بحری جہاز فراہم کرنے کی استدعا کی۔ ہماری قومی قیادت یہ اعلان کرتی رہی کہ پاکستان مشکل کی گھڑی میں اپنے برادر ملک سعودی عرب کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد یہ انتہائی اہم اور حساس معاملہ

www.pdfbooksfree.pk

پارلیمان کے مشترکہ اجلاس میں اُٹھایا گیا۔ پارلیمان میں بحث شروع کرنے سے پہلے اس نازک مسئلے پر کابینہ میں غور و خوض اور پارلیمانی اجلاس کے لیے ایک مؤثر حکمت عملی از بس ضروری تھی' مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مشترکہ اجلاس میں تحریک انصاف کے ارکان اسمبلی بھی شریک ہوئے اور چیئرمین صاحب نے فرمایا ہم اجلاس میں شرکت اس لیے کر رہے ہیں کہ پاکستانی فوج کو سعودی عرب جانے سے روک سکیں۔ اس واشگاف اعلان میں سعودی عرب کے لیے صدر جہ "کلیف دہ پیغام تھا جو پاکستان سے بہت ساری توقعات لگائے بیٹھا تھا۔

بدقسمتی سے وزیر دفاع خواجہ آصف نے بحث کا نہایت سنجیدگی سے آغاز کرنے کے بجائے تحریک انصاف پر تند و تیز حملے شروع کر دیے۔ اس پر پارلیمان ہاؤس مچھلی منڈی بن گیا' تاہم بعض ارکان پارلیمان کی فہم و فراست سے ماحول میں تھہراؤ پیدا ہوا' مگر نقصان ہو چکا تھا اور احتیاط کا دامن بار بار چھوٹ رہا تھا۔ دانش وری اور آزاد خیالی کے گھمنڈ میں بعض مقررین پاک سعودی عرب تعلقات پر آرے چلاتے رہے۔ دراصل مشترکہ اجلاس ان کیمرہ ہونا چاہیے تھا۔ تیسرے روز دفتر خارجہ کی تیار شدہ قرارداد پارلیمان ہاؤس میں پیش کی گئی۔ حیرت کی بات یہ کہ اس وقت مشیر خارجہ جناب سرتاج عزیز ایوان میں موجود نہیں تھے۔ تحریک انصاف نے قرارداد میں غیر جانبداری اور غائش کے الفاظ شامل کرنے پر اصرار کیا۔ اتفاق رائے کی خاطر یہ تجاویز شامل کرنا پڑیں جن کے سبب اس میں توازن نہیں رہا اور چشم زدن میں یہ تاثر طول و عرض میں پھیل گیا کہ پاکستان نے سعودی عرب کے معاملات میں غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس پر امارات کے نائب وزیر خارجہ کا آتشیں بیان آیا کہ پاکستان کو اپنے فیصلے سے پیدا شدہ خطرناک نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔ سعودی عرب سے مذہبی امور کے مشیر تشریف لائے۔ ابتدا میں ان کا لہجہ بھی خاصا تلخ تھا' لیکن اہم شخصیتوں سے ملاقات کے بعد ان کے بیانات میں دانش اور حقیقت پسندی جھلکنے لگی۔ انھوں نے کہا ہمیں یقین ہے کہ مشکل کی گھڑی میں پاکستان ہمارے شانہ بشانہ کھڑا ہے اور ہمیں علاقائی سالمیت' آزادی اور خودمختاری کی ضمانت دی گئی ہے۔

سعودی عرب جس کے پاکستان کے ساتھ عشروں پر محیط نہایت خوش گوار تعلقات قائم ہیں' وہ یہ اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ آزمائش کی گھڑی میں پاکستان خود امداد کی پیش کش کرے گا اور اپنی فوجیں کسی تاخیر کے بغیر مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے بھیجے گا۔ وزیراعظم نواز شریف نے سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سلمان سے ٹیلی فون پر بات چیت کرتے ہوئے کچھ ایسا ہی تاثر دیا تھا' مگر پارلیمان کی قرارداد میں دل جوئی اور حق دوستی ادا کرنے کے بجائے ایک ایسا لب و لہجہ اختیار کیا گیا جس میں گرم جوشی کم اور احتیاط بہت زیادہ تھی۔ جب توقعات بہت زیادہ ہوں تو نصیحت کی بات بھی گراں گزرتی ہے۔ سعودی عرب میں جو ہندو لابی موجود ہے' اس نے پارلیمان میں ہونے والی تقریریں مرچ مسالا لگا کر اعلیٰ حلقوں تک پہنچائیں اور ہمارے اتحاد اور یک جہتی کو نقصان پہنچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ نقصان پر قابو پانے کے لیے شہباز شریف کی قیادت میں ایک وفد ریاض گیا' مگر وہ شاہ سلمان سے ملاقات نہ کر سکا۔ تب وزیراعظم نواز شریف اور آرمی چیف جنرل راحیل شریف اور اعلیٰ حکام ایک روزہ دورے پر سعودی عرب گئے۔ ہم نے ٹی وی پر اُن کی جو تصاویر دیکھیں' اُن سے اندازہ ہوا کہ معاملات بڑی حد تک سلجھ گئے ہیں اور سیاسی اور فوجی قیادت کی مشترکہ کوششوں سے سعودی حکام صورت حال کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ یمن میں پاکستان کی افواج کا جانا کسی کے فائدے میں نہیں اور اسے بھی اپنی فوجیں وہاں نہیں بھیجنی چاہئیں کیونکہ یمن تو افغانستان جیسا ہے کہ وہاں جو گیا اُس کا قبرستان بن گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆

سعودی عرب سے امام کعبہ خالد الغامدی ایک ہفتے کے دورے پر پاکستان آئے ہیں۔ لاہور میں ان کا زبردست خیر مقدم ہوا ہے۔ وہ ان مراکز میں جا رہے ہیں جو دینی جذبوں سے سرشار اور سعودی عرب پر ناز کرتے ہیں۔ ان کے دورے سے دونوں ملکوں کے برادرانہ تعلقات میں پہلی جیسی وارفتگی عود کر آئے گی۔ پاکستان کے عوام سعودی عرب سے ٹوٹ کر محبت کرتے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو آپس میں تقسیم کرنے کی اغیار سازشیں کر رہے ہیں اور ان کے وسائل پر قبضہ کر لینا چاہتے ہیں۔ ہمارے میڈیا کو اس امر کا پورا احساس ہونا چاہیے کہ اس نازک موقع پر اس کی ذمے داریاں کس قدر اہم ہیں۔ ہمارے دانش وروں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ پاکستان نے بڑی محنت اور عشروں کی ریاضت سے جو دوست بنائے ہیں ان کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچنے پائے اور پرانے روابط تر و تازہ رہیں۔ یہ منظر بہت روح فرسا ہے کہ مشکل کے وقت دوستی دوست ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رہنے کے بجائے بگڑے اور سہمے سہمے نظر آئیں۔ یہ وقت اپنے دوست کی مخلصانہ جدوجہد سے مدد کے لیے پہنچنے کا ہے۔ مدد اچھے جذبات کے اظہار سے بھی کی جا سکتی ہے اور سوچ سمجھ کر مسئلے کا حل تلاش کرنے سے بھی۔ اب ہمیں پیچیدہ مسئلے کا حل تلاش کرنا اور سعودی بھائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہونا ہوگا۔

شرق اوسط کے تناظر میں یہ سوال غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ یمن کا بحران کیسے ختم ہو سکتا اور عجم اور عرب میں اچھے تعلقات فروغ پا سکتے ہیں۔ سعودی عرب کی امداد کے لیے دس عرب ملکوں کا جو اتحاد قائم ہوا اس نے فضائی طاقت کا استعمال اس قدر مؤثر انداز میں کیا کہ حوثی قبائل کی پیش قدمی رک گئی ہے اور وہ شمالی یمن کے مغربی علاقوں میں سمٹ کے رہ گئے ہیں۔ ادھر امریکی بحری بیڑا خلیج فارس میں لنگر انداز ہے جو ایرانی جہازوں کی اس غرض سے تلاشی لے گا تاکہ اسلحہ حوثی باغیوں تک نہ پہنچ سکے۔ پاکستان اس لیے بہت خوش قسمت ہے کہ اس کے عرب اور عجم کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات رہے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ "سنٹو" اور "آر سی ڈی" کا اہم رکن تھا جس میں ایران اور ترکی بھی شامل تھے۔ خوش قسمتی سے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل نے یمن کا بحران حل کرنے کے لیے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں خانہ جنگی بند کرنے اور مذاکرات کا عمل اپنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس قرارداد کا ایران بھی پابند ہے اور اقوام متحدہ کے ذمے دار رکن کی حیثیت سے وہ اپنی ذمے داری ضرور پوری کرے گا۔ اس موقع پر اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ مسلم وزرائے خارجہ کا ہنگامی اجلاس طلب کر کے مذاکرات کے ذریعے بحران کا پائیدار حل تلاش کیا جائے۔ پاکستان ان کوششوں میں مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے اور امن فوج قائم کرنے کی تجویز بھی زیر غور آ سکتی ہے۔ یہ تجویز اسی وقت قابل عمل ہوگی جب مسلمان ممالک اپنے تنازعات حل کر لیں گے۔ جنیوا کے قیام سے پہلے یورپ نے اپنے باہمی اختلافات ختم کیے تھے۔

☆☆☆

کراچی میں ضمنی انتخابات میں ایم کیو ایم کو اس کی شاندار کامیابی پر مبارکباد پیش کی جانی چاہیے کہ اس نے بڑی حد تک شفاف انتخابات میں عوام کی بھاری حمایت کا ثبوت دیا اور سیکٹر کمانڈروں سے نجات پائی ہے مگر اس بھاری حمایت کا اہتمام بھی تحریک انصاف کے چیئرمین کی طرف سے ہوا۔ وہ جب ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کے خلاف شائستگی اور تہذیب سے گری ہوئی زبان استعمال کر رہے تھے تو اہل نظر کہہ رہے تھے کہ ایم کیو ایم کے زخم زخم بدن میں تازہ روح پھونکی جا رہی

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ انھوں نے جس جارحانہ انداز میں اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا' اس نے مہاجرین کو یہ پیغام دیا کہ اسٹیبلشمنٹ ان کے ذریعے ان کی طاقت پارہ پارہ کر دینا چاہتی ہے۔ بدقسمتی سے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جو یہ تاثر دیتے رہے کہ ایم کیو ایم کا چاروں طرف سے گھیراؤ کیا جا رہا ہے۔ رینجرز فورس نے کراچی میں خاصا کامیاب آپریشن کیا' مگر اس سے کہیں کہیں زیادتیاں بھی سرزد ہوئیں جو بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی رہیں کہ صرف مہاجر تنخۂ مشق بنائے جا رہے ہیں۔ وہ ارباب اختیار جنھوں نے نبیل گبول سے استعفا لے کر ضمنی انتخاب کا ڈراما رچایا' دراصل وہی ایم کیو ایم کو تقویت پہنچانے کا باعث بنے ہیں۔ منصوبے کے مطابق نبیل گبول کو تحریک انصاف کے ٹکٹ پر انتخاب لڑانا تھا' مگر ان کے درمیان معاملہ طے نہ پا سکا۔ رینجرز نے نائن زیرو پر جب چھاپہ مارا' تو ایم کیو ایم کا پورا وجود لرز اٹھا تھا' مگر صولت مرزا کی پھانسی سے چند گھنٹے پہلے اس کے اقبالی بیان نے چھاپے کا سارا تاثر زائل کر دیا اور مہاجرین کو یقین ہو گیا کہ ایم کیو ایم ہی انھیں تحفظ فراہم کر سکتی ہے۔

الطاف بھائی نے بھابی ریحام خان کی خدمت میں سونے کا سیٹ پیش کرنے کی رومانوی فضا پیدا کر کے عمران خاں کی انتخابی مہم کے غبارے سے پہلے روز ہی ہوا نکال دی تھی۔ پولنگ سے ایک روز پہلے دو سواریوں پر پابندی اور ووٹ ڈالنے کے لیے اصل شناختی کارڈ پیش کرنے کی شرط سے اس تاثر کو تقویت ملی کہ اسٹیبلشمنٹ ایم کیو ایم کی انتخابی طاقت پر ضرب لگانا چاہتی ہے۔ ضمنی انتخاب میں کوئی ۳۴ فیصد ووٹ پڑے اور بے ضابطگیوں کی بہت ساری شکایتیں سامنے آئیں جن سے الیکشن کمیشن میں بنیادی اصلاحات کی ضرورت کا احساس مزید شدت اختیار کر گیا ہے۔

ضمنی انتخابات میں جماعت اسلامی کی کارکردگی بڑی مایوس کن رہی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنی تقاریر اور تحریروں میں ایک بات بڑی صراحت سے بیان کرتے رہے کہ ہمیں سیاسی بقا اور نشوونما کے لیے ہوا اور روشنی کی طرح جمہوریت درکار ہے۔ اس نظریے کے تحت جماعت اسلامی انتخابات میں حصہ لیتی رہی' قاضی حسین احمد (مرحوم) جب امیر بنے' تو انھوں نے اس جماعت کو جو اقامت دین کے عظیم الشان نصب العین کے لیے اٹھی تھی' اسے اپنی ذاتی پبلسٹی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ وہ نواز شریف کو سخت ناپسند کرتے' اس لیے انھوں نے ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں مسلم لیگ سے انتخابی اتحاد کرنے کے بجائے ''اسلامی فرنٹ'' کے نام سے انتخابات میں حصہ لیا اور تمام اُمیدوار شکست کھا گئے۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں اس نے متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیا اور شاندار کامیابیاں حاصل کیں' مگر ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں قاضی صاحب نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر کارکنوں میں بڑی مایوسی پیدا ہوئی اور ہم نے انھیں بڑے اشتعال کی حالت میں دیکھا۔ انھیں قلق یہ تھا کہ ہم نے سالہا سال کی محنت سے انتخابی سرمایہ جمع کیا تھا' وہ ضائع ہو جائے گا۔ ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں کراچی کے حلقہ ۲۴۶ میں جماعت اسلامی کے اُمیدوار کو پہلے دو گھنٹوں میں دس ہزار ووٹ پڑے اور خواتین و حضرات کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اچانک قیادت نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ کارکنوں اور ووٹروں کو پیغام یہ ملا کہ جماعت اسلامی انتخابات میں سنجیدہ نہیں رہی' چنانچہ ضمنی انتخاب میں کارکن پوری طرح متحرک ہوئے نہ ووٹر پلٹ کر اس کی طرف آئے۔ کراچی میں امن قائم کرنے کے لیے جماعت اسلامی کو بلدیاتی انتخابات میں پوری تیاری کے ساتھ حصہ لینا اور اس شہر کے بنیادی مسائل حل کرنے میں قائدانہ کردار ادا کرنا ہو گا۔ آسمان رنگ بدل رہا ہے۔ اور ایم کیو ایم ایک سیاسی جماعت کے طور پر صحت مند کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں آ رہی ہے اور تحریک انصاف کے لیے اپنے رویے بدلنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

اسٹاک مارکیٹ تک رسائی کا آسان ذریعہ...

NI(U)T میں سرمایہ کاری

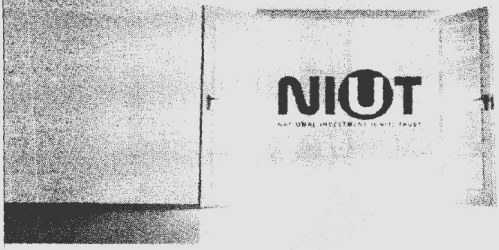

سب سے بڑا اور سب سے زیادہ متنوع ایکوٹی فنڈ

52 سال سے ڈیویڈنڈ کی مسلسل ادائیگی کا شاندار ریکارڈ

پیشہ ور، انتہائی تجربہ کار فنڈ مینجرز کی زیرِ نگرانی

آپکے سرمایہ میں اضافہ اور مسلسل منافع کے شاندار امکانات۔۔۔ اعداد و شمار کی روشنی میں

	FY 2005	FY 2006	FY 2007	FY 2008	FY 2009	FY 2010	FY 2011	FY 2012	FY 2013	FY 2014	*YTD 2015	**10 Years Annualized Return
NI(U)T (%)	35.67%	28.20%	44.83%	-5.76%	-41.48%	17.92%	24.00%	7.57%	56.42%	56.98%	5.73%	18.44%
KSE 100 (%)	41.12%	34.08%	37.87%	-10.77%	-41.72%	35.74%	28.54%	10.45%	52.20%	41.16%	1.96%	18.84%
Dividend Per Unit (Rs.)	3.3	5.80	6.20	6.50	3.25	2.25	4.00	3.50	3.75	4.10	-	-

*As on March 31 2015 **Geometric return from FY05 - FY14

AMC Rating 'AM2' by PACRA

NIT
NATIONAL INVESTMENT TRUST LIMITED

UAN: 111-648-648 | Toll-Free: 0800-00648
Email: info@nit.com.pk | Website: www.nit.com.pk

Risk Disclaimer: All investments in mutual funds are subject to market risks. The NAV of units may go up or down based on the market conditions. Past performance is not necessarily indicative of the future results. Please read the Offering Documents to understand the investment policies & the risks involved.

PID(K)3253

www.pdfbooksfree.pk

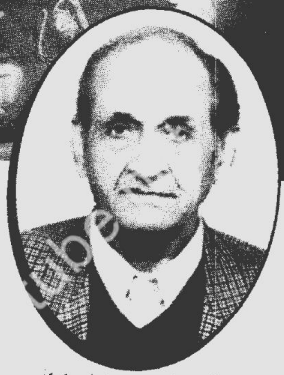

ڈاکٹر بشیر چودھری کا دعویٰ

میں نے کینسر کا مریض صحت یاب کر دیا

قدرتی طریق علاج سے موذی امراض کی تشخیص کرنے والے معالج کی معلومات افروز باتیں

الطاف حسن قریشی

گزشتہ ماہ سہ پہر تین بجے ہادی صاحب کا فون آیا کہ آپ کی ایک ایسے شخص سے ملاقات کرانی ہے جو آنکھوں کے معائنے سے پورے جسم میں پائے جانے والے امراض کا سراغ لگاتے اور جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔ ہادی صاحب ایم اے پولیٹیکل سائنس میں میرے ہم جماعت تھے۔ میں مقررہ وقت پر اُن کے ہاں پہنچ گیا اور وہ مجھے بشیر احمد چودھری سے ملوانے لے گئے۔ اُن سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے بتایا کہ آپ ۱۹۶۵ء میں میرا انٹرویو لینے کراچی آئے تھے۔ تب میں پاک فضائیہ میں تھا۔ بے تکلف ماحول میں اُن سے گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں جن میں کئی انکشافات سامنے آئے۔

انھوں نے اپنی زندگی کے دلچسپ حالات بتاتے ہوئے کہا: ''میں جب پاک فضائیہ میں تھا، تو میرے ایئر چیف ایئر مارشل عبدالرحیم سے تعلقات قدرے کشیدہ تھے۔ اسی لیے میں نے استعفا دے دیا۔ دوست احباب

www.pdfbooksfree.pk

نے مجھے پی آئی اے جانے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ میں قومی ایئر لائن میں چلا گیا۔ اس دوران مجھے گنٹھیا (آرتھرائٹس) نے آن دبوچا۔ ایک روز میں ہوائی جہاز سے نیویارک پہنچا اور وہاں سے پیرس آیا۔ وہاں عملہ تبدیل ہوا اور میں آرام کرنے ہوٹل آ گیا۔ صفت تک پہنچنے کے لیے تین چار سیڑھیاں تھیں، مگر ان پر چڑھنا میرے لیے دوبھر ہو گیا۔ اس سے قبل میرے دائیں بازو کی کہنی میں درد رہتا، میں اس سے بریف کیس تک نہیں اٹھا سکتا تھا۔ وہ میں بائیں بازو سے اٹھاتا۔

''جب مجھے گھٹنے میں شدید درد ہوا، تو ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے مجھے دافع درد گولیاں دیں۔ وہ کھا کر میں جہاز اڑانے کے قابل ہو گیا۔ ایک ہفتہ وہ دوائی کھائی، تو تندرست رہا۔ جب دوائی چھوڑی، تو وہ مسئلہ پھر عود کر آیا۔ میں پھر اس مرض پر تحقیق کرنے لگا تاکہ اس کی بابت جان سکوں۔ یہ تحقیق مجھے نیویارک کے ایک ہیلتھ اسٹور لے گئی۔ تب تک میں گنٹھیا کے لفظ سے بھی واقف نہیں تھا۔ وہاں میں نے ایک کتاب دیکھی جس کا عنوان تھا: ''Arthritis can be cured'' (گنٹھیا قابل علاج ہے)۔ مجھے تجسس ہوا کہ یہ آرتھرائٹس کیا چیز ہے۔ لہٰذا وہ کتاب خرید لی۔''

میں نے پوچھا ''آپ نے اس کتاب میں کیا خاص بات پائی؟''

ڈاکٹر بشیر چودھری کہنے لگے: ''اس میں ہربل یعنی جڑی بوٹیوں سے بنی ادویہ کے بارے میں حیرت انگیز معلومات موجود تھیں۔ ہوٹل اپنے کمرے پہنچا، تو کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ جیسے جیسے پڑھتا گیا، مجھے محسوس ہوا وہ میرے متعلق ہی لکھی گئی ہے۔ میں جن غلط عادات میں مبتلا تھا، ان سب کا اس میں تذکرہ کیا گیا تھا۔

''اسی کتاب سے مجھے معلوم ہوا کہ گنٹھیا چھٹنے کی ایک وجہ ذہنی دباؤ (Stress) بھی ہے۔ جو لوگ اس دباؤ کا زیادہ شکار ہوں، ان کے جوڑ جلد درد کرنے لگتے ہیں۔ ذہنی دباؤ کی تکلیف انسان کے قابو سے باہر ہے، اسے صرف اللہ تعالیٰ ہی دور کر سکتا ہے۔ میں آپ کو دو لوگوں کی مثال دیتا ہوں جن کا بڑا مالی نقصان ہو چکا۔ ایک شخص توکل کرنے والا ہے۔ وہ کہتا ہے مالک نے دیا تھا، اسی نے لے لیا اور وہی پھر دے گا۔ وہ یہ کہتا ہوا آرام سے سو گیا اور اس نے کسی قسم کا دباؤ قبول نہیں کیا۔ دوسرا آدمی جس کا خدا پر بھروسہ نہیں تھا، وہ اپنے شدید ذہنی دباؤ کے باعث دل کا دورہ پڑنے سے اسپتال پہنچ گیا۔ اس مثال سے عیاں ہے کہ ذہنی دباؤ جان لیوا کیفیت ہے۔

''مجھے مریض آ کر بتاتے ہیں کہ ہمارا دماغ ساری رات کام کرتا رہتا ہے۔ صبح جب ہم اٹھیں، تو جسم تھکا تھکا محسوس ہوتا ہے۔ میں انھیں کہتا ہوں، جب دماغ مطمئن نہ ہو، تو جسم بھی پُرسکون نہیں رہتا۔ ذہنی دباؤ یہ سکون غارت کر دیتا ہے۔ مگر اسے ادویہ کے ذریعے کنٹرول کرنا ممکن ہے۔

''میرے پاس ایک ڈاکٹر خاتون شوہر کے ساتھ آئیں۔ انھوں نے بتایا ''میں ذہنی دباؤ دور کرنے والی درجن بھر گولیاں بلاناغہ کھا رہی ہوں، لیکن مجھے نیند نہیں آتی۔'' اس کے شوہر نے کہا ''بیماری کے باعث اس کی حالت یہ ہے کہ صبح کہہ رہی تھی، چھت سے چھلانگ لگانے کو جی چاہتا ہے۔'' جب انسان ڈپریشن یا ذہنی دباؤ کا شکار ہو، تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔

''اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ نیویارک میں ایک ایسا کلینک ہے جہاں لوگ اسٹریچر پر لائے جاتے

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ وہاں پھر ان کا ایسا شافی علاج ہوتا ہے کہ چھے سے آٹھ ہفتوں میں وہ اپنے پیروں پر چل کے گھر جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکا میں واقع ایسے کئی کلینکوں میں صرف قدرتی علاج کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس کتاب کی مدد سے میں قدرتی طریق علاج کے ذریعے اپنی دیکھ بھال کرنے لگا۔ میں جلد اتنا صحت مند ہوگیا کہ پندرہ سال بعد تنس کھیلنے لگا۔

''میں نے پھر قدرتی طریق علاج کا کورس کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اصطلاح میں نیچروپیتھی (Naturopathy) کہلاتا ہے۔ نیویارک میں ایک ادارہ نیچروپیتھی کا کورس کراتا ہے۔ میں نے اس میں داخلہ لیا اور مقررہ مدت میں کورس کامیابی سے مکمل کرلیا۔ بعدازاں موضوع سے متعلق کتب بھی زیرمطالعہ رہیں۔

''جب میں کراچی سے لاہور منتقل ہوا تو ماڈل ٹاؤن میں کلینک کھول لیا۔ لیکن اُسے اس لیے بند کرنا پڑا کہ مریضوں کا ہجوم لگا رہتا اور مجھے قرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے مناسب وقت نہ ملتا۔''

میں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا ''آپ جڑی بوٹیوں کے ذریعے جو علاج کررہے ہیں، اس کی تعلیم کسی عالمی معیار کے کالج سے حاصل کی ہے؟''

انھوں نے جواب میں کہا ''ایک دفعہ پی آئی اے کی فلائٹ فرینکفرٹ، جرمنی گئی تو میں نے عملے سے پوچھا، یہاں کوئی ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہے؟ انھوں نے بتایا، یہاں ایک بہت بڑا ہومیوپیتھک ڈاکٹر تو ہے لیکن اس قدر مصروف کہ پانچ پانچ ماہ تک وقت نہیں دیتا۔ ساتھ ہی انھوں نے بتایا کہ وہ آنکھ کے پردے دیکھ کر سارے طبی مسائل بتا دیتا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت عجیب لگا۔ بعدازاں ایک مرتبہ میرے ہاتھ ایسا کتابچہ لگا جس پہ ''آئریڈولوجی'' (Iridology) درج تھا۔ اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ آنکھ کے پردوں کا معائنہ کرنے سے تمام بیماریوں کا پتا چل سکتا ہے۔ جب میں نے پوری کتاب پڑھی تو میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میری بیٹی امریکی شہر ڈالس میں رہتی ہے۔ تب میں اس کے پاس گیا ہوا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ایک کالج میں آئریڈولوجی کا شعبہ قائم ہے۔''

میں نے حیرت سے پوچھا ''آئریڈولوجی کس قسم کا علم ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''قدرتی طریق علاج کے بعض ماہر ''پردہ چشم'' (Iris) کا معائنہ کرکے ذہنی دباؤ کا پتا چلاتے ہیں۔ طبی اصلاح میں یہ علم ''آئریڈولوجی'' کہلاتا ہے۔ اس طریق علاج میں پردہ چشم کے نمونوں، رنگوں اور دیگر خصوصیات کا جائزہ لے کر جانا جاتا ہے کہ انسان کو کس قسم کی بیماریاں چمٹی ہوئی ہیں۔

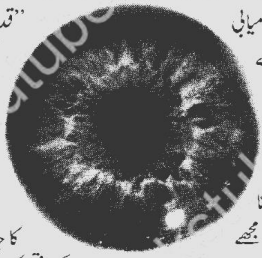

''یورپ میں یہ اٹھارہویں صدی سے پہلے کی سائنس چلی آرہی ہے۔ لیکن اس طریق علاج کو اپنانے والوں کے مابین آپس میں رابطہ نہیں تھا۔ مثلاً ایک ماہر آئریڈولوجی آسٹریا میں ہے، دوسرا جرمنی اور تیسرا برطانیہ میں ہے۔ ہر کوئی اپنا اپنا کام کررہا ہے لیکن وہ ایک دوسرے سے رابطے میں نہیں تھے۔ جب باہمی رابطے قائم ہوئے، تو معلوم ہوا کہ ان کا مشاہدہ، علاج اور نتائج تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اب امریکا میں بھی یہ طریقہ علاج مروج ہے اور انھوں نے اس میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

''میں نے جب لٹن کالج میں داخلہ لینا چاہا' تو انھوں نے کہا کہ آپ کو ڈاکٹر ہونا چاہیے، فلاں ڈگریاں ہونی چاہئیں۔ انھیں بتایا کہ میں نے نیچروپیتھی کا کورس کر رکھا ہے جس میں بنیادی طبی مضامین پڑھائے جاتے ہیں مثلاً اناٹومی، فزیالوجی وغیرہ۔ تب وہ مجھے داخلہ دینے پہ رضامند ہوئے۔ یہ کورس ڈھائی سال کا تھا۔ اس میں اناٹومی، فزیالوجی وغیرہ مجھے سب طبی مضمون پڑھنے پڑے۔ میں نے ایک ڈاکٹر کو ٹیوٹر رکھا جس نے چھے ماہ تک مجھے یہ علم پڑھایا۔

''اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کو جانچنے پرکھنے کے کئی طریقے مقرر کیے ہیں۔ مثال کے طور پر چین میں کئی نظام ہائے علاج رائج ہیں۔ ان کے ہاں ۱۸ نبضیں ہیں، ۹ ایک طرف اور ۹ ایک طرف۔ زبان اور آنکھ سے وہ طبی معائنے میں مدد لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم کے سبھی نظام بذریعہ اعصاب پردہ چشم سے ملا رکھے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب آپ اندھیرے میں جائیں' تو وہ پردہ کھل جاتا ہے تاکہ زیادہ روشنی آنکھ میں جائے۔ جب آپ سورج کے سامنے جاتے ہیں، تو بند ہو جاتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا کہ ذیابیطس کے مریض کا علاج آپ کس طرح کرتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب کا طریق علاج دوسروں سے مختلف تھا۔ انھوں نے بتایا:

''اکثر ڈاکٹر یہ غلط فہمی پھیلاتے ہیں کہ شوگر میں شہد استعمال نہ کیجیے پھل نہ لیں اور فلاں چیز نہ کھائیے۔ میں اپنے مریضوں کو شہد کھلاتا ہوں۔ لیکن شہد اصلی ہونا چاہیے۔ میرے مریضوں کا بیان ہے، اگر ہم روزانہ تین چار بڑے چمچ شہد کے نہ کھائیں، تو ہماری شوگر کنٹرول میں نہیں رہتی۔ یقین کیجیے، شہد بنا ہی شوگر والوں کے لیے ہے۔

''قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان! جیسا میں نے تمھیں بنایا، اسی طرح میں نے ان پودوں کو بنایا ہے۔ پوری کائنات کی تخلیق میں مجھے سات دن اور سبزیوں اور پودوں کو بنانے میں مجھے تین دن لگے۔'' یہ پڑھ کر میں حیران ہوا اور سوچا کہ پوری کائنات کی تخلیق کے مقابلے میں پودوں کو تین دن تک بنانے میں خاصا وقت لیا گیا۔ اس میں یقیناً کوئی حکمت ہوگی۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ جتنے نظام انسانی جسم کے اندر ہیں، اتنے ہی پودوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے جسم میں تقریباً دس نظام پائے جاتے ہیں۔''

میں نے دریافت کیا، سنا ہے، جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے ڈاکٹر کورٹی زون (Cortisone) سٹیرائڈ ہارمون استعمال کرتے ہیں؟ جواب میں ڈاکٹر صاحب ایک دلچسپ واقعہ سنانے لگے:

''میرا دوست مجھے ایک دفعہ سفر کے دوران مل گیا اور اس نے مجھے اپنی صحت کے مسائل بتائے۔ میں نے اسے اپنے کلینک کا پتا دیا۔ وہ چند روز بعد میرے پاس آیا۔ وہ شکی مزاج رکھتا تھا۔ میں نے اسے تین چار مختلف دوائیوں کا مرکب بنا کر دیا۔ اس نے جا کے لیب میں اسے ٹیسٹ کرایا۔ ایک ہفتے بعد میرے پاس آیا اور کہا، چودھری صاحب، آپ دوائیوں میں کورٹی زون ڈالتے ہیں۔ میں نے اس دوائی کا لیب میں ٹیسٹ کرایا، تو رپورٹ میں آیا ہے۔

''یہ سن کر میں بڑا پریشان ہوا۔ خیر وہ تو بحث کر کے چلا گیا۔ میں جن سے دوائی لیتا ہوں، انھیں فون کیا کہ اس طرح کی شکایت آئی ہے۔ انھوں نے کہا، آپ آئیے، ہم آپ کو لیب میں چیک کراتے ہیں۔ پھر مجھے اچانک ایک خیال آیا اور میں نے وہ دوائی اٹھا کر دیکھی جو اسے دی تھی۔ اس مرکب میں شامل ایک دوائی قدرتی طور پر کورٹی زون رکھتی تھی۔ یہ ملٹھی میں پائی جاتی ہے۔''

میں نے پوچھا ''نیچروپیتھی کسی یونیورسٹی یا کالج میں

www.pdfbooksfree.pk

پڑھائی جاتی ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے بتایا ''اس کے اپنے مخصوص کالج ہیں جو عموماً بیرون ممالک واقع ہیں۔ اس کے ریسرچ سنٹر بھی ہیں۔ شاید جلد ہی ایسے دور آ جائے جب یہ علم یونیورسٹیوں میں بھی پڑھایا جانے لگے۔

''ایک دفعہ میرے پاس سرطان کا مریض آیا۔ یہ چند سال پرانی بات ہے۔ شوکت خانم اسپتال والوں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا اور کہا کہ آپ کی زندگی کا ایک مہینہ باقی رہ گیا ہے۔ یہ کینسر کا میرا پہلا مریض تھا۔

تب تک میں نے سرطان کے حوالے سے بہت ساری کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اس بیماری کے علاج سے متعلق مجھے علم تو تھا مگر اعتماد نہیں تھا۔

''امریکا کے ایک مشہور ماہر امراض سرطان، ڈاکٹر جان این نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی ۳۰ سالہ عملی زندگی سے جو کچھ سیکھا، وہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ ظلم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ۹۰ فیصد ایسے لوگ آتے ہیں جن کو سرطان ہوتا ہی نہیں۔ جب میں بلیڈ سے کٹ لگاتا ہوں، تو انھیں سرطان ہو جاتا ہے۔ اس نے پھر سرجری چھوڑ دی اور لوگوں کا قدرتی طریقے سے علاج کرنے لگا۔

''وہ کتاب پڑھنے کے بعد مجھ میں خود اعتمادی آئی اور میں نے اس کتاب سے کافی کچھ سیکھا۔ میرے پاس جو سرطان کا پہلا مریض آیا وہ بوڑھا تھا۔ شوکت خانم اسپتال اسے لاعلاج قرار دے چکا تھا۔ خیر میں نے اس کا علاج کیا۔ اللہ نے اسے شفا دی اور چار پانچ ماہ میں وہ کافی حد تک صحت یاب ہو گیا۔

''ایک دفعہ اس کی بیٹی دوائی لینے آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ ویسے تو آپ کے والد ماشاء اللہ ٹھیک ہیں، لیکن احتیاطاً آپ ان کا چیک اپ کرا لیں۔ وہ اپنے والد کو انمول اسپتال لے گئی۔ کچھ عرصے بعد وہ لڑکی آئی تو اس نے کہا کہ والد صاحب کا چیک اپ کرایا، الحمدللہ تمام ٹیسٹ ٹھیک آئے ہیں۔

''اس نے مزید بتایا کہ جب ٹیسٹ کی رپورٹ آئی، تو ڈاکٹر نے تازہ اور شوکت خانم اسپتال والی پرانی رپورٹ کا موازنہ کیا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ جسم میں سرطانی خلیے ختم ہو چکے۔ لہٰذا وہ رپورٹیں لے کر دوسرے ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس سے بات چیت کرنے کے بعد آ کر مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کہیں سے نیا علاج کرایا ہے؟ لڑکی نے جواب دیا کہ ہاں ہم نے دیسی علاج کروایا ہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا کہ نہیں بی بی، ایسے علاج سے یہ مرض ٹھیک نہیں ہوا، یہ خود بخود قدرتی طور پر ہی ختم ہو گیا۔ حالانکہ وہ میرے علاج سے تندرست ہوا۔''

ڈاکٹر صاحب سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ لے کر ہم عشا کے وقت چلے آئے۔ امید ہے کہ دوسری ملاقات میں وہ ہمیں علم آئرڈیالوجی کے متعلق مزید دلچسپ معلومات فراہم کریں گے۔

www.pdfbooksfree.pk

برادر اسلامی ملک

یمن خانہ جنگی کا نشانہ کیسے بنا؟

اقتدار و طاقت کے نشے میں مست سابق یمنی حکمران کی عبرت ناک داستان

محمد علی صدیقی

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یمن والے شریف النفس اور نرم دل کے لوگ ہیں۔ وہ ایمان اور دانش میں اپنی مثال آپ ہیں۔'' (صحیح بخاری)

یہ شاید یمنی عوام کی نرم خوئی اور شریف النفسی ہی ہے جس سے خصوصاً یمن کے سابق حکمران علی عبداللہ صالح نے ناجائز فائدہ اٹھایا جو ایک شاطر و چالاک انسان ہے۔ غیر ہاشمی زیدی شیعہ شمالی یمن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں جب صرف اٹھارہ سال کا تھا، تو فوج کا حصہ بنا۔

www.pdfbooksfree.pk

افسروں کی چاپلوسی کرنے کے باعث تیزی سے ترقی کی یہاں تک کہ ۱۹۷۸ء میں شمالی یمن کا صدر بن گیا۔

اس زمانے میں جمہوریہ یمن شمالی اور جنوبی، دو حصوں میں تقسیم تھا۔ شمالی یمن کی ۷۰ فیصد آبادی زیدی شیعہ تھی۔ جبکہ جنوبی یمن میں آباد ۹۰ فیصد مسلمان سنی شوافع تھے۔ یہ دونوں پڑوسی ریاستیں امن اور جنگ کے ادوار سے گزریں۔ آخر ۱۹۹۰ء میں دونوں ریاستوں کا ادغام ہوگیا۔

اس وقت اور آج بھی ۸۰ فیصد یمنی کسی نہ کسی قبیلے سے وابستہ ہیں۔ ان قبائل کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ ایک قبیلے سے وابستگی یمنی شہری کو نہ صرف تحفظ فراہم کرتی بلکہ اسے باروزگار ہونے میں بھی مدد دیتی ہے۔

جب دونوں ریاستوں کا ادغام ہوا، تو یمنی آبادی میں سنیوں کی اکثریت ہوگئی۔ ۵۶ فیصد یمنی سنی، ۴۲ فیصد زیدی شیعہ اور ۲ فیصد اسماعیلی و اثنا عشری شیعہ تھے۔ لیکن سنیوں میں اتحاد نہ تھا اور وہ سیکڑوں قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جو مختلف اختلافات کے باعث آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف زیدی شیعہ صرف تین بڑے قبائل..... بکیل، حاشد اور مذحج کی صورت متحد ہیں۔ یہ صورت حال آج بھی زیادہ تبدیل نہیں ہوئی۔

۱۹۹۰ء میں علی عبداللہ صالح نے ایک طرف حاشد اور بکیل کو ساتھ ملایا، دوسری طرف جنوبی یمن کے بعض سنی قبائل کی حمایت بھی حاصل کر لی۔ اس نے زیدی شیعہ و سنی قبائل کے سرداروں کو خوب انعام واکرام سے نوازا اور یوں ان کی مدد پانے میں کامیاب رہا۔ انہی قبائل کی حمایت سے وہ نئے ملک، جمہوریہ یمن کا صدر بن گیا۔

علی عبداللہ صالح نے پھر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی خاطر دو بنیادی اقدامات کیے۔ اوّل قبائلی سرداروں کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے لیے انھیں انعام واکرام سے نوازتا رہا۔ دوم اس نے حکومت اور فوج کے کلیدی عہدوں پر اپنے رشتے دار، دوست احباب تعینات کر دیے۔ انہی اقدامات کے ذریعے وہ آمرانہ وشاہانہ انداز میں حکمرانی کرنے لگا۔

بعدازاں یمن کے سیاہ وسفید کا مالک اور مطلق العنان سربراہ بن کر وہ کرپشن میں لتھڑ گیا۔ ہر سرکاری منصوبے میں علی عبداللہ صالح کا کمیشن مخصوص تھا۔ چنانچہ سرکاری آمدن صدر اور اس کے حواریوں میں تقسیم ہونے لگی۔ یمنی عوام ماضی کی طرح پس ماندہ اور زندگی کی بنیادی سہولیات سے بھی محروم رہے۔

جس طرح گرگٹ رنگ بدلتا ہے، علی عبداللہ صالح اسی طرح اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے کبھی روس کا طرف دار بن جاتا۔ کبھی امریکا کی غلامی کرتا اور کبھی سعودی عرب کی چاپلوسی کرنے لگتا۔ یوں اپنے حیلے بہانوں، سازشوں اور ہتھکنڈوں سے وہ ۲۰۱۱ء تک حکومت کرتا رہا۔

۲۰۱۱ء میں جب بڑھاپے نے دستک دی، تو علی عبداللہ صالح نے اپنے بیٹے، جنرل علی صالح کو جانشین بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ جنرل علی یمنی فوج کے سب سے طاقتور دستے، ریپبلکن گارڈ کا سربراہ تھا۔ لیکن ایک تیونسی پھیری والے کی خودسوزی نے صدر علی عبداللہ صالح کے عزائم خاک میں ملا دیے۔

بوعزیزی کی خودسوزی سے جس ''عرب بہار'' کا آغاز ہوا، وہ اوائل ۲۰۱۱ء میں یمن تک آ پہنچی۔ یمنی عوام مہنگائی اور بیروزگاری کے ہاتھوں ستائے ہوئے تھے۔ وہ بھی تیونسی شہریوں کی طرح حکومت کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔ ۲۰۰۲ء سے جنوبی یمن میں جاری القاعدہ اور سرکاری فوج

www.pdfbooksfree.pk

کی لڑائی نے عوام کی مشکلات بڑھادی تھیں۔

اس دوران سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی کہ بکیل اور حاشد قبائل کے سردار صدر علی عبداللہ صالح کے مخالف بن گئے۔ چناں چہ وہ صدر کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے لگے۔ ایک قاتلانہ حملے میں صدر بال بال بچا۔ آخر سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک کی مداخلت پر اس نے نومبر ۲۰۱۱ء میں اپنے بتیس سالہ اقتدار کو خیرباد کہہ دیا۔

علی عبداللہ صالح نے اقتدار اپنے نائب، عبدربہ منصور ہادی کے سپرد کیا۔ منصور ہادی ۱۹۹۴ء سے یمن کے نائب صدر چلے آرہے تھے۔ وہ ایک سنی العقیدہ مسلمان ہیں۔ اقتدار سنبھالتے ہی وہ ملک میں قومی اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔

سابق صدر، علی عبداللہ صالح نے اپنی شرائط منوا کر اقتدار چھوڑا تھا، لیکن آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ ''یمنی لومڑی'' کی چال تھی۔ دراصل یمنی پارلیمان میں اسی کی (حکمران) پارٹی، جنرل پیپلز کانگریس کے ارکان کی اکثریت تھی۔ لہٰذا جنوری ۲۰۱۲ء میں پارلیمان نے یہ قرارداد منظور کر لی کہ علی عبداللہ صالح پر کوئی مقدمہ نہیں چلے گا۔ بلکہ اسے پارٹی کا نیا صدر بھی منتخب کرلیا گیا۔

صدر عبدربہ منصور ہادی کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ سبھی اہم سرکاری عہدوں پر علی عبداللہ صالح کے حواری فائز ہیں۔ لہٰذا حکمرانی کرنے کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس حقیقت نے نئے صدر کو سابق حکمران کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

نئے یمنی صدر کی بدقسمتی تھی کہ وہ بیشتر سنی قبائل کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں رہے۔ وجہ یہ کہ علی عبداللہ صالح نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس نے جنوبی یمن میں زیدی شیعہ قبائلی سرداروں کو وسیع زمینیں الاٹ کیں جہاں وہ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ نیز اکثر ترقیاتی منصوبے شمالی یمن ہی میں انجام پائے۔

سابق یمنی صدر کی یہ رخی پالیسی کے باعث ۱۹۹۴ء ہی میں جنوبی یمن کے سنی قبائل نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ علی عبداللہ صالح یہ مشکل اس بغاوت کو دبا سکا۔ لیکن آج بھی جنوبی یمن میں بعض سنی قبائل نے علیحدگی کی تحریک چلا رکھی ہے۔

صدر منصور ہادی رفتہ رفتہ حکومت اور فوج میں اپنا اثر و رسوخ بڑھاتے چلے گئے۔ اس امر نے علی عبداللہ صالح کو چوکنا کر دیا اور اسے اپنا اثر و رسوخ ختم ہوتا محسوس ہوا۔ چناں چہ سابق اور حاضر صدور کے مابین چپقلش کا آغاز ہوا۔ امریکا اور سعودی عرب صدر ہادی کے حمایتی تھے کیونکہ انھوں نے جنوبی یمن میں القاعدہ کے خلاف بھرپور عسکری مہم چھیڑ رکھی تھی۔

آہستہ آہستہ صدر منصور ہادی کو احساس ہوا کہ اپنی حکمرانی مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ فوج اور حکومت میں علی عبداللہ صالح کے کارندے برطرف کیے جائیں۔ چناں چہ وہ مختلف حیلے بہانوں سے انھیں گھر بھجوانے لگے۔ اس مخالفانہ مہم کا نقطۂ عروج مارچ ۲۰۱۳ء میں اس وقت دیکھنے کو ملا جب ریپبلکن گارڈ توڑ دی گئی۔

اس اقدام سے علی عبداللہ صالح کی عسکری قوت کم کرنا مقصود تھا۔ اس نے جو اپنی طاقت پر ضرب پڑتے دیکھی، تو کھل کر صدر ہادی کے خلاف میدان میں اتر آیا۔ اس نے پھر ایسی شاطرانہ چال چلی کہ اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر ملک و قوم کو خانہ جنگی کی آگ میں دھکیل دیا۔

ہوا یہ کہ شمالی یمن کے بالائی پہاڑی علاقوں میں زیدی شیعوں کا ایک گروہ، حوثیین طویل عرصہ علی عبداللہ

www.pdfbooksfree.pk

صالح حکومت کے خلاف برسرِپیکار رہا۔ حوثیوں رفتہ رفتہ طاقت پکڑتے گئے اور ۲۰۱۲ء تک بالائی شمالی یمن کے تین چار صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

اب اپنی طاقت کو دوام بخشنے کی خاطر علی عبداللہ صالح نے حوثیوں کو ابھارا کہ وہ یمن کی حکومت پر قبضہ کر لیں۔ یمنی فوج میں افسروں اور جوانوں کی اکثریت علی عبداللہ صالح کی حمایتی تھی۔ لہٰذا ان کی خدمات بھی حوثیوں کے سپرد کر دی گئیں۔ عسکری حمایت پا کر ہی حوثی اس قابل ہوئے کہ دارالحکومت صنعا کی سمت پیش قدمی کر سکیں۔

ادھر صدر منصور ہادی سابق صدر کی سیاسی و عسکری حمایت سے محروم ہوئے، تو خود بخود ان کی حکومت کمزور ہوتی گئی۔ چناں چہ ستمبر ۲۰۱۴ء میں حوثیوں نے صنعا پر قبضہ کر لیا۔ صدر ہادی نے کوشش کی کہ حوثیوں کو اقتدار میں شریک کر لیں، مگر انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ چناں چہ کوئی راہ نہ پا کر وہ پہلے عدن اور پھر مارچ ۲۰۱۵ء میں سعودی عرب میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

فروری ۲۰۱۵ء میں حوثیوں کے لیڈر، محمد علی حوثی نے نظام حکومت چلانے کے لیے ایک انقلابی کمیٹی تشکیل دی اور شمالی یمن میں اقتدار سنبھال لیا۔ تاہم سنی قبائل نے حوثی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حوثیوں نے جنوبی یمن پر دھاوا بول دیا۔ سنی قبائل کو تحفظ دینے کی خاطر ۲۵ مارچ سے سعودیہ اور دیگر عرب ممالک کے طیارے حوثیوں کی فوجی تنصیبات پر حملے کرنے لگے۔

بعدازاں حوثی فوج نے بندرگاہ عدن پر حملہ کر دیا جہاں بڑی تعداد میں پاکستانی بھی مقیم تھے۔ ان پاکستانیوں کو وطن لانے کے لیے خصوصی اقدامات کرنا پڑے۔ یہ سطور قلم بند ہونے تک عدن میں منصور ہادی کی وفادار فوج و سنی قبائل اور حوثیوں کے مابین جنگ جاری ہے۔

مغربی میڈیا نے بالخصوص یہ دعویٰ کیا کہ ایران حوثیوں کو عسکری و مالی امداد فراہم کر رہا ہے۔ گو ایرانی حکومت نے اس دعوے کو الزام قرار دیا ہے، تاہم سیاسی طور پر وہ تحریک حوثیوں کی حمایت کرنے لگی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ امریکا حوثیوں کا مخالف ہے۔

سعودی عرب نے ایک تو یمن میں ایرانی اثرات پھیلنے سے روکنے پر حملہ کیا۔ دوسرے شاہ سلمان اپنے محبوب بیٹے، محمد کو منظر عام پر لانا چاہتے تھے۔ محمد ابن سلمان دنیا کے کم عمر ترین وزیر دفاع ہیں۔ سعودی افواج انھی کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئیں۔

یہ یاد رہے کہ تحریک حوثیوں بنیادی طور پر سماجی تنظیم ہے۔ تاہم علی عبداللہ صالح حکومت کے ساتھ تنازعات نے اسے طاقتور سیاسی تحریک میں بدل ڈالا۔ حوثی قیادت کا دعویٰ ہے کہ وہ یمن میں کرپٹ نظام حکومت ختم کر کے عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہے۔ لیکن سنی قبائل خصوصاً حوثی حکومت دیکھنے کو تیار نہیں، وہ انھیں باغی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا صورت حال دیکھتے ہوئے یمنی خانہ جنگی کا کوئی اختتام نظر نہیں آتا۔

ان حالات میں علی عبداللہ صالح کوشش کر رہا ہے کہ اب اپنے بیٹے کو نیا یمنی حکمران بنوا دے۔ وہ اسے سب کے لیے قابل قبول حل کی صورت پیش کرنے کی کوششوں میں ہے۔ اب یہ وقت ہی بتائے گا کہ یمن میں اپنے خاندان کا اقتدار بحال کرانے کے لیے علی عبداللہ صالح نے جو شاطرانہ کھیل کھیلا، اس میں اسے کامیابی ملتی ہے نہیں۔ اس کھیل نے بہرحال یمن کو تباہی و بربادی کے نئے دور میں ضرور دھکیل دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

قاضیِ وقت الجھن میں.....

خزانے کا مالک کون؟

اس عاقل ملازمہ کی کتھا جس نے قانونی پیچیدگی عقل کے سہارے حل کر ڈالی

بشیر احمد بھٹی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسلامی ممالک میں مقدمات کے فیصلے قاضی کرتے تھے۔ قاضیوں کی بھرپور کوشش ہوتی کہ کوئی شخص اپنے حق سے محروم نہ رہے۔ وہ ہر فیصلہ حق بجانب کرنے کی سعی کرتے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل قاضی رات بھر جاگتا۔ قانونی کتابوں کا مطالعہ کر مقدمہ کے حقائق تلاش کرتا تاکہ ناانصافی نہ ہو۔ بعض زندہ ضمیر قاضی اسی کوشش میں اکثر اپنی صحت بھی کھو بیٹھتے تھے۔

ایک بار ایک قاضی کی عدالت میں عجیب نوعیت کا مقدمہ آیا۔ دو آدمیوں کے مابین فیصلہ ہونا تھا۔ مقدمہ ذرا پیچیدہ قسم کا تھا۔ ایک غریب آدمی نے ایک امیر سے مکان خریدا۔ غریب آدمی کا نام عبدل اور امیر کا محمود تھا۔ عبدل نے محنت کر کے پیسا کمایا تھا۔ اسی پیسے سے اس نے محمود سے مکان خرید لیا۔

عبدل مکان کی مرمت کرانے کا خواہش مند تھا۔ اس سلسلے میں کھدائی ہو رہی تھی کہ ایک کمرے میں زیرِ زمین سے خزانہ نکل آیا۔ جب محمود کو یہ علم ہوا کہ مکان سے خزانہ نکلا ہے، تو وہ عبدل سے تقاضا کرنے لگا "اس خزانے پر میرا حق ہے۔ میں نے تجھے مکان بیچا تھا، خزانہ نہیں۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ خزانہ میرے حوالے کر دو۔"

جبکہ عبدل کا مؤقف یہ تھا "مکان میں نے خریدا ہے۔ اب اس کے اندر پتھر، روڑا، الابلا، خزانہ، جو کچھ بھی ہے، اس پر میرا حق ہے۔ کیونکہ میں تمھیں رقم ادا کر چکا۔"

اس بات پر دونوں فریقین میں کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ لڑائی جھگڑے تک نوبت آ گئی۔ محلے

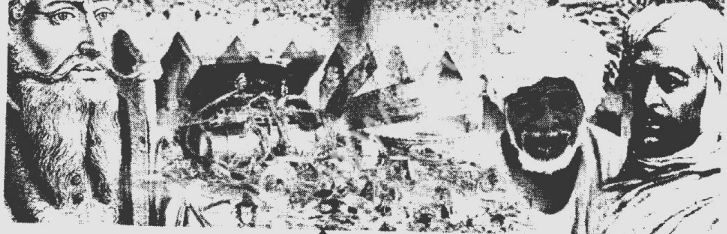

www.pdfbooksfree.pk

کے چند شرفا نے محمود کو مشورہ دیا کہ لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، تم شہر کے قاضی سے رجوع کرو۔ وہاں سے جو فیصلہ صادر ہو، اس کے مطابق عمل کر لیا جائے۔ قاضی اگر یہ فیصلہ کرے کہ خزانہ مکان فروخت کرنے والے کا ہے، تو خزانہ محمود لے۔ اگر قاضی یہ فیصلہ کر دے کہ خزانہ مکان خریدنے والے کا ہے، تو وہ عبدل کا ہوا۔ محلے داروں کے مشورے پر محمود نے قاضیِ وقت کی عدالت میں مدعا علیہ بن کر تمام حقائق لکھ درخواست دائر کر دی۔

قاضی سلطان احمد نے درخواست کے تمام متن پر غور کیا اور چکرا کر رہ گیا۔ یہ بڑا عجیب نوعیت کا مقدمہ تھا۔ اس وقت قاضی باضمیر تھے۔ وہ اسلامی تعلیمات سے بھی بھرپور واقفیت رکھتے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے جہاں انصاف کا بول بالا ہوگا۔ تل بھر کسی سے زیادتی نہ ہوگی۔ ہر آدمی کے اعمال نامے کے مطابق اسے جزا اور سزا ملے گی۔ دنیاوی عدالتوں میں جو ناانصافیاں ہوں گی، اُن کا بھی حساب دینا ہوگا۔

قاضی سلطان احمد ایک بار جو فیصلہ صادر کرتے، اس سے قبل تمام معاملے کی خوب چھان پھٹک کرتے تھے تاکہ کسی فریق کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ انھوں نے محمود کی درخواست کا جائزہ لینے کے بعد عبدل کو عدالت میں طلب کیا۔ فریقین کی بات غور سے سنی اور چند دن بعد عدالت میں پیشی کی انھیں تاریخ دے دی۔ وہ قانونی کتب سے مقدمے کے سلسلے میں دلائل اور حقائق کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔

کیس خاصا گمبھیر تھا۔ قاضی سلطان احمد کے لیے یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور پیچیدہ مقدمہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس خزانے پر اصل حق کس کا بنتا ہے..... مکان فروخت کرنے یا مکان خریدنے والے کا حق؟ دونوں کی حق تلفی سلطان احمد کو کھٹک رہی تھی۔ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی ہوتی، تو اس کا تمام وبال قاضی سلطان احمد کے کاندھوں پر ہوتا۔ یہی بات انھیں پریشان کر رہی تھی۔

اصل حق دار اگر خزانے سے محروم ہو جاتا، تو یقیناً یہ سراسر زیادتی ہوتی۔ اس لیے جو بھی فیصلہ کرنا تھا، کافی سوچ بچار کے بعد وہ اسے اپنانا چاہتے تھے تاکہ حقدار کو اس کا حق مل جائے۔ سلطان احمد کی نیند اُڑ گئی۔ گھر میں رکھی ہوئی تمام قانونی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ بہرکیف وہ ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ وقت بہت ہی کم تھا۔ پیشی کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ کٹھن تھا۔

قاضی سلطان احمد عجیب الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ تمام کتابوں میں اس قسم کے مقدمے کی کوئی حتمی دلیل انھیں نہ مل سکی۔ وہ جب کسی کتاب کا مطالعہ کر کے اسے بند کرتے، تو سوچنے بیٹھ جاتے کہ کیا میں اس مقدمے کا فیصلہ کرنے سے عاجز ہوں؟ تب کیسا قاضی ہوا؟

قاضی سلطان احمد کے پاس ایک ملازمہ کام کرتی تھی۔ وہ عاقل و دانا تھی۔ رات کو سونے سے قبل قاضی صاحب گرم دودھ کا ایک پیالہ پی کر سوتے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی۔ رات کو ملازمہ دودھ کا پیالہ لے کر آئی، تو اس نے دیکھا، قاضی صاحب لالٹین کی روشنی میں ایک موٹی سی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کا تمام دھیان کتاب کی طرف تھا۔ ملازمہ نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

وہ چند راتوں سے دیکھ رہی تھی کہ قاضی صاحب بہت زیادہ مطالعے میں مصروف ہیں۔ یقیناً کوئی ایسا مسئلہ ہے جو ان سے حل نہیں ہو رہا۔ ملازمہ پہلے تو ٹکٹکی باندھے مالک کو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی ”محترم قاضی صاحب! دودھ کا پیالہ میں نے میز پر رکھ دیا ہے۔ یہ بتانے کی جسارت اس لیے کی ہے کہ کہیں بے خیالی میں آپ کا ہاتھ پیالے سے نہ ٹکرا جائے۔ اس طرح وہ نیچے گر سکتا ہے۔“

قاضی صاحب نے کتاب بند کر کے ملازمہ کی طرف نگاہ کی اور بولے ”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ آرام کرو۔“

ملازمہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ڈرتے

www.pdfbooksfree.pk

ڈرتے قاضی صاحب سے کہا ”اگر آپ ناراض نہ ہوں، تو ایک سوال کرسکتی ہوں؟“

وہ بولے ”ہاں ہاں، کیوں نہیں، پوچھو، کیا پوچھنا ہے؟“

ملازمہ بولی ”جناب میں چند راتوں سے یہ دیکھ رہی ہوں کہ آپ پوری رات جاگ کے کتب بینی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بتائیں گے۔“

وہ مسکرائے اور بولے ”تم جانتی تو ہو میں قاضی ہوں۔ میری عدالت میں مختلف نوعیت کے مقدمے آتے رہتے ہیں۔ بعض اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ راتوں کی نیند اور دن کا قرار ختم کردیتے ہیں۔“

انھوں نے پھر ملازمہ کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ دے لفظوں میں بولی ”قاضی صاحب! یہ تو معمولی مقدمہ ہے۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ خوامخواہ اپنا سکون غارت کر دیا۔ اتنے چھوٹے سے مسئلے کو آپ نے پیچیدہ قرار دے ڈالا۔ لو یہ کوئی انہونی بات تو نہیں، جس کے لیے آپ کئی راتوں سے شب بیداری کر رہے ہیں۔ پہلے ہی روز مجھے یہ بتا دیتے، تو میں آپ کو بتاتی کہ اس خزانے پر کس کا حق ہے؟ مکان خریدنے یا بیچنے والے کا۔“ یہ کہہ کے ملازمہ خاموش ہوگئی۔

قاضی صاحب حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگے۔ سوچنے بیٹھ گئے ”کمال ہے، کل کی چھوکری اور اتنا بڑا دعویٰ کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں نے قانون کی تمام کتابیں کھنگال ڈالیں اور کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور اس نے کھڑے کھڑے اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا۔ حیرت ہے بھئی۔ ذرا سنوں تو، یہ کیا کہتی ہے؟ بات ہے ذرا ٹیڑھی سی! دیکھوں تو سہی اس کے دماغ میں کیا کچھ آیا ہے۔“ اس نے چند ثانیوں میں چٹکی بجاتے ہی گمبھیر مسئلے کا حل تلاش کرلیا۔ ”اگر بات میری سمجھ میں آئی، تو اس کے مطابق میں فیصلہ کردوں گا۔“

وہ ملازمہ سے بولے ”ہاں میری بچی، تمھیں اجازت ہے۔ کھل کر بتاؤ۔ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟“

ملازمہ نے لہجہ دھیما رکھا اور قاضی صاحب کو ایک ایسی مثال دی کہ وہ ششدر رہ گئے۔ لڑکی نے واقعی مسئلے کو حل کر دیا۔ وہ مطمئن ہوگئے۔ فریقین نے دو دن بعد عدالت میں پیش ہونا تھا۔ قاضی صاحب اتنے خوش ہوئے کہ ملازمہ سے کہا ”یہ دودھ کا پیالہ اٹھاؤ، اسے دوبارہ گرم کرو اور نوش کرلو۔“

لڑکی نے ذرا تذبذب سے کام لیا، تو قاضی صاحب نے فرمایا ”یہ ہمارا حکم ہے کہ یہ دودھ اب تم نوش کرو۔ آج رات ہم بغیر دودھ پیے سوئیں گے۔“

ملازمہ نے پیالہ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

قاضی صاحب نے لالٹین بجھائی اور اطمینان سے سو گئے۔ پیشی والے دن قاضی سلطان احمد عدالت پہنچے۔ دونوں فریق بھی فیصلہ سننے کے لیے موجود تھے۔ قاضی صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔ وہ بولے ”جس شخص نے مکان خریدا، خزانہ اسی کا ہے۔“

یہ فیصلہ سن کر محمود کچھ تلملایا۔ پوچھا کہ یہ فیصلہ کس بنیاد پر ہوا ہے؟ قاضی صاحب نے ملازمہ کی بیان کردہ مثال دہرا دی۔ اسے سن کر محمود بھی گنگ رہ گیا اور اسے قاضی کا فیصلہ تسلیم کرنا پڑا۔

ملازمہ نے جو مثال دی اب وہ ملاحظہ فرمائیے:

ملازمہ نے قاضی صاحب سے کہا ”جناب فرض کیا آپ کے پاس مرغی ہے۔ آپ نے وہ مرغی کسی شخص کو فروخت کر دی۔ خریدار مرغی اپنے گھر لے گیا۔ دوسرے روز مرغی نے اس کے گھر سونے کا انڈا دیا۔ وہ انڈا آپ کا ہوگا یا خریدار کا؟

وہ بولے ”ظاہر ہے، وہ انڈا خریدار کو ملے گا۔“

لڑکی بولی ”تو جناب یہ خزانہ بھی اب اس شخص کا ہے جس نے مکان خریدا۔“

مثال اتنی قوی ثابت ہوئی کہ قاضی صاحب انگشت بدنداں رہ گئے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

کافر گھرانے میں جنم لینے والا

ہندو جو مسلمان ہو کر پروفیسر بنا

سیّدالانبیاؐ کی نظرِ عنایت نے راہ سے بھٹکے ایک نوجوان کو ہدایت دے دی..... ایمان افروز آپ بیتی

پروفیسر غازی احمد

میں ۱۹۲۲ء میں ضلع جہلم (اب چکوال) کے دور افتادہ گاؤں، میانی میں ایک ہندو خاندان کے گھر پیدا ہوا۔ والدین نے میرا نام کرشن لال تجویز کیا۔ خاندان کے تمام افراد سناتن دھرمی عقائد کے مالک تھے۔ شروع شروع میں میرا میلان طبع بھی انہی عقائد و نظریات کی طرف تھا۔ جب آٹھویں جماعت میں پہنچا، تو میرا رجحان خود بخود دین اسلام کی طرف ہونے لگا۔

اسی اثنا میں بوچھال کلاں کے ایک عالم دین مولانا عبدالرؤف سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے متعدد نشستوں میں مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح کر دی۔ میں ان کے مواعظ سے بہت متاثر ہوا۔ لیکن ابھی لڑکپن کی منزل ہی کا راہی تھا، اس لیے اپنے آبائی مذہب، خاندان، بہن بھائیوں، والدین اور گھر بار کو چھوڑنے کا خیال بھی میرے ننھے سے دل میں قیامت خیز لرزہ برپا کر دیتا۔ جب بھی اسلام قبول کرنے کا خیال آتا، دل میں ماں اور بھائیوں کی محبت کا بہاؤ تیز ہو جاتا۔ بچپن کی ناتجربہ کاری اور ناپختگی میرے آڑے آتی اور میں کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ پاتا۔

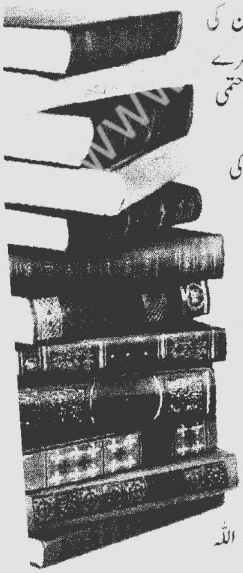

یکم مارچ ۱۹۳۸ء کی سہانی اور مبارک رات میں نے خواب دیکھا کہ مکہ معظمہ میں بیت اللہ شریف کے عین سامنے کھڑا ہوں۔ سیدالاولین والآخرین حضرت محمد ﷺ (فداہ روحی، ابی، امی) دیوار کعبہ سے تکیہ لگائے جلوہ افروز ہیں۔ اردگرد صحابہ کرام رضوان اللہ

www.pdfbooksfree.pk

علیہم اجمعین تشریف فرما ہیں۔ میں والہانہ جذبہ و شوق کے عالم میں صحابہ کرامؓ کے درمیان سے گزرتا سید الانبیا ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پہنچا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے بدن کے رگ و ریشہ میں مسرت و شادمانی کی عجیب لہر دوڑ گئی۔

فرمایا: ''کہو کیسے آئے؟''

''مشرف باسلام ہونے آیا ہوں۔'' میں نے عرض کیا۔

یہ سن کر آنحضرت ﷺ کا پر انوار چہرہ مسرت سے چمک اٹھا۔ میرا ہاتھ اپنے مقدس ہاتھوں میں تھام کر آپ ﷺ نے کچھ پڑھا جسے میں اس وقت سمجھ نہیں سکا۔ پھر فرمایا ''بس اب تم دولت اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔''

حسب معمول صبح آنکھ کھلی، تو میرا ننھا سا دل خوشی کے جذبات سے معمور تھا۔ جب والدہ محترمہ کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگا، تو انھوں نے مجھ سے خلاف معمول اس قدر خوش نظر آنے کی وجہ پوچھی۔ میں بات ٹال گیا۔

مدرسے کے اوقات میں مولانا عبدالرؤف سے مل کر جب رات کا پُرلطف خواب سنایا، تو انھوں نے فرمایا: ''روزانہ سوتے وقت اللہ تعالیٰ سے راہ ہدایت کی دعا کیا کرو۔'' تین مارچ ۱۹۳۸ء کو جمعرات کا دن تھا۔ میں رات کو حسب معمول سو رہا تھا کہ خواب میں یوں محسوس ہوا جیسے چھٹی ہونے پر میں میانی کے تمام طلبہ کے ساتھ گھر واپس آ رہا ہوں۔ راستے میں ایک قوی ہیکل، دیو قامت اور کریہہ المنظر شخص کھڑا ہے جسے دیکھ کر ہم سب پر لرزہ طاری ہو گیا۔

میں نے ساتھیوں سے کہا ''یہ دجال ہے۔ جس سے بھی یہ پوچھے کہ تم کس کے بندے ہو، وہ یہی جواب دے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔''

وہ پھر میرے ساتھیوں سے فرداً فرداً سوال کرنے لگا۔ جو طالب علم اس کی مرضی کے مطابق جواب دیتا، اسے قسم قسم کے کھانے، مزے کے پھل اور طرح طرح کے کھلونے دیتا۔ جو اس کی بات نہ مانتا، اسے مارتا پیٹتا۔ آخر جب میری باری آئی، تو اس نے پوچھا ''کس کے بندے ہو؟''

''اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی اس نے مجھے اس زور سے گھونسا رسید کیا کہ میں کئی گز دور جا گرا اور رونے لگا۔ دجال نے تحکمانہ لہجہ میں آواز دیتے ہوئے کہا ''ادھر آؤ۔''

میں ڈرتا کانپتا ادھر جانے لگا تھا کہ میرے کانوں میں حضور نبی اکرم ﷺ کی شیریں آواز پڑی۔ ''پہلے

صاحبِ تحریر

پروفیسر غازی احمد ۲؍جون ۱۹۲۴ء کو میانی میں پیدا ہوئے۔ یہ مشہور قصبے، بوچھال کلاں کے قریب واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ قبول اسلام کے بعد پاکستان ہی میں مقیم رہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کرنے کے بعد شعبہ تدریس کی طرف آ گئے۔ پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج، بوچھال کلاں میں طالبان علم کی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ عربی کی مشہور کتب، الھدایہ اور اصول الشاشی کا اردو ترجمہ کیا۔ ممتاز اسلامی سپہ سالار، موسیٰ بن نصیر کی داستان حیات لکھی، نیز احادیث نبوی ﷺ پر ایک کتاب مرتب کی۔ آپ نے ۲۵؍اگست ۲۰۱۰ء کو وفات پائی۔

www.pdfbooksfree.pk

میرے پاس آؤ۔"

آپ ﷺ کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ سوچا، ابھی دو دن پہلے تو میں نے آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں دیکھا تھا، آج آپؐ یہاں تشریف لے آئے؟ میں دجال کے خوف سے روتا ہوا آنحضرت ﷺ کی بارگاہ رسالت میں پہنچا۔ آپ ﷺ نے میری کمر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا "دیکھو، دجال کی بات ہرگز نہ ماننا، میں تمھارے لیے دعا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ناکامی کا منہ نہیں دیکھو گے۔"

یہ ارشاد فرما کر آپ ﷺ جب تشریف لے گئے، تو میں دجال کے پاس پہنچا۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔ میں نے بھی حسب سابق وہی جواب دیا۔ اس پر وہ مارے غضب کے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے جھلا کر جب میرے منہ پر تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو مارے دہشت کے میں چیخ اٹھا۔ ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور پھر صبح تک مجھے نیند نہ آسکی۔

پھر میں نے فیصلہ کیا کہ آج ہی بوچھال کلاں پہنچ کر قبول اسلام کا اعلان کر دوں گا۔ والدہ محترمہ نے جب صبح ناشتا تیار کیا، تو انہی کے پاس بیٹھ کر کھایا۔ اس وقت دل میں جذبات کا تلاطم بپا تھا۔ جانتا تھا کہ آج ہمیشہ کے لیے ماں اور بھائیوں سے جدا ہو رہا ہوں۔ پھر اس گھر میں جہاں زندگی کی کئی بہاریں لوٹی ہیں، شاید ہی دوبارہ یہاں قدم رکھنا نصیب ہو۔ چھوٹے بھائیوں کی محبت و شفقت نے مجھے مجبور کیا، تو بہانے بہانے سے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر دل کو تسکین دی۔

اسی طرح حیلے بہانے سے پیاری اماں کے قدم چھو کر ہدیہ عقیدت و احترام پیش کیا۔ کھانے سے فارغ ہوا، تو بستہ اٹھایا۔ گھر، تینوں بھائیوں اور محترمہ والدہ کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پرنم آنکھوں سے اپنے آبائی گھر سے رخصت ہو گیا۔

۴/مارچ ۱۹۳۸ء کو جمعہ کا مبارک دن اور محرم کی پہلی تاریخ تھی کہ میں سیدھا مسجد میں داخل ہوا۔ مولانا عبدالرؤف نے مجھے مشرف باسلام کر کے غازی احمد نام تجویز کیا۔ میرے اسلام لانے کی اطلاع جب گھر پہنچی، تو کہرام مچ گیا۔ سب رونے پیٹنے لگے۔ میرے والد کشمیر میں ملازم تھے۔ انھیں اور دیگر رشتہ داروں کو بذریعہ تار اس خبر سے مطلع کیا گیا۔ ابھی تین چار روز بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ والد نے رشتہ داروں سے مل کر مولانا عبدالرؤف اور ملک محمد طفیل، ہیڈ ماسٹر پر مقدمہ دائر کر دیا کہ انھوں نے ہمارے نابالغ بچے کو ورغلا کے زبردستی مسلمان بنا لیا ہے۔

ایس۔ڈی۔ایم کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ ایک طرف والد اور متعدد ہندو رشتے دار تھے، دوسری طرف میں اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان! عدالت میں میرا بیان لیا گیا۔ میں نے کہا: "میں اپنی رضا و رغبت سے مسلمان ہوا ہوں۔ میرے قبول اسلام میں کسی فرد و بشر کا ہاتھ نہیں۔ میں مسلمانوں ہی کے پاس رہوں گا۔ والدین کے پاس مجھے جان کا خطرہ ہے۔" جب فیصلہ میرے حق میں ہوا، تو مسلمان خوشی سے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے عدالت سے واپس لوٹے۔

میرے والد بھلا کب خاموش بیٹھنے والے تھے، انھوں نے مختلف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا، مگر انھیں کہیں کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ پولیس نے ہندوؤں کے دباؤ میں آکر بڑی تحقیق و تفتیش سے کام لیا۔ مگر میرے رشتہ داروں کو اپنا مقصد حل ہوتا نظر نہیں آیا۔ ہر عدالت میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان میرے ساتھ ہوتے جو اکثر

www.pdfbooksfree.pk

اوقات بوچھال کلاں سے پیدل چل کر جایا کرتے۔ اس کے بعد والد نے سیشن جج جہلم سے رجوع کیا اور کہا ''میرے نابالغ لڑکے کو زبردستی مسلمان بنالیا گیا ہے۔'' جہلم کے سرکردہ ہندوان کے ساتھ تھے، جنھوں نے مل ملا کر جج صاحب پر دباؤ ڈالا۔

عدالت میں پیشی ہوئی، تو میں نے محسوس کیا کہ جج کا رویہ میرے بارے میں ٹھیک نہیں۔ اس پیشی پر دو تین مسلمان میرے ساتھ تھے۔ جج صاحب نے مجھے دوسری پیشی تک والد کے سپرد کر دیا۔ جب میں نے انکار کیا، تو مجھے زبردستی کار میں بٹھا دیا گیا۔ پھر مجھے دریا کنارے ایک مندر لایا گیا جہاں سارا دن میں نے رو رو کر گزارا۔ اسی دوران والدہ محترمہ کو جہلم بلایا گیا۔ انھوں نے مجھے دھمکی دی ''اگر تم نے ہمارے حق میں بیان نہ دیا، تو میں گھر زندہ نہیں جاؤں گی بلکہ دریا میں کود کر خودکشی کرلوں گی۔'' دوسرے ہندو بھی وقتاً فوقتاً آ کر مجھے سمجھاتے بجھاتے اور قسم قسم کے لالچ دیتے رہتے۔

اس اثنا میں والد نے ہندو اکابر کے اثر و رسوخ سے کام لے کر ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر جہلم سے میرے نابالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ اسے مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے ہی عدالت میں پیش کیا۔ جج صاحب نے جب مجھ سے پوچھا کہ آپ والدین کے پاس رہنے میں خوش ہیں؟ تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ لیکن افسوس، میری کسی بات کو اہمیت نہ دی گئی اور زبردستی مجھے والدین کے سپرد کر دیا گیا۔

تعجب تو اس بات پر تھا کہ والد کے حق میں فیصلہ دینے والے جج صاحب مسلمان تھے۔ بعدازاں والد ہی نے بتایا کہ انھوں نے جج کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرایا تھا۔

اسی دن والد مجھے ساتھ لیے کشمیر روانہ ہو گئے۔ تین دن ہم جموں میں ایک پنڈت کے ہاں فروکش ہوئے۔ پنڈت نے مجھے رام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر اس کے غیر معقول دلائل مجھے متاثر نہ کر سکے۔ کشمیر پہنچ کر میں نے مولانا عبدالرؤف کو خط بھجوانا چاہا، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

والد نے سوتے میں وہ خط میری جیب سے نکال کر ضائع کر دیا۔ چوتھے دن والد مجھے لیے بھدرواہ روانہ ہو گئے۔ بٹوت تک بس کے ذریعے پھر بھدرواہ تک پیدل راستہ طے کیا۔ دوسرے دن وہ مجھے ایک پنڈت کی معیت میں گاؤں سے باہر ایک بلند پہاڑی پر لے گئے اور اپنے پاس بٹھا کر کہا: ''دیکھو میں اس مقدمے میں تم پر دس ہزار روپیہ خرچ کر چکا۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ خاندان میں میری ذرہ برابر عزت نہیں رہی۔''

یہ کہتے ہوئے والد کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے اپنی زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میرا دل پسیج گیا، مگر رحمت ایزدی نے مجھے سہارا دیا اور حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت کے تمام حالات میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ میں نے والد کی خدمت میں عرض کیا ''مجھے آپ کی پریشانیوں اور تکالیف کا احساس ہے۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میرا دل ترک اسلام کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ مجھے اسلام پر قائم رہنے کی اجازت مرحمت فرما دیں، تو تمام عمر آپ کی غلامی میں بسر کروں گا۔''

والد یہ سنتے ہی چھڑی ہاتھ میں لے کر مجھے پیٹنے لگے۔ اتنا پیٹا کہ بدن سے خون بہنے کے باعث میرے سارے کپڑے سرخ ہو گئے۔ اس پر بھی انھیں رحم آیا اور

www.pdfbooksfree.pk

نہ اُن کی مار میں کوئی کمی آئی۔ میں آدھ موا ہو کر پڑا ٹھوکریں کھاتا رہا۔ آخر جب وہ دل کا غبار اچھی طرح نکال چکے، تو پنڈت سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''کیوں نہ میں اسے دریا میں دھکیل دوں۔ شاید اسی طرح کلنک کا یہ ٹیکا میرے ماتھے سے اتر جائے۔''

پہاڑی کے دامن میں بپھرا دریا میرے سامنے تھا۔ اپنی موت کے خوف سے میں لرز گیا، مگر اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے، اس نے میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی۔ میرے دل میں یہ خیال بار بار ابھرنے لگا کہ اگر والد مکرم نے مجھے دریا میں پھینکا، تو میں اپنے پیارے نبی ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کروں گا ''میرے آقا آپؐ نے مجھے اسلام کی جو دولت بخشی تھی، میں اس کو صحیح وسالم لیے حاضر ہو گیا ہوں۔''

پنڈت صاحب نے جو مارے خوف کے کانپ رہے تھے، والد سے کہا ''ابھی یہ بچہ ہے۔ بڑا ہو کر سنبھل جائے گا۔ آپ کوئی سخت اقدام نہ اٹھائیں۔''

والد نے پنڈت کی بات مان لی اور مجھے ساتھ لے کر چپ چاپ گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر والد نے خود ہی میری مرہم پٹی کی۔ چمڑی کی مار اور بوٹوں کی ان گنت ٹھوکروں سے جسم کا رواں رواں زخمی تھا، حتیٰ کہ ناک، منہ اور آنکھیں تک سوجی ہوئی تھیں۔

میں تقریباً ہفتہ بھر بستر پر دراز رہا۔ پھر والد نے مجھے بھدرواہ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ میں ہندو لڑکوں کی نگرانی میں روز اسکول آنے جانے لگا۔ مسلمان طلبہ کو میرے ساتھ بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ہندو لڑکے ہی نہیں اساتذہ بھی مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ وہ اسکول میرے لیے جہنم سے کم اذیت ناک نہ تھا۔

آخر کار میں نے دوست محمد نامی مسلمان ہم جماعت سے تعلقات بڑھائے۔ اس کے توسط سے مولانا عبدالرؤف کو خط لکھا اور بتایا کہ میں بفضلہ تعالیٰ اسلام پر قائم ہوں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی دعا ہی کی برکت ہے کہ مجھے شدید جسمانی تکلیف بھی اسلام سے برگشتہ نہیں کر سکی۔ مولانا صاحب نے خط ملتے ہی قصبے کے سارے لوگوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا ''کوئی ہے جو جان پر کھیل کر ایک مسلمان کو کافروں کے عذاب سے چھٹکارا دلائے؟'' اس پر ایک غریب لیکن جذبہ شہادت سے سرشار شخص اٹھا اور اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ ان کا نام جان محمد تھا۔

> ''میں اپنی رضا و رغبت سے مسلمان ہوا ہوں۔ میرے قبول اسلام میں کسی فرد و بشر کا ہاتھ نہیں۔ میں مسلمانوں ہی کے پاس رہوں گا۔ والدین کے پاس مجھے جان کا خطرہ ہے۔''

جان محمد اوقات مدرسہ ہی میں بھدرواہ پہنچ گئے۔ دوست محمد کی وساطت سے جب مجھے ان کی آمد کا پتا چلا، تو میں آدھی چھٹی کے بعد روتا ہوا ماسٹر صاحب کی خدمت میں پہنچا اور کہا ''میرے پیٹ میں سخت درد ہے۔ مجھے چھٹی عنایت فرمائی جائے۔'' ماسٹر نے چھٹی دے دی۔ میں نے بستہ اٹھایا اور چھپتا چھپاتا، ہندو طلبہ سے آنکھ بچاتا مدرسہ سے نکل آیا۔

جان محمد نے ایک مسلمان راہبر کو ساتھ لیا اور ہم راتوں رات تیزی سے سفر کرتے ریاست کشمیر سے نکل ریاست چنبہ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ وہاں مسلمان راہبر واپس ہو گیا۔ ہم دونوں تقریباً ساٹھ میل سفر طے کر کے تیسرے دن صبح ڈلہوزی پہنچے۔ تکان سے میرا برا حال تھا۔ کپڑے میلے اور پاؤں سوج چکے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

شام کو بذریعہ پٹھانکوٹ امرتسر پہنچے، تو میں نے اپنا ہندوانہ لباس اتار کر اسلامی کپڑے پہن لیے۔ اب ہم امرتسر سے کھوڑہ کی راہ بوچھال کلاں پہنچ گئے۔ بس اڈے پر مسلمانوں کا ہجوم ہماری پذیرائی کے لیے موجود تھا۔

والد کو جب میرے فرار کا علم ہوا، تو انھوں نے تمام راستوں کی ناکہ بندی کرنے کے لیے تار دے دیے۔ لیکن جس راستے کو ہم نے اختیار کیا تھا، وہ ان کے علم میں نہ تھا، اس لیے بچ نکلے۔

چند روز بعد والدہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اشکبار ہو کر فرمایا ''بیٹا ہمیں اس قدر ذلیل ہی کرنا تھا، تو پہلے بتا دیتے تاکہ روپے خرچ کرنے سے تو بچ جاتے۔''

عرض کیا ''اماں جی! میں نے آپ سے پہلے کہہ دیا تھا کہ میں اسلام کو ترک کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آپ میرے لیے کچھ نہ کیجیے۔ ہاں ویسے میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ کی ہر خدمت میرے لیے باعث سعادت ہے۔ مجھے آپ کے وہ احسانات یاد ہیں کہ جب بھی خاندان والوں نے مجھے ختم کرنے کی کوئی سازش کی، تو آپ نے مجھے پہلے ہی مطلع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔''

میں نے والدہ سے صلح کر لی اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ مگر والد کو میں نے چھے سال بعد دیکھا۔ راستے میں اچانک آمنا سامنا ہو گیا، مگر وہ بغیر توجہ دیے قریب سے گزر گئے! میں بھی ان سے بات کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے موقع پر میرے خاندان کے سبھی افراد بھارت چلے گئے۔ میں مسلمان بھائیوں کے ساتھ پاکستان میں رہا اور اپنے آبائی مکان منتقل ہو گیا۔ ۱۹۵۰ء میں مجھے اطلاع ملی کہ والد چل بسے ہیں۔ والدہ اور تین بھائی انبالہ کے قریب ایک گاؤں میں مقیم ہوئے تھے۔

۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان میں نے اسکول میں اوّل رہ کر امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ بعد ازاں علوم دینیہ کی طرف توجہ دی، چناں چہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک مدرسہ خادم الشریعۃ پنڈی گھیپ، مدرسہ عربیہ اشاعۃ القرآن گجرات اور دارالعلوم دیوبند میں علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ ۱۹۴۸ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور صوبے بھر میں اوّل آیا۔

میرا ایمان ہے، یہ ساری کامرانیاں آنحضرت ﷺ کی دعا کی مرہون منت مجھے نصیب ہوئیں۔ ۱۹۵۴ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں بی۔ایڈ کیا۔ ۱۹۵۸ء میں ایم۔اے عربی کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۵۹ء میں ایم۔اے علوم اسلامیہ کا امتحان دیا اور صوبے بھر میں اوّل رہا۔ ان تمام عنایات پر میں اپنے مالک حقیقی کا شکر گزار ہوں۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے اپنے اندر بہت بڑا ذہنی و روحانی انقلاب محسوس کیا۔ پہلے میں ایک متوسط ذہن کا مالک تھا۔ اسلام کے سایۂ عافیت میں پناہ لینے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیوی ترقی کے دروازے بھی میرے لیے کھول دیے۔ دوسری بات جو میں نے اپنی عملی زندگی میں محسوس کی کہ نبی اکرم ﷺ کی دعا کا اثر ہے، مجھے آج زندگی کے کسی شعبے میں ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آنحضرت ﷺ کی دعا ہی میری زندگی کا سب سے قیمت سرمایہ ہے۔ ان شاء اللہ قیامت کے دن یہی دعا میری نجات کا باعث ہو گی۔

(آمین ثم آمین)

www.pdfbooksfree.pk

دورِ جدید کا ایک المیّہ

اسلام سے دور ہوتے مسلمان

مغربی تہذیب و ثقافت انھیں اسلامی تعلیمات سے دور کر رہی ہے

ڈاکٹر ندیم بھٹی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں لارنس اسکوائر مال پر میرا دفتر واقع تھا۔ اس مال میں ایک بنگلہ دیشی مسلمان، نجیب کی دکان تھی۔ ایک دن نجیب نے بتایا کہ سامنے جوتے مرمت

سماجیات

کرنے اور تالے کی چابیاں بنانے والے چینی میاں بیوی مسلمان ہیں۔

مجھے ایک دفعہ اپنے دفتر کی چابیاں بنوانے ان کے پاس جانا پڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ مسلمان ہیں، میں نے السّلام علیکم کہا۔ دونوں میاں بیوی نے جواب نہ دیا اور میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے دوبارہ السّلام علیکم کہا لیکن جواب نہ ملا۔ میں سمجھ گیا کہ انھیں السّلام علیکم کی سمجھ نہیں آئی۔ خیال آیا کہ یقیناً نجیب کو غلطی لگی ہے۔

میں نے پوچھا ''آپ مسلمان ہیں؟''

دونوں نے جواب دیا ''ہاں۔''

میں نے کہا ''آپ کو السّلام علیکم کی سمجھ نہیں آئی؟''

انھوں نے جواب دیا ''نہیں۔'' پھر عورت نے بتایا کہ اس کی ماں ایسے الفاظ استعمال کرتی تھی۔

میں نے پوچھا ''آپ کو بسم اللہ کے متعلق معلوم ہے؟''

www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے کہا ''نہیں۔''

میں نے پوچھا ''کلمہ آتا ہے؟''

جواب دیا ''نہیں۔''

میں نے پوچھا ''نماز کبھی پڑھی ہے؟''

کہا ''نہیں۔''

پھر پوچھا '' آپ اللہ کو جانتے ہیں؟''

انھوں نے جواب دیا ''ہاں۔''

گویا اسلام کے بارے میں ان کا علم صرف ایک لفظ تک محدود تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے گزرتے ہوئے انھیں السلام علیکم کہنے لگا اور ان کو جواب دینا سکھایا۔ باتوں باتوں میں اسلامی تعلیمات بھی سکھائیں۔ اس واقعے سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ کفروشرک کے مغربی ماحول میں رہنے والے بہت سے مرد عورتیں مسلمان کہلانے کے باوجود اسلام سے بہت دور ہو۔

دنیا کے مختلف خطوں میں ماہرین مذہبی رجحانات کے بارے میں جاننے کی کر رہے ہیں۔ اس امر کا مطالعہ نہایت پیچیدہ ہے۔ ایک طرف تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دن بدن لوگ مذہب کی جانب مائل ہو رہے ہیں۔ دوسری جانب مذہب بیزاری اور بغاوت بھی تحریک کی صورت اختیار کر رہی ہے۔

حال ہی میں ون۔ گیلپ انٹرنیشنل (Win-Gallup International) کے سروے میں بتایا گیا کہ مذہبی رجحانات دم توڑ رہے ہیں۔ سروے کے مطابق دنیا کی ۵۹ فیصد آبادی اپنے آپ کو مذہبی کہتی ہے۔ ۱۳ فیصد نے اپنے آپ کو دہریہ (Atheist) کہا۔ ۲۳ فیصد آبادی نے بتایا کہ ان کا کوئی مذہب نہیں۔ اس تحقیق کے مطابق دہریے زیادہ تر چین، جاپان اور مغربی یورپ میں ملتے ہیں۔ مذہبی میلانات والے علاقوں میں افریقا، مشرق وسطی، جنوب مشرقی ایشیا، جنوبی یورپ اور لاطینی امریکا کے علاقے شامل ہیں۔

یہ سروے کی رو سے کم آمدنی والے افراد میں مذہبی رجحانات امرا کے مقابلے میں ۱۷ فیصد زیادہ ہیں۔ نیز زیادہ تعلیم یافتہ نسبتاً کم مذہبی رجحانات رکھتے ہیں۔ یہ دلچسپ بات بھی معلوم ہوئی کہ جوں جوں انسان بالغ ہو، اس کے مذہبی رجحانات میں کمی آ جاتی ہے۔ یہ کمی ۶۵ سال کی عمر تک رہتی ہے۔ پھر مذہبی رجحان میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

> یہ مسلمان ہوگا۔ اعتماد کے ساتھ بے جھجک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور آواز آئی ''Who is it'' (کون ہے؟)

دور حاضر میں ایک طرف یہ سننے کو ملتا ہے کہ ۲۰۴۱ء تک مذاہب ختم ہو جائیں گے۔ دوسری جانب مذہبی رجحانات کے حامی محقق دعویٰ کرتے ہیں کہ شعور کی بیداری لوگوں کو مذہب کے قریب لا رہی ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں کا اسلام کی طرف مائل ہونا روزمرہ کی حقیقت ہے۔

اس امر پر تمام ماہرین متفق ہیں کہ بڑے مذاہب میں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اسلام ۱٫۶ فیصد سالانہ کے حساب سے پھیل رہا ہے۔ سکھ ازم ۱٫۴، عیسائیت ۱٫۲ فیصد اور ہندومت بھی ۱٫۲ فیصد کے حساب سے بڑھ رہے ہیں۔ ان مذاہب کی رفتار عالمی آبادی میں اضافے کی شرح سے ۱٫۱ فیصد زیادہ ہے۔ حقائق سے عیاں ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ اضافہ مسلمانوں کی تعداد

www.pdfbooksfree.pk

میں ہو رہا ہے۔

یورپ اور شمالی امریکا میں بھی اسلام تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا۔ نومسلموں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور شعوری طور پر مسلمان ہوئے۔ یہ لوگ مصدقہ کتب کے مطالعے اور اپنے مشاہدے کی بدولت پختہ بنیادوں پر مسلمان بنتے اور بہت باعمل ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو مختلف غیر اسلامی، سماجی اور سیاسی قوتوں سے محفوظ رکھا جائے۔ جہاں ایک طرف نئے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں، وہیں بہت سے افراد سماجی اور معاشی حالات کی بنا پر دور بھی ہو چکے۔

مجھے یاد ہے، جب بہ سلسلہ تعلیم آسٹریلیا جانے کا موقع ملا، تو جس ہوسٹل میں رہائش ملی، اس میں میرے علاوہ کوئی مشرقی طالب علم نہ تھا۔ چونکہ مجھے کوئی جانتا نہیں تھا، اس لیے میری سعی رہی کہ کسی سے سماجی رابطہ قائم کروں۔ ایک دن ایک کمرے کے باہر "اسمٰعیل" لکھا دیکھا۔ فوراً یقین کر لیا کہ یہ مسلمان ہوگا۔ اعتماد کے ساتھ بے جھجک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور آواز آئی "Who is it" (کون ہے؟)

میں نے دیکھا، تو ایک نیم برہنہ لڑکی نظر آئی۔ میں یکدم شرمندہ ہو گیا۔ سمجھ نہیں آئی کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کروں۔ بہرحال خفت مٹانے کے لیے کہا "Can I see Ismail" (کیا میں اسمٰعیل سے مل سکتا ہوں؟)

لڑکی نے دروازہ ذرا زیادہ کھولا اور بستر میں سوئے پڑے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا "Here he is" (وہ رہا)۔

اب میں سچے اسلامی جذبے کے ساتھ وہاں گیا تھا، لیکن منظر میری توقعات کے برعکس نکلا۔ میں نے کہا "Ok talk to you later" (میں پھر آؤں گا)۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔

کچھ دن بعد اسمٰعیل مجھے کھانے کے وقت ملا۔ میں نے اس سے دریافت کیا: "Are you Muslim?" (کیا تم مسلمان ہو؟)

اس نے کہا: "Well, my father is" (میرے والد مسلمان ہیں)۔

میں نے پوچھا "آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟"

جواب ملا "مراکش سے ہوں۔ چھوٹا سا تھا جب میرے والدین آسٹریلیا کی شہریت لے کر یہاں چلے آئے۔" میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اپنے والدین سے الگ ہو چکا اور اسلام کی کسی تعلیم پر عمل نہیں کرتا۔ مغرب میں بسے ایسے ہزاروں نوجوان غیر اسلامی، معاشرتی اور معاشی حالات میں اسلام سے دور ہو رہے ہیں۔ لیکن ہماری گنتی میں وہ بھی مسلمان ہیں۔ یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

سڈنی اولمپکس ۲۰۰۰ء میں مجھے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ میں تب سڈنی یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز کے سوئمنگ پول پر تعینات تھا۔ اس جگہ مختلف ٹیمیں پیراکی کی مشق کرنے آیا کرتی تھیں۔ ان میں قازقستان کی ٹیم بھی شامل تھی۔ ٹیم کے کپتان کا نام اسکر (اصغر) تھا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں اس کے قریب ہو گیا۔

ایک روز اپنے لیے دوپہر کا کھانا لانے لگا، تو کچھ زیادہ خوراک ساتھ لے لی تاکہ اصغر کو بھی کھانے میں شامل کر سکوں۔ میں نے اصغر سے کہا کہ آپ کو یہاں حلال کھانا ملنے میں دشوار ہوتی ہوگی، اس لیے گھر سے بنا کر لایا ہوں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اصغر نے کہا "میں حلال

www.pdfbooksfree.pk

وغیرہ کی پروانہیں کرتا اور سب کچھ کھالیتا ہوں۔''

میں نے پوچھا ''پورک'' بھی کھا لیتے ہو؟''

اس نے بتایا کہ قازقستان میں لوگ زیادہ حلال حرام کا خیال نہیں کرتے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مسلمان اپنے بنیادی اعتقادات سے دور ہو چکے۔ وہ مغربی ثقافت کے زیر اثر برائے نام مسلمان رہ گئے ہیں۔ لیکن اللہ کی قدرت اور اسلام کے دیرپا اثرات کی بدولت صبح کے بھولے شام کو گھر واپس بھی آرہے ہیں۔

میں آسٹریلیا کی یونیورسٹی آف نیو انگلینڈ کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ میرے ساتھ والے کمرے میں ایک پادری، فادر فورٹ (Father Forte) رہائش پذیر تھا۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگا ''Nadeem, Do you know any Imam?'' (ندیم، تم کسی امام کو جانتے ہو؟)

میرے لیے یہ سوال عجیب سا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی، تو اس نے بتایا، یونیورسٹی سے کچھ کلومیٹر دور ایک گاؤں میں ایک بزرگ قریب المرگ ہے۔ اس کو کسی مسلم امام کی ضرورت ہے۔ میں نے یونیورسٹی کی مسجد میں دوستوں کو بتایا، تو انھوں نے گاؤں جانے کی حامی بھر لی۔

گاؤں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک پچاسی سالہ بوڑھا جو دیکھنے میں انگریز لگتا تھا، سخت بیمار ہے۔ وہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس کے بیٹے بہو اور پوتے پوتیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ اس شخص کا نام مسٹر خاں تھا۔ پتا کرنے پر عیاں ہوا کہ وہ ۱۸ سال کا تھا جب صوبہ سرحد سے آسٹریلیا آیا۔ آنے کے بعد کاروبار کیا اور کامیاب تاجر بن گیا۔ آسٹریلیا میں ایک عیسائی گوری سے شادی کی اور بچوں کے نام بھی ایڈم خاں اور اینڈریو خاں وغیرہ رکھے۔ بچوں کی شادیاں بھی عیسائی عورتوں سے ہوئیں۔ یوں اگلی پوری نسل عیسائی ہوگئی۔ اس دوران خود مسٹر خان بھی اپنا مذہب بھول کر آسٹریلیا کے مغربی رنگ میں رنگ گیا۔

اب وہ بستر مرگ پر پڑا تھا، تو اسے اپنا ماضی یاد آنے لگا۔ اس نے بتایا ''میرے تکیے کے نیچے ایک کتاب پڑی ہے۔ اسلام کی یہی واحد نشانی میرے پاس موجود ہے۔'' یہ قرآن مجید کا نسخہ تھا جو کسی نہ کسی طرح اس کے پاس محفوظ رہ گیا۔

دوستوں نے کوشش کی کہ وہ کلمہ طیبہ ادا کر سکے لیکن وہ ادا نہ کر سکا۔ ہم نے سوچا کہ اس کے قریب قرآن مجید کی تلاوت بآواز بلند کی جائے، تو شاید زبان سے کلمہ ادا ہو جائے۔ چناں چہ ہم نے پروگرام بنایا کہ روزانہ دو تین ساتھی گاؤں جائیں اور کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر تلاوت کیا کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ موت سے قبل اس پر رحم فرما کر ایمان کی موت نصیب فرما دے۔

چناں چہ کچھ دن تک ہم لوگ روزانہ باری باری وہاں جا کر تلاوت کرتے رہے۔ بالآخر ایک روز وہ کلمہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے چند ہفتوں بعد مسٹر خاں فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یوں وہ بھی ہزارہا تارکین وطن کی طرح اپنی نسل کو مغربی معاشرے میں ضم کر کے چل دیا۔

یہ واقعات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے، اس انوکھی کیفیت کا جائزہ لیا جائے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، تو

دوسری جانب مغربی ثقافت اور معیشت کے زیر اثر بہت سے مسلمان اپنے دین و ایمان سے محروم ہو رہے ہیں۔ اہل دانش کو اس مسئلے کا حل سوچنا چاہیے۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک حجّام نے حضرت جنید بغدادیؒ کو سبق سکھایا

بدی سے محفوظ رکھ کر نیکی کا راستہ دکھلانے والے نصیحت آموز واقعات

پروفیسر خالد پرویز

ایک دفعہ میں مکہ مکرمہ میں تھا تو ایک حجام کی دکان پر اپنے بال کٹوانے گیا۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ لوگ بال کٹوا کر حجام کو اس کی اجرت دے رہے تھے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا سوچتا رہا کہ اگر بال کٹوائے تو اجرت کے پیسے کہاں سے ادا کروں گا؟ اچانک حجام کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے پوچھا ''جناب آپ بھی بال کٹوانے آئے ہیں؟''

میں نے جواب دیا ''جی ہاں! ارادہ تو یہی ہے۔''

حجام نے کہا ''جس شخص کے بال کاٹ رہا ہوں۔ اس سے فارغ ہولوں، تو پھر آپ کے بال کاٹوں گا۔''

میں نے حجام سے کہا ''لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تمہیں میرے بال خدا کے نام پر کاٹنے ہوں گے۔''

حجام نے جیسے ہی خدا کا نام سنا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسی وقت حجامت کرنا روک دی اور بیٹھے گاہک سے کہا ''باقی بالوں کی کٹائی بعد میں کروں گا۔ پہلے اس شخص کے بال کاٹوں گا جس نے خدا کا نام لیا ہے۔ جب خدا کا نام آ گیا تو یہ کام پہلے ہوگا اور دوسرے کام بعد میں۔''

چناں چہ اس نے مجھے بٹھالیا اور جس شخص کی حجامت کر رہا تھا، اسے کہا کہ وہ ابھی انتظار کرے۔ اس نے انتہائی محبت و شفقت سے میرے بال تراشے۔ اس کے بعد مجھے ایک کاغذ دیا جس میں تھوڑی سی ریزگاری لپٹی تھی۔ حجام نے کہا ''میاں! یہ تھوڑے سے پیسے ہیں، انھیں اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کر لینا۔''

میں حجامت بنوا اور حجام سے پیسے لے کر گھر آ گیا۔ دل ہی دل میں طے کیا کہ جب بھی رب رحمٰن و رحیم نے مجھے پیسوں سے نوازا، سب سے پہلے اسی حجام کے ساتھ مروت کروں گا۔ کیونکہ اس جیسا نیک دل اور با اخلاق شخص پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

رب ذوالجلال کا کرنا ایسا ہوا کہ چند ہی دن گزرے تھے، کچھ عقیدت مندوں نے مجھے بصرہ سے اشرفیوں کی ایک تھیلی بھیجی۔ میں لمحہ ضائع کیے بغیر وہ تھیلی لیے فوراً حجام کے پاس گیا اور اسے پیش کی۔ اس نے تھیلی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

میں نے جواب دیا '' جب تم نے میرے ساتھ اچھا اور پرخلوص برتاؤ کیا تھا، تو میں نے اسی وقت یہ نیت کی تھی کہ جو کچھ مجھے اوّل نصیب ہوا، وہ تمہاری خدمت میں پیش کردوں گا۔''

حجام کہنے لگا ''کس قدر افسوس کی بات ہے! تم نے تو مجھے یہ کہا تھا کہ خدا کے نام پر میری حجامت بنادو۔ اور اب یہ کیا لے کر آگئے؟ اور وہ ریزگاری بھی خدا کے نام پر دی تھی۔ تم نے بھلا یہ کہیں دیکھا ہے کہ کوئی شخص اللہ کے نام پر کوئی کام کرے یا کوئی چیز دے اور اس کا بدل وصول کرے؟ جاؤ! یہ تھیلی لے جاؤ اور میری نیکی کو خدا کے حضور قبولیت بخشنے کا موقع دو۔''

حضرت جنید بغدادیؒ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں ''میں نے زندگی میں اگر اخلاق کا سبق سیکھا، تو اسی حجام سے سیکھا۔''

ہمسائے کا پرنالہ

ان کے پاس ذاتی گھر نہیں تھا، اس لیے کرائے کے مکان میں رہائش رکھتے۔ مگر کرائے کا مکان بھی کسی نہ کسی وجہ سے اکثر بدلنا پڑتا۔ خدا کی وسیع و عریض زمین میں آج یہاں تو کل وہاں۔ ایک دفعہ ایک جگہ مکان لیا تو ساتھ کا ہمسایہ یہودی تھا۔ وہ اسلام دشمن تھا اور ختم المرسلین ﷺ کے نام لیواؤں کو تنگ کرکے خوشی محسوس کرتا۔ وہ دن اس کے لیے عید کا ہوتا جب کسی سچے اطاعت گزار، اللہ کے پیروکار اور عاشق احمد مختار ﷺ کو ایذا پہنچاتا۔

جب یہودی نے دیکھا کہ ہمسائے میں نیا کرایہ دار آیا ہے، تو اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ جب اسے پتا چلا کہ اس کا نیا ہمسایہ اللہ کا پیارا اور وقت کا ولی ہے، تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے سوچا، کون سا ایسا حربہ استعمال کروں کہ یہ مومن پرہیزگار مکان چھوڑ جائے۔ سوچ بچار کے بعد بالآخر اپنے مکان کی چھت پہ ایسا پرنالہ لگوایا جس کا منہ ہمسائے کے صحن میں کھلتا تھا۔

پرنالہ لگوانے کے بعد یہودی روزانہ اپنے نیک اور دین دار ہمسائے کے گھر پرنالے سے نجاست پھینکنے لگا۔ وہ مدت تک انتظار کرتا رہا کہ ہمسایہ کہے گا، تو پھر اس طرح لڑائی کروں گا اور یوں مالک مکان سے کہہ کر اسے نکلوادوں گا۔ مگر اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی۔

آخرکار یہودی نے تنگ آکر خود ہی اپنے نیک اور برگزیدہ ہمسائے سے پوچھا '' آپ کو میرے پرنالے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟''

یہ سن کر ہمسایہ مسکرایا اور بولا ''تکلیف تو ہوتی ہے مگر میں نے ایک ٹوکری اور جھاڑو کا بندوبست کرلیا ہے جو نجاست آپ کے پرنالے سے میرے گھر گرے، وہ میں روزانہ صاف کردیتا ہوں۔''

یہودی نے پوچھا '' آپ اتنی تکلیف کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کو غصہ نہیں آتا؟''

نیک دل، صاحب ایمان ہمسائے نے جواب دیا '' میرا پروردگار ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو غصہ پی جاتے اور دوسروں کو معاف کردیتے ہیں۔''

یہودی نے جیسے ہی یہ جواب سنا، اس کی کایا پلٹ گئی۔ منہ سے بے اختیار نکلا ''اے مالک بن دینارؒ! جو دین ایسی اچھی تعلیم دیتا ہے، اس کو میں اسی لمحے قبول کرتا ہوں۔ رب رحمٰن و رحیم سے اپنے گناہوں کی معافی کا

www.pdfbooksfree.pk

طلبگار ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہوں۔''

ایک انوکھا تحفہ

ایک انسان کی غیر موجودگی میں اس کی بُرائی کرنا، ذات پر کیچڑ اچھالنا، بدگمانی کا اظہار کرنا غیبت کہلاتا ہے۔ غیبت ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ غیبت کرنے والا جھوٹ کی سیاہ مٹی سے ایسا گھروندا تیار کرتا ہے جو وقتی طور پر خوبصورت لگتا اور ٹھوس بھی ہوتا ہے۔ مگر اس کی بنیادیں بدنیتی پر استوار ہوتی اور دیواریں بدظنی کی کھوکھلی اینٹوں سے تعمیر کی جاتی ہیں، اس لیے سچ کی بارش کا ایک قطرہ ہی انھیں زمین بوس کرنے کو کافی ہوتا ہے۔ غیبت کرنے والے کو سوائے افسوس، پشیمانی اور ندامت کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اسی طرح کا ایک غیبت گو حضرت حسن بصریؒ کے دور میں تھا۔ اس کا ہر لمحہ اور لحظہ دوسروں کی غیبت اور عیب جوئی میں گزرتا۔ سارا دن ایک سے دوسری جگہ پہنچتا۔ ایک کی برائی دوسرے کے پاس اور دوسرے کی تیسرے کے پاس کرتا۔ ایک ساعت ایک مقام، پر تو دوسری ساعت دوسرے مقام پر گزارتا۔ جو کوئی سنتا کہ اس نے یہ کچھ کہا ہے، تو غم زدہ ہو کر رہ جاتا۔ کچھ لوگ اپنی صفائی بیان کرتے، تو کچھ خاموش ہو کر رہ جاتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فن میں ماہر ہو چکا تھا۔ ایک وقت آیا کہ اس نے وقت کے ولی حضرت حسن بصریؒ کو بھی نہ چھوڑا اور ان کی غیبت سے اپنے دامن کو آلودہ کر لیا۔ لوگوں نے سنا، تو اسے ٹوکا مگر وہ کب رکنے والا تھا۔ کچھ مریدین نے حضرت حسن بصریؒ کو اس کے بارے میں بتایا کہ وہ آپؒ کے متعلق بدگوئی کرتا پھر رہا ہے۔

ولی اللہ کے ہر کام کا اپنا جدا انداز اور منفرد طریقہ ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے سنا، تو فوراً ایک مرید کو آواز دی۔ مرید حاضر خدمت ہوا اور عرض کی ''فرمائیے جناب کیا حکم ہے؟''

حضرت حسن بصریؒ نے کہا ''یہ لو پیسے، انھیں جیب میں ڈالو اور ابھی اسی وقت بازار جاؤ۔ وہاں سے تازہ و اعلیٰ چھوہاروں کا ایک ٹوکرا خرید لاؤ۔''

مرید دوڑا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد چھوہاروں کا ٹوکرا لا حاضر کیا۔ حضرت حسن بصریؒ نے چھوہاروں کو ایک طباق میں سجایا اور ایک مرید خاص سے کہا ''طباق اس شخص کے پاس لے جاؤ جو ہماری غیبت کرتا پھرتا ہے۔ اسے یہ پیش کرو اور ہماری طرف سے کہو کہ یہ تحفہ حسن بصریؒ نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں، کہ میں آپ کا شکر گزار اور ممنون ہوں، کہ آپ نے میری غیبت کر کے اپنی نیکیوں کو میرے دفتر اعمال میں منتقل کر دیا۔ میں آپ کی یہ عنایت ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اگرچہ میں آپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا تاہم یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمائیے۔''

مرید خاص نے حضرت حسن بصریؒ کے حکم کی تعمیل میں آپ کا پیغام اور چھوہاروں سے بھرا طباق غیبت گو تک پہنچایا۔ وہ حضرت بصریؒ کے قول و فعل سے از حد متاثر اور اپنے کیے پر شرمندہ اور نادم ہوا۔ اس نے حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی طلب کی اور غیبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا۔

سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۲ میں رب کائنات ارشاد فرماتے ہیں:

''اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو۔ بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں اور جاسوسی بھی نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کے غیبت کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو اس

www.pdfbooksfree.pk

کو تو تم نہ پسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

کڑوے خربوزے کی مٹھاس

آقا اور غلام کا رشتہ حاکم و محکوم کا ہوتا ہے۔ آقا کی خوشی اور خوشنودی کی خاطر غلام ہمہ وقت برائے خدمت تیار رہتا ہے۔ مگر بعض غلام ایسے بھی ہیں جو اپنی ظاہری خوبیوں، باطنی خاصیتوں اور عملی خوبصورتیوں کی بدولت آقا کے دل میں ایسا مقام پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ ان کا گرویدہ بن جاتا ہے۔

ایسا ہی غلام ایک بادشاہ کے دربار میں شاہی خدمت پر مامور تھا۔ بادشاہ اپنے غلام کی عقل و دانائی سے از حد متاثر تھا اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا۔ بلکہ بعض اوقات ایسے مواقع بھی پیدا ہو جاتے جب بادشاہ اپنے غلام کی تعریف بھرے دربار میں بڑے فخر سے کیا کرتا۔

ایک دفعہ ایک شخص بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ کافی منزلیں طے کر کے بادشاہ سے ملاقات کرنے پہنچا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے بادشاہ کی خدمت میں بطور تحفہ ایک خربوزہ پیش کیا۔ بادشاہ نے سوغات قبول کر اور اپنے خاص غلام کو آواز دی تا کہ خربوزہ اسے کھلا سکے۔ بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ کوئی چیز اپنے خاص غلام کو کھلائے بغیر نہیں کھاتا تھا۔ مگر وہ خاص غلام دربار میں موجود نہیں تھا چناں چہ ایک نوکر دوڑایا گیا کہ وہ شاہی غلام کو بلا لائے۔

بادشاہ کا پیغام ملتے ہی شاہی غلام حاضر خدمت ہوا اور عرض کی ''فرمائیے آقا! میرے لائق کوئی خدمت ہے؟''

بادشاہ نے کہا ''ادھر میرے قریب آؤ۔''

مقرب غلام آقا کے قریب گیا۔ بادشاہ نے تخمہ میں آیا خربوزہ اٹھایا اور ایک قاش کاٹ کر غلام کو کھانے کے لیے دی۔

غلام نے انتہائی رغبت اور چاہت کے ساتھ وہ قاش کھائی اور الحمدللہ کہا۔ غلام کی پسندیدگی دیکھ کر بادشاہ نے ایک اور قاش کاٹی اور غلام کو دی۔ اس نے اسے پہلے سے بھی زیادہ خوشی اور مسرت کے ساتھ کھایا اور رب کا شکر جبکہ بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح بادشاہ نے منظور نظر غلام کو خربوزے کی ایک ایک قاش کاٹ کر دی جسے وہ مزے لے لے کر کھاتا گیا۔

آخر کار خربوزے کی آخری قاش بچ گئی۔ بادشاہ نے یہ دیکھنے کے لیے کہ جس خربوزے کو غلام اتنی خوشی سے اور رشادمانی کے ساتھ کھا رہا ہے، کس قدر عمدہ اور لذیذ ہوگا، آخری قاش منہ میں ڈال لی۔ لیکن چکھتے ہی اگل دیا کیونکہ وہ نہایت تلخ، کڑوی اور بدمزہ تھی۔

بادشاہ نے مقرب غلام سے کہا ''مجھے از حد حیرانی ہے کہ تم اتنا کڑوا اور زہر کے مانند خربوزہ کھاتے رہے اور یہ نہ کہا کہ یہ کھانے کے قابل، تو کیا چکھنے کے قابل بھی نہیں۔''

گردش زمانہ کے ہاتھوں بنے غلام مشہور زمانہ شخصیت، لقمان نے دست بستہ عرض کی ''بادشاہ سلامت! آپ مجھے انتہائی محبت و شفقت کے ساتھ کھلا رہے تھے۔ مجھے شرم محسوس ہوئی کہ آپ کی خوشی کو بدمزگی میں بدل دوں۔ مزید یہ کہ میں نے آپ کے ہاتھوں ہزاروں انتہائی لذیذ اور خوش ذائقہ نعمتیں کھائی ہیں۔ اگر آج ایک تلخ چیز کھانے کو ملی، تو یہ مناسب نہیں سمجھا اس کے کھانے سے انکار کر دوں اور محض خربوزے کی کڑواہٹ کی وجہ سے آپ کے حکم کی بجا آوری کے بجائے حکم عدولی کروں۔''

آیئے اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ کیا ہم اپنے مالک حقیقی کی ہزاروں نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود کبھی کبھار ہلکی سی کڑواہٹ محسوس کریں، تو شکوہ و شکایت پر تو نہیں اتر آتے؟

www.pdfbooksfree.pk

تازہ افسانہ

کی شدید لہر نے زور و شور سے بلا گھماتے یاسر کو بے چین کر دیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی کمر اور ریڑھ کی ہڈی کی جانب بڑھا۔ جانے کیا ہوا تھا؟ وہ اپنی کراہوں پر بند باندھتے پیٹھ سہلانے لگا۔ مگر درد کی دوسری لہر نے گویا اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ بلا ہاتھ سے گر گیا۔ بے حد شدید درد وقفے وقفے سے اٹھ رہا تھا۔ جلد ہی اس کی شدت ناقابل برداشت ہوگئی۔

''اے یاسر! ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ خیریت، کیا ہوا.....؟ طبیعت تو ٹھیک ہے!'' امی جان جو گیٹ بند کرنے آ رہی تھیں، اسے کرسی پر بیٹھ کر ہائے ہائے کرتا دیکھ گھبرا گئیں۔

''امی میری کمر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' یاسر آنسو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''بیٹا یقیناً آپ نے آج اسکول سے کچھ الٹا سیدھا کھا لیا ہوگا۔'' امی نے جھٹ نتیجہ اخذ کر کے اپنا اندازہ لگایا۔

''امی! میں نے کہیں سے کچھ نہیں کھایا۔ آج دوپہر کا کھانا آپ سب کے ساتھ کھایا تھا۔ اور درد بھی پیٹ نہیں کمر میں ہو رہا ہے۔'' یاسر خفگی سے بولا۔

''یہ منحوس بلا اور گیند بھی بچوں کے لیے بُری ہے۔ اتنا بڑا بلا لے کر کھیلنے سے کمر میں جھٹکا آ گیا ہوگا۔'' امی نے فوراً دوسری تشخیص کی۔

''امی! یہ بلا میں نے ابھی اٹھایا ہے۔ بلکہ اس سے کھیلنا شروع بھی نہیں کیا۔ آپ یوں کریں مجھے کوئی دوا لا دیں۔'' وہ بولا۔

ملک و قوم کا درد رکھنے والے

بچے نے بزرگوں کو سبق سکھایا

کبھی کبھی بے شمار الفاظ پر عمل کا ایک لمحہ بھاری ہوتا ہے

صائمہ محبوب

www.pdfbooksfree.pk

''ہاں ہاں! دوا لا دوں۔ ارے کیا پتا کہ درد کہاں ہے، کیوں ہے؟ کیسے ہوا ہے..... اور دوا لا کر دے دوں۔''

وہ کچھ لمحے خاموش رہیں، پھر بولیں ''تم یوں کرو سیدھے کھڑے ہوتا کہ اندازہ ہو سکے، کہیں چک تو نہیں پڑ گئی۔'' امی نے پیار سے یاسر کو کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ اس کا درد سے برا حال ہو رہا تھا۔ بمشکل کھڑا ہوا۔ امی نے اسے جھکایا اور پھر سیدھا کر کے تسلی کی کہ کمر میں چک کا کوئی مسئلہ نہیں۔

یاسر کی کمر میں ہنوز شدید تکلیف تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ابو جان، دادا جان اور دادی جان بھی اکٹھے ہو گئے۔ اب چاروں طرف سے تشخیص بھی ہونے لگی اور ٹوٹکے بھی بتائے جانے لگے..... تمام افراد خانہ اس نکتے پر متفق تھے کہ یاسر کے اسکول کی کینٹین میں غیر معیاری چیزیں ملتی ہیں۔ یہ الگ بات تھی کہ گھر کے چاروں بزرگ ہر روز ایک دوسرے سے چھپ کر یاسر کو جیب خرچ دیا کرتے تھے۔

''امی، چھوڑیں کینٹین کو، کوئی درد کی دوا دیں۔''

یاسر خفیف آواز میں بولا مگر چاروں بزرگ اب تک اپنی بحث میں مصروف تھے۔ دادا جان سب کو غیر ذمے دارانہ رویوں پر لیکچر دے رہے تھے اور دادی انھیں دوبدو جواب دینے میں محو تھیں۔ ابو جان یاسر کے کھانے پینے کے طور طریقوں سے نالاں تھے، تو امی سب کے بے جا لاڈ پیار پہ! آخر یاسر گھر بھر کا اکلوتا اور لاڈلا بچہ جو تھا۔

دادا جان کو بالآخر یاسر کا خیال آ ہی گیا، بولے ''بیگم! اسے میری دواؤں میں سے درد کی گولی دے دو۔''

''ارے کمال کرتے ہیں آپ، بچے کو بزرگ کی دوا کیسے دی جا سکتی ہے؟'' دادی جو کالج میں پڑھاتی تھیں، فوراً بولیں۔

''اچھا وہ نہ سہی اپنی دے دو۔'' دادا جان اس وقت پوتے کی تکلیف دیکھتے ہوئے صلح کے موڈ میں تھے ورنہ اس بات پر عالمی جنگ شروع ہو چکی ہوتی۔

''ہاں ہاں، آپ تو بزرگ ہیں اور میں بچی کہ میری دوا بچہ کھا کر بھلا چنگا ہو جائے گا۔'' دادی خفا ہونے لگیں۔

دادا جان صحافی اور استاد تھے۔ دادی کی رائے تھی، ملازمت سے ریٹائرمنٹ پر انھوں نے معروف تجزیہ نگار اور صحافی کے لاحقے زبردستی نام کے ساتھ لگا لیے۔ ورنہ موصوف گھر کے حالات کا جائزہ لینے سے بھی قاصر تھے، ملکی حالات کا تجزیہ کیسے کرتے؟''

''دادی جان! بہت درد ہو رہا ہے۔'' یاسر اب پھوٹ پھوٹ کے رو دیا.....

''آپ سب اپنی باتیں چھوڑیں، یاسر کو اسپتال لے چلتے ہیں۔'' اب امی پریشان ہو گئیں۔

''بیگم! کوئی درد کی گولی تو دے دو، پھر چلتے ہیں۔ ابو جان پر بھی یاسر کے آنسو خاصا اثر کر رہے تھے۔ امی جلدی سے درد کا سیرپ لے آئیں۔ ابو کمر کی مالش کرنے بام لے آئے تو دادا جان درد ختم کرنے والا سپرے۔ دادی دعائیں پڑھ پڑھ کر یاسر پر پھونک رہی تھیں۔ یاسر تو سب کی جان تھا۔

اسے اندر کمرے میں مبل اور صوفا کر لٹا دیا گیا۔ گھر کے سبھی بزرگ اس کے گرد آن بیٹھے۔ یاسر کو ہلکی سی نیند آنے لگی مگر یہ غنودگی تھوڑی دیر کے لیے تھی۔

''امی!'' اس کی چیخ نے سب کو ہوشیار کر دیا۔ ''امی! درد ہو رہا ہے۔'' تھوڑی ہی دیر بعد اسے متلی اور قے آنی شروع ہو گئی۔

''ڈاکٹر کو گھر بلا لیتے ہیں۔'' دادا جان نے تجویز دی۔

''نہیں اسے اسپتال لے جانا زیادہ بہتر رہے گا۔'' دادی نے رائے دی۔ ابو فوراً گاڑی کی چابی لینے اندر چل دیے۔ یاسر کو امی جان سہارا دے کر باہر لے آئیں۔ ایک سرکاری اسپتال نزدیک ہی واقع تھا۔ گو وہاں صفائی کی

www.pdfbooksfree.pk

صورت حال خراب تھی مگر ڈاکٹر قابل اور مستند تھے۔

اسپتال میں خاصا ہجوم تھا۔ بے شمار مریض اور ان کے لواحقین بیٹھے تھے۔ یاسر کو ایک اسٹریچر پر ڈال کے اندر لے جایا گیا۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسوں نے یاسر کو دیکھا۔ فوری ٹیسٹ لیے اور پھر ایک ٹیکا لگا دیا۔ یاسر کو یوں لگا جیسے درد کی لہر میں رفتہ رفتہ کمی ہونے لگی ہے۔ اس پر سکون سا طاری ہونے لگا اور وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆

کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ فضا میں دواؤں اور ڈیٹول کی ملی جلی بُو رچی بسی تھی۔ سامنے بینچ پر چاروں بزرگ تیماردار بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے۔ موضوع گفتگو اسپتال کی گندگی و غلاظت تھی اور مریضوں کی حالت، ہجوم اور بدحواسی!

دادا جان، معروف تجزیہ کار سب کو اپنا مشاہدہ بتا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی کرتے جاتے کہ وہ اپنی ڈائری ساتھ لانا بھول گئے۔

ابا جان کے خیال میں اب مزید اس ملک میں رہنا اپنی نئی نسل سے دشمنی کرنا تھا۔ بچوں کی بہترین تربیت اور اچھے مستقبل کے لیے پاکستان جلد از جلد چھوڑنا ضروری ہو چکا۔ یاسر آنکھیں بند کیے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ کمرے کے ساتھ ملحق غسل خانے سے آتی بہتے پانی کی آواز اسے بے آرام کر رہی تھی۔

وہ چاروں خراب نلکوں اور پائپوں پر بھی تنقید کر رہے تھے۔ دادا جان مسلسل اپنے حکمرانوں کی بے حسی پر ماتم کناں تھے۔ دادی جان کے دکھی دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ کاش لوگوں کو صفائی کا احساس ہو جائے۔ وہ صفائی کی اس صورت حال کا ذمے دار ڈاکٹروں کو ٹھہرا رہی تھیں۔ امی کو شکوہ اسپتال کے جمعدار سے تھا۔

یاسر کے لیے جب پانی گرنے کی آواز ناقابل برداشت ہونے لگی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنے بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

''ارے بیٹا! کیسے ہو؟ درد تو نہیں ہو رہا۔'' انھوں نے یاسر کو کھڑا پایا، تو حیرت سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''امی!''

''جی بیٹا کیا بات ہے؟'' وہ فوراً یاسر کے پاس آ گئیں۔

''امی! پانی ضائع ہو رہا ہے۔ میں نلکا بند کر دوں۔'' یہ کہہ کر یاسر آہستہ آہستہ ملحق غسل خانے کی طرف چل دیا۔ چاروں بزرگ پھر اپنی علمی اور تجزیاتی گفتگو میں محو ہو گئے۔

نل بالکل ٹھیک تھا..... فوراً بند ہو گیا۔ درحقیقت قصور نہ تو بے حس حکمرانوں کا تھا، نہ بے خبر ڈاکٹر کا، نہ غیر ذمے دار جمعدار کا۔ قصور ان سب کا تھا جنھوں نے کچھ سنوارنے کی کوششیں ہی نہیں کیں۔

طوفاں ہے اگر گھر کے دریچے یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو
کھڑکی کے شکستہ شیشے پہ کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو

یاسر غسل خانے سے باہر آیا، تو بولا ''قیمتی پانی ضائع ہونے کا خیال مجھے تنگ کر رہا تھا۔ اسی لیے نلکا بند کرنے چلا گیا۔''

یہ سن کر چاروں بزرگ خاموش ہو گئے۔ دادا جان نے شرمندہ ہو کر دادی جان کی طرف دیکھا جو فخر سے اپنے پوتے کو دیکھ رہی تھیں۔ ''دیکھا میں نہ کہتی تھی صرف ٹی وی چینل پر بیٹھ کر تجزیہ اور تنقید کرنے کے بجائے کچھ عملی کام بھی کیا کریں۔'' وہ بولیں۔

''دادو! اب اس قوم کے بچے یہ عملی کام کیا کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔'' یاسر دادا جان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے خوشی سے بولا۔ آج اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بے شمار الفاظ پہ عمل کا ایک لمحہ ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

مجھے مشوروں سے بچاؤ!

ایک مریض کی دہائی

عبدالغفار نوابشاہی

۲۰۱۴ء کا آخری دن تھا۔ صبح سویرے نماز کی تیاری کے لیے مسواک کی نوک جب زبان سے ٹکرائی، تو معمولی جلن محسوس ہوئی۔ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد شیشے میں دیکھا تو زبان تلے ایک چھالا نظر آیا۔ معمول کے مطابق آٹھ بجے سے پہلے اسمبلی حاضر ہوا۔ نصف دن تک تدریسی خدمات انجام دیتا رہا۔ ہر لمحے سرخ چھالے نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا پڑا۔ انھوں نے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا۔

کہتے، میں خوراک کا صحت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا رات سے جو کچھ بھی پیٹ میں ڈالا تھا، ڈاکٹر صاحب کے سامنے اس کی صورت گری کر ڈالی اور خاموش ہو کر صحت بھرے نسخے کا انتظار کرنے لگا۔ سرخ چھالا دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے انداز سے یہ تاثر دیتے ہوئے کہ معمولی بات ہے، نسخہ لکھا۔ مگر رات کو ایک مرتبہ پھر چیک اپ کرانے کا حکم بھی صادر فرمایا۔

میں جامعہ کے احاطے میں واقع ہاسٹل میں اپنے کمرے واپس آیا۔ کچھ دیر بعد درد محسوس ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ اب تو بات کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ دوست احباب خیریت معلوم کرتے، تو انھیں اپنی زبان کی تکلیف سے آگاہ کرتا اور دعاؤں کی درخواست کر کے خاموش ہو جاتا۔ مگر قربان جاؤں کہ میرا ہر دوست مخلص نکلا اور دعا کے ساتھ ایک نسخہ بھی بتاتا۔ ساتھ ساتھ دوا لینے کا مشورہ بھی دیتا۔

یہ دیکھ کر مجھے دو سال پہلے کا ایک قصہ یاد آ گیا۔ میرے ایک دوست نے مجھے فون پر اپنی ناساز طبیعت سے آگاہ کیا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ بولے ”حکیم صاحب کے پاس جانا ہے، آپ بھی چلنا۔ مجھے ناگوار گزرا کہ کامل نہ سہی نیم حکیم تو میں بھی ہوں۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں.....! پھر، یہ شعر پڑھ کر خود تسلی دی۔

وہ جسے بے وفا تو وفا کرو، جو اثر نہ ہو تو دعا کرو
جسے چاہو بُرا کہو، یہ دوستی کے خلاف ہے

میں دوست کے ساتھ پسندیدہ حکیم کے پاس پہنچا۔ انتظار گاہ میں بیٹھتے ہی دوست ساتھ بیٹھے مریض سے

www.pdfbooksfree.pk

سرگوشی کرنے میں مصروف ہوگئے۔ میں دل ہی دل میں شکر کر رہا تھا کہ میں مریض نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی کو مرض میں مبتلا دیکھو، تو اپنے تندرست ہونے پر شکر کرو۔

کچھ دیر بعد میرے دوست حکیم صاحب سے مل کر باہر نکلے۔ ان کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر وجہ دریافت کی۔ دوست نے بتایا کہ حکیم کے پاس جانے سے پہلے جو صاحب سرگوشی کر رہے تھے، انھوں نے مجھے مرض سے نجات کے لیے کچھ غذائیں استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے کہا ''اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ آپ کو تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ لالچ کے دور میں آپ کو مفت مشورہ مل گیا۔''

کہنے لگے ''مگر بات یہ ہے کہ داخلی اور خارجی حکیم صاحبان کی باتوں میں بڑا تفاوت ہے۔ خارجی حکیم نے جو مشورہ دیا، وہ داخلی حکیم کے بالکل خلاف ہے۔ اب کیا کروں......؟

میں نے کہا ''کوئی بات نہیں۔ نیم حکیم خطرہ جان، نیم ملا خطرہ ایمان، کا استحضار کرو اور داخلی حکیم کی ہدایت مان لو۔''

یہ ہمارا بڑا المیہ ہے کہ آج قوم کا ہر فرد دینی مسئلہ ہو یا طبی، حل بتاتے اور دوا تجویز کرتے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ ایسے ہی میرے پاس بھی شام تک ڈھیر سارے نسخے جمع ہو گئے، مگر درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

خیر رات گزری۔ ۲۰۱۵ء کی پہلی صبح جماعت میں گیا، تو بے اختیار چلنے والی زبان نے بآسانی کچھ کہنے سے معذرت کر دی۔ اپنی ہر بات سفید تختے کی مدد سے طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ جماعتیں لینے کے بعد اپنی رہائش گاہ آیا، تو یکایک میرا خیال سرکار دو عالم کے فرمان کی طرف گیا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں'' جو خاموش رہا اس نے نجات پائی۔'' حضرت سلیمان علیہ السلام کا فرمان ہے ''اگر بات چیت کرنا چاندی ہے، تو خاموش رہنا سونا۔'' اگر خاموشی میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں غور و فکر کر لیا جائے، تو کیا کہنے۔

ذرا غور کیجیے، کہ آج ہمارا معاشرہ زبان کے غلط اور بے جا استعمال کی وجہ سے کس قدر بے چینی کا شکار ہے۔ زبان سے نکلنے والی کئی باتیں نہ صرف گناہ ہیں بلکہ معاشرے کے بگاڑ کا سبب بھی بنتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ، غیبت، بہتان، طعنہ زنی، چغل خوری اور احسان جتلانا۔ یہ وہ چند بدترین گناہ معاشرے کے لیے کسی مہلک بیماری سے کم نہیں۔ ان کی وجہ سے سیدھا سادہ اخوت و بھائی چارے والا معاشرہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔

ان گناہوں کا پہلا نشانہ اپنے ہی لوگ بنتے ہیں۔ مثلاً خدانخواستہ کوئی جھوٹ بولنے کا عادی ہے، تو وہ اسکول میں ہے، تو استاد سے جھوٹ بولے گا۔ گھر میں ہے تو والدین سے۔ تاجر ہے تو اپنے گاہک سے جھوٹ بولے گا۔ اسی طرح غیبت بھی اپنے ہی لوگوں کی جاتی ہے۔ یہ سب گناہ زبان ہی سے سرزد ہوتے ہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک شعر ہے ؎

جراحات	السنان	لھا التیام
ولا یلتام	ما جرح	اللسان

(تیر و تلوار کے زخم بھر جاتے ہیں مگر زبان کے زخم نہیں بھرتے)۔

(مضمون نگار جامعہ دارالعلوم کراچی میں استاد کے منصب بلند پر فائز ہیں)

www.pdfbooksfree.pk

ہم وطنوں کے لیے منفرد تحفہ

موبائل بیٹری تادیر چلائیے

بیٹریوں کی بجلی بچانے والے مفت ٹوٹکوں کا بیان

ابوصارم

یہ ۱۹۹۹ء کی بات ہے، جب جاپانی کمپنی، این ٹی ٹی ڈوکومو (NTT Docomo) نے دنیا کا پہلا باقاعدہ سمارٹ فون متعارف کرایا۔ اسمارٹ فون سے مراد ایسا موبائل فون ہے جس میں آپریٹنگ سسٹم موجود ہو مثلاً ونڈوز ۸ یا اینڈرائڈ۔ گویا یہ چھوٹے سے ایسے کمپیوٹر ہیں جو روزمرہ کے بے شمار کام انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔

اسمارٹ فون عام موبائل سے کچھ مہنگے ہیں لیکن ان کی قیمت بتدریج گھٹ رہی ہے۔ اسی باعث پاکستان میں بھی لوگ کثیر تعداد میں اسمارٹ فون خریدنے لگے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اب ایک کروڑ سے زائد پاکستانی اسمارٹ فون استعمال کر رہے ہیں۔ جبکہ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۴ کروڑ سے زائد پاکستانی موبائل فون رکھتے ہیں۔

موبائل کے برعکس اسمارٹ فون پروسیسر استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ بجلی بھی زیادہ کھاتے ہیں۔ اس باعث اسمارٹ فون کی بیٹری چارجنگ کے بعد جلد خرچ ہو جاتی ہے۔ تاہم بعض احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں، تو بیٹری کا دورانیہ بڑھ سکتا ہے۔ اہم تدابیر کا بیان درج ذیل ہے:

۱۔ اگر آپ نے اسمارٹ فون استعمال نہیں کرنا، تو اسے بند (Off) کر دیجیے۔ یوں بجلی کی اچھی خاصی بچت ہو جاتی ہے۔

۲۔ جس علاقے میں نیٹ ورک کمپنی کے سگنل نہیں آ رہے یا وہ کمزور ہیں، تو فون بند کر دیجیے۔ وجہ یہ کہ سگنلوں کی تلاش میں فون اپنی بیٹری کی ساری بجلی ضائع کر دیتا ہے۔ لہٰذا فون اسی جگہ چلائیے جہاں طاقتور سگنل آ رہے ہوں۔

۳۔ اسمارٹ موبائل فونوں میں لیتھیم (Lithium) کی بیٹریاں استعمال ہوتی ہیں۔ ایسی بیٹری کی اگر ساری چارجنگ استعمال کر لی جائے اور پھر اُسے چارج کیا جائے، تو وہ جلد خراب ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اپنے فون کی بیٹری کی چارجنگ ختم نہ ہونے دیجیے۔

www.pdfbooksfree.pk

بہتر ہے کہ جب بیٹری کی چارجنگ ۱۰ تا ۲۰ فیصد رہ جائے، تب اسے چارج کرلیں۔ زیادہ جلد اور بار بار چارج کرنے سے بیٹری زیادہ عرصہ نہیں چلتی۔

۴۔ فون میں لرزنے (Vibration) کا بٹن بند ہی رکھیے۔ وائبریشن آن کرنے سے فون بجلی زیادہ کھاتا ہے۔ مزید برآں گھنٹی کی آواز بھی اتنی رکھیں جتنی بآسانی سن سکیں۔

۵۔ کال کا دورانیہ مختصر رکھیے اور ضروری باتیں کیجیے۔ بعض مرد و زن بیٹری ختم ہونے تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں بیٹری جلد خراب ہوجاتی ہے۔

۶۔ فون کی ایسی خصوصیات بند کردیجیے جو بوقت ضرورت ہی استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں بلیوٹوتھ، وائی فائی، جی پی ایس وغیرہ شامل ہیں۔ اگر ان ایپلی کیشنوں کو چالو رکھا جائے، تو وہ مسلسل اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ یوں وہ متواتر بجلی استعمال کرتیں اور بیٹری جلد ختم کردیتی ہیں۔

۷۔ فون کی روشنی (Brightness) کم رکھیے۔ اسکرین زیادہ روشن رہے، تو وہ بھی وافر بجلی کھاتی ہے۔

۸۔ کوشش کیجیے کہ تھری جی استعمال نہ کریں۔ اسے استعمال کرنے سے فون ''دگنی'' بجلی کھاتا ہے۔ یا پھر ضرورت کے وقت ہی تھری جی کام میں لائیے۔

۹۔ اسمارٹ فون کے بیک گراؤنڈ یا پس منظر میں حرکت پذیر یا اینی میٹیڈ تصاویر یا ویڈیو استعمال نہ کیجیے۔ حرکت کرتی تصاویر بیٹری جلد خالی کرڈالتی ہیں۔

۱۰۔ بہتر یہ ہے کہ بیک گراؤنڈ خالی یا سیاہ رکھیے۔ یوں بیٹری زیادہ دیر زیر استعمال رہتی ہے۔

۱۱۔ یہ یاد رکھیے کہ نئی بیٹری مکمل طور پر چارج کر کے استعمال کیجیے۔ نقل کی بیٹری ۱۴ گھنٹے میں چارج ہوتی ہے۔ جبکہ لیتھیم بیٹری پانچ چھے گھنٹے لگاتی ہے۔ اس سے پہلے فون کہے کہ بیٹری فل ہوچکی، تو اس کی بات پر دھیان نہ دیں۔

۱۲۔ فون کو کبھی دھوپ میں یا گرم جگہ نہیں رکھیے۔ تپش میں بیٹری کی توانائی خارج ہونے لگتی۔ اسی لیے اسے معمول کے درجہ حرارت میں رکھیے۔ اگرچہ چارجنگ کے وقت بیٹری گرم ہوجائے، تو اس کا مطلب ہے کہ چارجر خراب ہوچکا۔ اسے جلد تبدیل کرلیجیے۔

۱۳۔ بیٹری اور فون کے دھاتی مقامات اتصال (Contacts) پر رفتہ رفتہ گرد و میل جم جاتی ہے۔ اس وجہ سے بیٹری اور فون کے درمیان بجلی کی منتقلی صحیح طرح نہیں ہوتی۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً روئی سے نرمی کے ساتھ یہ مقامات اتصال صاف کرتے رہیے۔

۱۴۔ بیٹری طویل عرصہ بعد چارج ہو یا جلد گرم ہو جائے، یا پھول جائے، تو اس کا مطلب ہے کہ وہ جواب دے چکی۔ لہٰذا اسے بدل دیجیے۔

۱۵۔ تقریباً سبھی اسمارٹ فونوں میں لوکیشن سروسز (Location Services) موجود ہوتی ہے۔ اس کو بھی بہ وقت ضرورت ہی استعمال کیجیے۔ ورنہ یہ مسلسل آن رہنے کی صورت میں بیٹری کھائے گا۔

۱۶۔ جدید اسمارٹ فون مختلف ایپلی کیشنوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ کئی ایپلی کیشنیں یا سافٹ ویئر پس منظر میں بھی کام جاری رکھتے ہیں۔ یوں وہ بیٹری ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ لہٰذا جن ایپلی کیشنوں کی ضرورت نہیں، انھیں چالو حالت میں نہ رکھیے۔ آپ بیٹری کی حیرت انگیز بچت پائیں گے۔

۱۸۔ اسمارٹ فون کی کمپنیاں نت نئے سافٹ ویئرز ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا انٹرنیٹ پر ان سے رابطہ رکھیے۔ عموماً نئے سافٹ ویئر ایسی خرابیاں دور کرتے ہیں جو بیٹری سمیت اسمارٹ فون میں پائی جاتی ہیں۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

آپ بیتی

ایک دکھی دل کی پکار

شاہ رخ خان! اس سے مل لو

گور کنارے بیٹھی ایک بدقسمت عورت کا الم ناک ماجرا

نیلم احمد بشیر

ان دنوں میں اپنی بیٹی عنبر کے پاس امریکی ریاست ورجینیا میں ٹھہری ہوں۔ یہ وہ خوبصورت ریاست ہے جہاں ایک زمانے میں کار کی نمبر پلیٹوں پر لکھا ہوتا تھا: ''ورجینیا از فار لورز۔'' (ورجینیا عاشقین کے لیے ہے) اب نمبر پلیٹوں پہ یہ لکھا دیکھنے کو نہیں ملتا۔ شاید اس لیے کہ امریکا کے حالات اتنے بدل چکے، ایسے رومانوی خیالات کا ذکر اب نمبر پلیٹوں پہ کرنا مناسب نہیں رہا۔ اب امریکیوں کو دہشت گردی، جنگلوں، ڈیزی کٹر بموں اور مسلم جنگ جوؤں جیسے عوامل سے نبرد آزما رہنا پڑتا ہے۔

ورجینیا امریکی دارالحکومت، واشنگٹن ڈی سی سے جڑی ریاست ہے، لہٰذا پُر جمال، پُر وقار، صاف ستھرے شہر کا سنجیدہ کلچر اس پہ بھی چھایا نظر آتا ہے۔ پُرشکوہ عمارات، کشادہ سرسبز و شاداب باغات، ٹریفک کے منظم بہاؤ والا واشنگٹن ڈی سی وہ خوبصورت شہر ہے جہاں سے حاکم دنیا کمتر ملکوں کے لیے بدصورت فیصلے صادر کرتے ہیں۔

میری بیٹی عنبر دارالحکومت کے قریب ہی واقع شہر کرسٹل سٹی کی ایک یونیورسٹی میں ملازمت کرتی ہے۔ اسے اکثر اپنی اچھی کارکردگی پہ شاباش اور توصیفی اسناد ملتی ہیں۔ پچھلے دنوں اس کی تنخواہ میں اچھا خاصا اضافہ ہوا، تو وہ بہت خوش ہوئی اور مجھے زبردست کھانا کھلایا۔ وہ ہمیشہ مجھ پر دل کھول کر پیسے خرچ کرتی ہے۔ شام کو ہم ماں بیٹی چہل قدمی کرنے واشنگٹن ڈی سی کے خوبصورت پارکوں میں نکل جاتی ہیں۔ میں اس اونچی شان والے خوبصورت شہر کی سج دھج اور جاہ و جلال دیکھ کر ہمیشہ سوچتی ہوں، ''کاش میرے ملک کے شہر بھی ایسے ہی دیدہ زیب ہوتے۔'' کاش ہم نے کشکول سازی کی صنعت کو فروغ

www.pdfbooksfree.pk

دینے کے بجائے سائنس و ٹیکنالوجی کی محبت کو اپنی منزل بنایا ہوتا۔ ہم پھر اپنا دیس چھوڑ بے وطن ہو کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ ہوتے۔

پچھلے کچھ دنوں سے شہر میں بھارتی فلمی اداکاروں کی ایک تفریحی تقریب کا بہت چرچا تھا۔ ٹی وی پہ اشتہار چل رہے تھے۔ انٹرنیٹ پر ٹکٹ بک ہوئے ہر طرف ''پروموشن پوسٹرز'' لگ گئے۔ مجھے یہ شو کافی پُرکشش دکھائی دیا۔ جی میں آیا، ہم بھی یہ مزے دار شو دیکھیں؟ عنبر نے مجھ سے کہا اور سو سو ڈالر کی دو ٹکٹیں خرید لیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پہ بہت خوش تھی۔ میں نے بہت سال پہلے امریکا میں اسی قسم کا ایتابھ بچن شو دیکھا تھا۔ تب وہ جوان تھا اور ہم بھی، لیکن اب عرصہ دراز سے اس قسم تفریح دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

میں نے بھی یہ سوچ کر خوش خوش ہامی بھر لی ''اچھا ہے، چلے چلتے ہیں، مزا آئے گا۔'' ہم واشنگٹن ڈی سی کے ایم سی آئی سنٹر میں ہونے والے اس شو کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے، بھارتی فلمیں ہم سب کی زندگی کا اہم حصہ بن چکیں۔ ہر گھر میں ذوق شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ بھارت، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش، یورپ، امریکا، جہاں جہاں بھی برصغیر کے لوگ آباد ہیں، یہ فلمیں تفریح کا بڑا ذریعہ ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ مغربی ممالک میں رہنے والے لوگوں کے بچوں کو اردو زبان، تہذیب اور رسم و رواج کی تعلیم دینے میں بھارتی فلموں کا ہاتھ ہے، تو غلط نہ ہوگا۔

آج بھارتی فلمیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنتی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں خوب چلتی ہیں۔ ہالی وڈ کا ہم پلہ بالی وڈ سینما بھی دنیا بھر میں اپنے مداح پیدا کر چکا۔ اسی لیے بھارتی اداکاروں کے شو بہت کامیاب رہتے ہیں۔ اس شو کے اہم فنکاروں میں سیف علی خان، پریتی زنٹا، رانی مکھر جی، پریانیکا چوپڑہ شامل تھے۔ مگر سب سے زیادہ جس کی خاطر لوگ شو دیکھنے جا رہے تھے، وہ تھا ''سپر اسٹار'' اداکار شاہ رخ خان!

سالہا سال سے مقبولیت کی سیڑھی پہ چڑھا شاہ رخ آج بھی اپنے مداحوں کے لیے نمبر ون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اداکاری، شخصیت اور فن نے سبھی کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہم ماں بیٹی اور قریبی شہر بالٹی مور میں رہنے والی میری بھابی فرح تینوں شو دیکھنے گھر سے نکل پڑے۔ عنبر کا خیال تھا کہ پارکنگ کے مسئلے کی وجہ سے ہم مقامی ریل سے سفر کریں، تو بہتر ہے۔ یہی سوچ کر ہم اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ نیویارک کی نسبت واشنگٹن ڈی سی کی میٹرو ٹرین اور اسٹیشن بہت صاف ستھرے اور خوبصورت لگے۔ اسٹیشن کی گول چھت اور کنکریٹ سے بنے ڈیزائن سراہتے ہم کچھ ہی دیر میں ریل میں سوار ہوئے۔ اس نے ہمیں ایم سی آئی سنٹر کے بالکل قریب اتار دیا۔

چند منٹ چلنے کے بعد ہم لوگ اس بڑے سنٹر تک پہنچ گئے جہاں اکثر نامور امریکی گلوکاروں کے کنسرٹس ہوتے ہیں۔ سڑک پہ ہم جیسے لوگوں کا ہجوم جنھیں امریکا میں ''دیسی'' کہا جاتا ہے، شو دیکھنے آیا ہوا تھا۔ اچھے اچھے

کاش ہم نے کشکول سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے بجائے سائنس و ٹیکنالوجی کی محبت کو اپنی منزل بنایا ہوتا۔ ہم پھر اپنا دیس چھوڑ بے وطن ہو کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ ہوتے۔

www.pdfbooksfree.pk

کپڑے پہنے بوڑھے، بچے، فیشن ایبل لڑکے اور لڑکیاں! سبھی کے چہرے ملنے والی تفریح کے خیال سے دمک رہے تھے۔ کوئی کسی کو ہیلو ہائے کہہ کر گلے ملتا، تو کوئی موبائل فون پہ آنے والے دوست کو راستہ سمجھا رہا تھا۔ امریکا میں کہیں بھی آنا جانا ہو، ہدایات کے بغیر کوئی منزل پہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہر طرف رنگ برنگ شلوار قمیص، ساڑھیاں، پتلونیں، کڑھائی والے کُرتے اور پاجامے پہنے شائقین کھڑے نظر آرہے تھے۔ گویا خاموش امریکی سنڈے جاندار دیسی اتوار میں تبدیل ہوگیا۔

ہم عمارت کے اندر جانے کا سوچ ہی رہی تھیں کہ یک دم ہماری نظر دو پاکستانی خواتین پر پڑی۔ وہ ہماری طرف آرہی تھیں۔ ایک نے دوسری کو سہارا دے رکھا تھا جو لڑکھڑا اور رک رک کر چل رہی تھی۔ جیسے ہی وہ ہمارے قریب آئیں، فرح لپک کر ان کی طرف بڑھی۔ سلام کرنے کے بعد کہنے لگی ''باجی! یہ سہانہ اور اس کی بھابی ہیں۔'' مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ بالٹی مور والی؟ اور یہاں؟ وہ اس حالت میں کیسے بستر سے اٹھ کر آ گئی؟ میں حیرت زدہ تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ بھی بالٹی مور کی رہائشی تھی۔ فرح دکھ سے بتایا کرتی کہ وہ سرطان کے آخری مرحلے پر پہنچ چکی۔ ڈاکٹروں نے مرض کی تشخیص کے بعد اس کے کئی اندرونی اعضا کاٹ ڈالے، مگر سرطان اسے چھوڑنے کو تیار نہیں، سارے جسم میں پھیل چکا۔ اس کا علاج اعلیٰ ترین اسپتالوں میں ہو رہا تھا۔ مگر ڈاکٹر بے بس ہو چکے۔ انھوں نے اسے لاعلاج قرار دے کر گھر بھیج دیا۔

ایک مرحلے پہ انھوں نے اس کا کیس بہ غرض تحقیق کسی بڑے اسپتال کو بھیجنا چاہا، مگر سہانہ اور اس کا شوہر رضامند نہ ہوئے۔ وہ گھر جانا چاہتی تھی کیونکہ دو چھوٹے چھوٹے بچے اس کی راہ تک رہے تھے۔ اس کی حالت بتدریج خراب ہو رہی تھی۔ کیموتھراپی سے سر کے تمام بال جھڑ چکے تھے مگر سہانہ ناامید نہ تھی۔ ہر وقت اس کے منہ پہ یہی جملہ ہوتا ''شاید اللہ تعالیٰ کوئی معجزہ کر دیں، شاید انھیں چار بچوں کی ماں پہ رحم آجائے۔''

وہ حوصلہ ہارنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی، ہر وقت زندہ رہنے کی باتیں کیا کرتی۔ فرح نے بتایا تھا، سہانہ زندگی سے بھرپور، شوقین مزاج، ہنسی مذاق کرنے والی ہنگاموں کی دلدادہ تھی۔ اسے اچانک اپنے خوفناک مرض کے بارے میں پتا چلا۔ اب زندگی کے دیے کی لو مدھم ہو چکی تھی۔ عمر کی نقدی ختم ہو رہی تھی مگر حسرتیں تھیں کہ ان کا انبار لگا تھا۔ وہ مشکل سے سانس لیتی۔ پھر بھی گھر میں بچوں کے لیے کھانا بناتی، لڑکھڑاتی ٹانگوں سے ان کے چھوٹے موٹے کام کرتی اور کہتی ''جتنے دن اپنے بچوں کے کام آجاؤں اتنا ہی اچھا ہے۔''

بگڑتی حالت کے باعث وہ والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے پاکستان جانا چاہتی تھی لیکن گرین کارڈ کے مسئلے نے راستہ روک لیا۔ اور وہ واپس امریکا آنا چاہتی تھی تاکہ زندگی کی باقی ماندہ پونجی اپنے بچوں اور شوہر پہ نچھاور کر دے۔

دوسری طرف اس کے ماں باپ پاکستان میں بے چین تھے، وہ ہر قیمت پہ اس سے ملنا چاہتے تھے۔ مگر سر پٹخ رہے تھے کہ امریکن قونصلیٹ سے انھیں ویزا جاری نہیں ہو سکا۔ اب امریکیوں کو مسلمانوں پہ اعتبار نہیں رہا۔ ان کی بھرپور کوشش ہے کہ مسلمانوں کے قدم امریکا کی سرزمین سے دور ہی رہیں، تو بہتر ہے۔

امریکا ایک آکٹوپس کے مانند ہے۔ وہ ہر ایک کو

www.pdfbooksfree.pk

اپنے خوبصورت، پُرکشش نظام اور معاشی آسودگی میں جکڑ لیتا ہے۔ انسان اس کی گرفت میں پھنس کر پھر کبھی آزاد نہیں ہو پاتا۔

سب دوست احباب سہانہ سے ہنسی خوشی فون پہ بات کرتے، اس کی خیریت پوچھتے۔ وہ اس دن سے ڈرتے جب سہانہ کی جگہ اس کا میاں فون اٹھائے اور کہہ دے کہ اب وہ یہاں نہیں رہتی۔

موت وحشی چڑیل کی طرح موت کے بھڑکتے الاؤ کے گرد قہقہے لگاتی ناچتی پھر رہی تھی اور زندگی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ سہانہ شاید اپنی زندگی کا آخری تماشا دیکھنے آئی تھی کہ ایک پردہ اٹھنے اور دوسرا گرنے والا تھا۔

''تم یہاں کیسے! تمھاری طبیعت کیسی ہے؟'' فرح نے پیار سے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔

''طبیعت نے تو ٹھیک ہونا نہیں، میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی کچھ پُرلطف وقت گزار لوں!'' اپنے گنجے سر پہ دوپٹہ ٹکانے کی کوشش کرتے سہانہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں نے بھی کہا، اگر تمھارا جی چاہ رہا ہے، تو دیکھنے چلتے ہیں، ذرا طبیعت ہی بہل جائے گی۔'' سہانہ کی بھابی بولی۔ اس نے پیار سے سہانہ کے چہرے پہ گرنے والا دوپٹہ ہٹایا اور ہم دھیرے دھیرے ہال کے اندر پہنچ گئے۔

''کیا تم دیر تک آرام سے بیٹھ لو گی؟'' فرح نے اپنی دوست سے پوچھا۔

''جب تک بیٹھ سکی، بیٹھوں گی، ورنہ اٹھ کر چل دوں گی۔ چلے تو جانا ہی ہے۔'' سہانہ کے چہرے پہ تیکھی مسکراہٹ کھیلنے لگی اور میرے کلیجے میں ٹیس سی اٹھی۔

ہماری نشستیں قریب ہی تھیں، اس لیے ہم ایک دوسرے کو بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ شو اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ روشنی اور آواز کے رنگ برنگ تماشے دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں مشتاق اور دل بے تاب تھا۔ میں بھی خوش تھی کہ عمر رسیدہ ہو جانے پر بھی موقع کی مناسبت سے بچوں کے ساتھ بچی ہو جاتی ہوں اور بڑوں کے ساتھ بڑی۔ شامل ہو جانے ہی میں عافیت ہے ورنہ وقت کی طرح بچے بھی مجھے پیچھے چھوڑ جائیں اور میں اکیلی کھڑی رہ جاؤں۔

شو شروع ہوا۔ پردہ اٹھا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ پہلے اسکرین پہ شو کے لیے تیاری کی ویڈیو دکھائی گئی جس سے لوگ ''وارم اپ'' ہو گئے اور خوب تالیاں بجیں۔ انسانی جذبات کے حوالے شو کا موضوع تھا۔ لہٰذا جتنے فنکار اسٹیج پر آتے گئے، ان کے آنے سے پہلے ایک جذبہ کا نام اسکرین پر ابھرتا اور پھر غائب ہوتا رہا۔

سب سے پہلا فنکار ارجن رام پال آیا جس کے لیے جذبہ رشک (Envy) تجویز ہوا۔ اُسے دیکھا، تو واقعی یقین آ گیا کہ اس کے لیے یہی نام موزوں تھا۔ سبز روشنیوں میں نہائے ہوئے لانبے قد، کسرتی جسم والے نوجوان اداکار کا حسن کسی یونانی دیوتا سے کم نہ تھا۔ حاضرین کی پرزور ستائش نے اس بات کی کھل کر گواہی دی۔ ارجن نے چند مقبول فلمی گانوں پر رقص پیش کیا اور تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے غائب ہو گیا۔

پردے پر لکھے ہوئے اگلے جذبے کا نام جوش (Passion) تھا۔ جیسے ہی یہ ایکٹ شروع ہوا، سارا منظر گلابی ہو گیا اور مدھر دھنیں فضا میں تیرنے لگیں۔ حاضرین سمجھ گئے کہ پریتی زنٹا آ رہی ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس بھولی صورت والی اداکارہ کا دل کھول کر استقبال کیا۔ پریتی نے خوبصورت جھلملاتے کپڑوں میں اپنے مشہور

www.pdfbooksfree.pk

گانوں پر ناچ پیش کر لوگوں کو دیوانہ بنا دیا۔

میں نے کن انکھیوں سے سہانہ کی طرف دیکھا جو عنقریب جیتے جاگتے انسان سے ایک شبیہہ میں تبدیل تو ہونے والی تھی مگر کائنات کے نظام میں اہمیت رکھتی تھی۔ وہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان دروازہ نیم وا کیے بیٹھی مشتاق الکھیوں سے جاری تماشے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ باغ حیات کی خوشبودار مہکتی روشنیوں سے اپنے لیے نشاط کی چند کلیاں چن کر دامن میں بھر لینا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وقت کے دریا میں بہتا پانی کبھی کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتا۔

پھر پستہ قد والی سانولی سلونی اداکارہ رانی مگھرجی اسٹیج پر آئی۔ کمال فن اور چمکتے ملبوسات کا چمتکار دکھا کر حاضرین کو دیوانہ کر دیا۔ لوگ اس کے رقص پہ جھوم اٹھے اور خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ سب فنکاروں کی رخصتی کے بعد ہال پر چند لمحوں کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا۔ سہانہ کی بھابی نے نند کی طرف دیکھ کر پیار سے پوچھا ''چلیں، تم تھک گئی ہوگی؟''

''نہیں، جتنی دیر بیٹھ سکی بیٹھوں گی۔'' سہانہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی اور اسٹیج پر نگاہیں گاڑ دیں۔ ایک بچہ زندگی کے میلے میں آخری بار گھوم لینے کے خیال سے خوش تھا۔ اندھیرے ہال میں دھیمی دھیمی روشنی پھیل جانے کے بعد پردہ اٹھتا نظر آیا۔ پردے پہ جیسے ہی لفظ محبت (Love) لکھا نظر آیا، حاضرین کی آوازیں چیخوں میں تبدیل ہو گئیں کیونکہ انھیں پتا چل گیا کہ اب ''ون اینڈ اونلی'' شاہ رخ خان آ رہا ہے۔ وہ دیر سے اسی کے منتظر تھے۔

سہانہ کسمسا کر پہلو بدلنے لگی۔ شاہ رخ کو اسٹیج پر اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ اسکرین پر خوبصورت دکھنے والا مقناطیسی کشش کا حامل یہ ''اسٹار'' درمیانی شکل صورت اور قدبت کا مالک تھا۔ مقبولیت میں یقیناً اس کی جاندار اداکاری اور ہر دلعزیز شخصیت کا بھی ہاتھ ہے کیونکہ شاہ رخ جیسی محبت کم ہی فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے۔

وہ اپنے فلم بین مداحوں کو ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں سب کچھ خوبصورت اور حسین ہوتا ہے۔ الجھنیں، تلخیاں اور حقیقتوں کی تلخیاں دھواں ہو جاتی ہیں۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنے محبوب اداکار کا سواگت کیا، تو اسی لمحے چھت سے ٹپکتے دل کی شکل والے سرخ غباروں سے منظر مزید رومانوی ہو گیا۔ لڑکے لڑکیاں جوش کے مارے چیخیں مارنے لگے، تو شاہ رخ نے مائیک پکڑ لیا اور اپنے مداحوں سے بے تکلف انداز میں باتیں کرنے لگا۔

> امریکا ایک آکٹوپس کے مانند ہے۔ وہ ہر ایک کو اپنے خوبصورت، پرکشش نظام اور معاشی آسودگی میں جکڑ لیتا ہے۔ انسان اس کی گرفت میں پھنس کر پھر کبھی آزاد نہیں ہو پاتا۔

باتوں باتوں میں جب کسی بات پہ بے ساختہ انداز میں ماشاء اللہ کہا، تو بہت اچھا لگا۔ وہ حاضرین سے باری باری پوچھتا چلا گیا: ''ممبئی سے کوئی ہے، یہاں پنجابی کتنے ہیں اور پھر آخر میں کہا، کیا میرے پاکستانی فرینڈز آئے ہوئے ہیں؟'' سب پاکستانیوں نے زور شور سے تالیاں پیٹیں جن میں، میں بھی شامل تھی۔ اس وقت شاہ رخ مجھے اپنا اپنا سا لگا۔ سنا ہے، وہ پاکستانیوں سے پیار کرتا ہے اور کرنا بھی چاہیے کیونکہ پاکستانی بھی تو بڑے ذوق شوق سے اس کی فلمیں دیکھتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

شاہ رخ خان نے حاضرین میں سے ایک لمبے تڑنگے سردار جی کو اسٹیج پر بلایا۔ انھوں نے وفورِ جذبات میں شاہ رخ کو گود میں اٹھا لیا اور پیار سے اس کے ماتھے پہ آئے بالوں سے کھیلنے لگے۔ سارا ہال ہنس ہنس کر داد دینے لگا۔ لگتا تھا، اس لمحے ساری دنیا نفرت اور دکھ نام کے کسی جذبے سے آشنا نہیں۔ سہانہ بھی ہنس رہی تھی۔ اسے تب کہاں یاد تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں یہ تماشا ختم ہو جائے گا۔ روشنیاں گل ہوں گی اور سب اپنے اپنے گھر لوٹ جائیں گے۔ پس منظر، پیش منظر میں تبدیل ہوگا اور نظامِ کائنات چلتا رہے گا۔

کیا شاہ رخ خان کو دیکھنا سہانہ کی آخری خواہش تھی؟

یہ سوچ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ شاہ رخ خان نے پھر مختلف لوگوں کو اسٹیج پر بلایا، ان سے باتیں کیں اور ڈانس کیا۔ تب میرا شدت سے جی چاہا کہ کسی طرح شاہ رخ خان کو ایک پرچی بھجواؤں جس پہ لکھا ہو ''تمھاری ایک پرستار بسترِ مرگ سے اٹھ کر آج تمھیں دیکھنے اور تمھارے فن کی پذیرائی کرنے یہاں آئی ہے۔ یہاں آ کر اس سے ذرا مل لو۔ اس کے ساتھ بات کر لو۔ اسے کوئی جھوٹی تسلی ہی دے دو۔ شاید یوں اس کی زندگی کے گنے چنے حسین لمحوں میں ایک یادگار لمحے کا اضافہ ہو جائے۔''

وقت کی پونجی سے جیب خالی ہو رہی ہو، تو ایک لمحہ بھی ایک صدی کے برابر ہے۔ مگر میں اپنی پاگل خواہش دل میں دبائے بیٹھی رہی۔ اسٹیج پر کھڑے زندگی سے بھرپور کشش شخصیت والے شاہ رخ خان تک یہ پیغام پہنچانا شاید ناممکن تھا۔ لوگوں کی چیخیں، دیوانگی، تالیاں، سیکیورٹی کے لیے لگائے گئے بڑے بڑے آہنی بیریئر اور ہال کا نظم و نسق سنبھالنے والے سیکورٹی گارڈ..... ان سب کے ہوتے ایک ننھی پرچی پہ لکھا پیغام اتنے بڑے فنکار تک کیسے پہنچتا؟

کچھ ہی دیر میں منتظمین نے شاہ رخ خان کو پہیوں والے بلند اسٹینڈ پر کھڑا کر حاضرین کے بالکل قریب سے گزرنے کا موقع دیا۔ لوگوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار کیا۔ سہانہ بھی کمزور ہاتھوں سے تالی بجاتی مسکرا رہی تھی۔ شاہ رخ لوگوں کے قریب آتا، ہاتھ ہلاتا، پیار برساتا آہستہ آہستہ واپس چلا گیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ بجھتے ہوئے چراغوں میں کتنی چمکدار جوت جگا گیا ہے۔ اسے تو بس یہ پتا تھا کہ اپنے چاہنے والوں کو خوش کرنا، ان کا دل لبھانا ہے۔ اس لیے وہ دوبارہ اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اور اپنے سب ساتھی فنکاروں کے ساتھ مل کر رقص کیا اور ڈائیلاگ بولے۔

پاکستان ساختہ روبوٹ

پشاور انسٹی ٹیوٹ آف فزکس اینڈ الیکٹرونکس کے طالب علم سلیمان نے اپنی نوعیت کا پہلا بم ڈسپوزل روبوٹ تیار کر لیا ہے، جو پندرہ میٹر کے فاصلے سے ۲۷ کلوگرام سے بارودی مواد کی پہچان سمیت اسے ناکارہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سلیمان کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ روبوٹ اپنے ایم ایس سی کے فائنل پروجیکٹ کے لیے تیار کیا ہے۔ روبوٹ بنانے کا آئیڈیا ہولی وڈ کی فلم ''دی ہرٹ ہیکر'' دیکھ کر آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پروٹوٹائپ روبوٹ ہے جو ٹینک کی طرح چلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ روبوٹ آفت زدہ علاقوں اور دشوار گزار سرنگوں میں بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ روبوٹ ایک لاکھ روپے سے کم لاگت میں تیار ہوا ہے اور حکومتی اداروں اور انڈسٹریز کا تعاون حاصل ہو، تو وہ اپنی ایجاد کو مزید بہتر بنا کر دنیا بھر میں متعارف کرائیں گے جس سے دنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن ہوگا۔

(عشال فاطمہ، گگومنڈی ضلع بہاڑی)

www.pdfbooksfree.pk

اس کے مزیدار چٹکلوں اور شوخ گفتگو سے ہال میں خوشی کی سطح انتہا کو چھونے لگی۔ میرا جی چاہا، گلا پھاڑ کر چیخوں اور کہوں ''شاہ رخ اس لڑکی کو مل لو..... وہ جا رہی ہے، تمھیں وہ پھر کبھی نظر نہ آئے گی..... کل پتا نہیں وہ ہو نہ ہو۔'' مگر ہیجانی شور میں میری آواز کیسے سنائی دیتی، اس لیے خاموش رہی۔ اسٹیج پہ تھرکتی زندگی حاضرین کی رگوں میں بہتے خون کی قوت بڑھا رہی تھی۔ مگر موت بھی ایک نشست پہ بیٹھی کسی کے ختم ہونے والے سانسوں کی ریزگاری گن رہی تھی ''ارے کوئی ہے جو شاہ رخ کو جا کے بتائے؟'' میرے دل نے پھر چیخ ماری۔

تین گھنٹوں بعد شو اختتام پذیر ہوا۔ سب ہال سے باہر نکلنے لگے۔ سہانہ کی بھابی نے اسے تھام رکھا تھا کہ کہیں ہجوم میں ٹھوکر نہ لگ جائے۔

''برا حال ہے، چلا بھی نہیں جا رہا۔ لیکن کم از کم میں نے شو تو دیکھ لیا نا، بہت مزا آیا.....'' سہانہ بولی۔ اس کی مردہ آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''کئی بار پوچھا، چلنا ہے؟ مگر توبہ کریں جی، یہ شاہ رخ خان کو چھوڑ کر کہاں جانے والی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے سہانہ کی بھابی نے پیار سے اس کا بازو تھپتھپایا۔ میری نم آنکھیں بھابی کی نم آنکھوں سے ٹکرائیں اور پھر یوں نیچے جھک گئیں جیسے ہم اپنے زندہ ہونے پہ شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔ آخر زندگی پر صرف ہمارا ہی حق کیوں تھا؟

سہانہ شاہ رخ سے نہیں مل سکی..... اور زندگی سہانہ کو؟ لیکن تعلق رکھنے کے لیے کسی کا دوسرے سے ملنا ضروری ہے؟ ایک ہی کہکشاں کے سیارے اپنے اپنے مدار میں تیرتے اور ایک دوسرے سے فاصلے رکھتے ہیں، مگر ان کا تعلق تو پھر بھی رہتا ہے۔ ہم سب بھی کائنات کی گھمن گھیری کے ناچتے بگولوں میں اڑتے تنکے ہیں۔ آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کے بائیسکوپ میں جڑے شیشوں میں قید۔ یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے جہاں پردہ گرتا پھر اٹھتا ہے۔ کردار آتے اور پھر غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ شو تو چلتے رہنا ہے۔

جنم اور مرن کھلے سمندر میں تیرنے والی دو کشتیوں کا نام ہے۔ ہم خوشی مناتے ہیں جب جنم کشتی اپنے سفر کا آغاز کرے..... اس سے بے نیاز کہ راستے میں اسے کئی طوفانوں، جھکڑوں اور ہچکولوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہم سوگ مناتے ہیں جب یہ کشتی کنارے لگے حالانکہ ہمیں اس وقت خوش ہونا چاہیے کہ کٹھن سفر ختم ہوا۔ مسافر نے منزل کو جا لیا اور اب اس کے نصیب میں آرام ہی آرام ہے۔

> **وقت کی پونجی سے جیب خالی ہو رہی ہو، تو ایک لمحہ بھی ایک صدی کے برابر ہے۔ مگر میں اپنی پاگل خواہش دل میں دبائے بیٹھی رہی۔**

میں سہانہ کے لیے سوگوار نہیں، وہ پنہاں ہوئی، تو کل یقیناً کسی لالہ و گل میں نمایاں ہوگی۔ باغ حیات میں چلتی بادِ صبا مہکتی سرسراتی جب کسی غنچہ نو کے رخسار پہ بوسہ دے، تو شاید وہ بھی اسی طرح پیار سے مغلوب ہو کر خوشی سے تالیاں بجائے گا جیسے اس روز سہانہ واشنگٹن ڈی سی کے ایم سی آئی ہال میں بجا رہی تھی۔ پھر بھی نجانے کیوں میری آنکھوں کے کونے میں ایک آنسو آئے، تو اٹک سا جاتا ہے۔ دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ اگر کسی دن شاہ رخ خان کو لالہ کے اس پھول کے متعلق پتا چلا، تو اسے کیسا لگے گا؟..... کیا سوچے گا وہ اس بے انت کہانی کے بارے میں؟

www.pdfbooksfree.pk

دوسرا حصہ

جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ایکسپورٹر بننے کا خواب حقیقت میں بدلیے

ایک عام پاکستانی کو بھی کامیاب ایکسپورٹر بنا دینے والے قیمتی مشورے

طیب طارق

میں دفتر سے گھر جا رہا تھا کہ رستے ہی میں مجھے علی کا فون آ گیا۔ کہنے لگا ''طیب بھائی، پیشگی معذرت کہ میں آپ کے گھر مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ دراصل پچھلی نشست اتنی دلچسپ رہی تھی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں پہلے ہی چلا آیا۔''

میں نے کہا: ''یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ تم اس موضوع میں دلچسپی لے رہے ہو۔ جیسا کہ فیصلہ ہوا تھا، آج ہماری نشست ایکسپورٹ یا برآمدات کے موضوع پر ہے۔ میں نے تمھارے لیے کم لاگت والے کچھ منصوبے سوچ رکھے ہیں جن پر عمل کر کے تم باآسانی کامیاب ایکسپورٹر بن کے اپنی قسمت کا رُخ بدل سکتے ہو۔ پھر تم جس لڑکی کو پسند کرتے ہو، اس کے گھر والے بھی تمھارے گرویدہ ہو جائیں گے۔''

گھر پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے اور علی کو لیے قریبی ریستوران پہنچ گیا۔ نشستوں پر بیٹھتے ہی ہماری

www.pdfbooksfree.pk

گفتگو ہونے لگی جو کھانا آنے کے بعد بھی جاری رہی۔ علی کہنے لگا ”طیب بھائی سب سے پہلے تو مجھے یہ بتائیے کہ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرنے سے پہلے فزیبلٹی رپورٹ کیسے بنائی جائے؟ اس میں تو ہمارا مقابلہ بین الاقوامی کمپنیوں سے ہوتا ہے اور مقامی مارکیٹ کے برعکس ہمارے حریف مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں ہم مختلف ممالک کی کمپنیوں کی مصنوعات کے معیار اور قیمتوں کا کیسے پتا کریں؟ میں تو پاکستان بیٹھا ہوں، مجھے علم نہیں کہ دوسرے ممالک کی ایکسپورٹ کمپنیوں کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ ان سے مقابلے کے لیے کیا حکمت عملی اپنائی جاتا ہے؟ غیرملکی کمپنیاں ہمیں آرڈر کیسے اور کیوں کر دیں گی؟ مجھے یہ بھی بتائیے کہ پاکستان سے کیا کیا چیزیں ایکسپورٹ کی جا سکتی ہیں؟“

میں نے علی کو تفصیل سے بتانا شروع کیا، ”پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار قدرتی وسائل سے نوازا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم کیسے اپنی زرخیز مٹی کو سونے میں تبدیل کریں۔ پاکستان سے کئی اشیا برآمد کرنا ممکن ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ بکرے اور گائے کی جن انتڑیوں کو ہم ذبح کرنے کے بعد کوڑے میں پھینک دیتے ہیں، وہ بھی بین الاقوامی مارکیٹ میں فروخت ہوتی ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۱۲ء میں پاکستان سے ۵ ارب روپے مالیت کی انتڑیاں برآمد ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ پاکستان سے مرغی کے پنجے بھی ایکسپورٹ ہو رہے ہیں۔

”جو پاکستانی بہن بھائی کم سرمایہ رکھتے ہیں، وہ اس طرح کی چھوٹی اشیا برآمد کر کے اپنا کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ جن دنوں دبئی بن رہا تھا، ان دنوں وہاں درخت اگانے کے لئے مٹی کی ضرورت تھی۔ کراچی کے ایک کاروباری نے وہاں مٹی ایکسپورٹ کرنا شروع کی اور راتوں رات کروڑ پتی بن گیا۔“

علی نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا: ”بھئی حد ہے، پاکستان سے اچھوتی چیزیں ایکسپورٹ ہو رہی ہیں اور کاروبار کے بہترین مواقع موجود ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا: ”پاکستان سے ایسی عجیب اشیا ایکسپورٹ ہو رہی ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور لوگ ان کے ذریعے خوب کما رہے ہیں۔ میرا ایک دوست بیرون ممالک جانے والے گوشت کی پڑتال کرنے والے ادارے میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا، ایک شخص اس کے پاس گدھے کی کھالیں ایکسپورٹ کرنے کے لیے سرٹیفکیٹ لینے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بیرون ملک جس پارٹی کو میں گدھے کی کھالیں بھجواتا ہوں، وہ مجھے نقد ادائیگی کرتی ہے۔ اس کھال سے کسی دوائی کا خام مال بنتا ہے اور یہ تھائی لینڈ ایکسپورٹ ہوتی ہیں۔

”مقامی ہنرمندوں کی تیار کردہ دست کاری والی مصنوعات (ہینڈی کرافٹس) پاکستان سے ایکسپورٹ کر کے بے پناہ زرمبادلہ کمایا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں بھارت اور چین اس وقت ہینڈی کرافٹس کی برآمدات کے سرخیل ہیں۔ بھارت انھیں فروخت کر کے ۲۳۵ ارب روپے سالانہ کماتا ہے۔ بھارت اور ہماری ثقافت ملتی جلتی ہے۔ جب بھارت اپنی ہینڈی کرافٹس کی اشیا فروخت کر کے اربوں روپے کما سکتا ہے تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

”ضروری نہیں کہ صرف قدرتی اشیا برآمد کی جائیں۔ ویلیوایڈڈ یعنی خام مال سے تیار کردہ اشیا بھی برآمد کرنا ممکن ہے۔ ان اشیا میں ایسی بھی شامل ہیں جن کے کاروبار میں محض ۵ فیصد زیادہ سرمایہ کاری کرنے سے دگنا یعنی ۱۰ فیصد زیادہ منافع کما سکتے ہیں۔ اس قسم کی اشیا میں اچار،

www.pdfbooksfree.pk

ایکسپورٹ کے فوائد

برآمدات کا کاروبار ذاتی لحاظ سے مفید ہے اور قومی اعتبار سے بھی! اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ کی آمدن ڈالر یا یورو میں ہوتی ہے۔ جب وہ پاکستانی کرنسی میں تبدیل ہو، تو کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ مزید براں کاروبار بڑھانے کے لیے آپ کو دنیا بھر کی مارکیٹیں مل جاتی ہیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ کرنسی کی قدر کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا جب قدر گرے، تو ایکسپورٹر کا منافع بڑھ جاتا ہے۔ قومی لحاظ سے برآمدات کا فائدہ یہ ہے کہ جب ایکسپورٹ بڑھے، تو قومی خزانہ میں زرمبادلہ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یوں معیشت مضبوط ہوتی ہے اور ادائیگیوں کا توازن بہتر ہو جاتا ہے۔

چٹنیاں، جام، مربے، پنیر وغیرہ شامل ہیں۔ ان ملکوں میں جہاں جنوبی ایشیا کے لوگ زیادہ تعداد میں بستے ہیں، مثلاً خلیجی ریاستیں وغیرہ، وہاں ایسی اشیا کی بہت مانگ ہے۔

''اب آتے ہیں اس سوال کی جانب کہ ایکسپورٹ کمپنی کھولنے کے لیے متعلقہ معلومات کیونکر حاصل کی جائیں۔ سب سے پہلے، تو ارد گرد نظر دوڑاؤ کہ پاکستان سے کیا کیا شے ایکسپورٹ ہو سکتی ہے؟ بہتر ہے کہ ایسی شے یا اشیا کا انتخاب کرو جنھیں کم کمپنیاں برآمد کرتی ہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم ایک شے کی برآمد میں منافع کی شرح جاننے کے لیے دو تین اشیا کی فزیبلٹی بناؤ۔ اس طرح تمھارا کاروبار جلد مستحکم ہو سکے گا۔ پھر ایسی شے یا اشیا کا انتخاب کرو جس کے اندر منافع ہو اور مقابلہ بھی نسبتاً کم ملے۔ اس سلسلے میں تمھیں اعداد و شمار سے مدد لینا ہو گی۔

''آج کل سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہمارے پاس انٹرنیٹ موجود ہے۔ انٹرنیٹ نے کاروبار کرنا اتنا آسان بنا دیا ہے جتنا پہلے نہیں تھا، خصوصی طور پر ایکسپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار سے وابستہ افراد کے لیے۔ اگر تم انٹرنیٹ اور گوگل سرچ کا استعمال جانتے ہو، تو گھر بیٹھے برآمدی شعبے سے متعلق وہ تمام معلومات حاصل کر سکتے ہو جنھیں پانے کی خاطر پہلے کئی اداروں کی خاک چھاننی پڑتی تھی۔

''سب سے پہلے تم یہ دیکھو کہ جس شے یا اشیا کی فزیبلٹی تم بنانا چاہتے ہو، پاکستان سے وہ کتنی مالیت میں ایکسپورٹ ہو رہی ہیں۔ اُس شے کی ایکسپورٹ بڑھی ہے یا کم ہوئی۔ اگر بڑھ رہی ہے، تو اضافہ کتنے فیصد ہے۔ دوسرے یہ تلاش کرو کہ اس شے کے سب سے بڑے خریدار کون سے ممالک میں ہیں۔

''اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پاکستان سے جو کمپنیاں وہ شے برآمد کر رہی ہیں، ان کا معیار کیا ہے اور وہ کس قیمت میں اسے فروخت کرتی ہیں۔ مزید برآں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دیگر ممالک کی کمپنیاں وہ شے کس قیمت پر فروخت کرتی ہیں۔ اس مشکل کے دو حل ہیں، ایک تو یہ کہ جو ملک اس شے کا سب سے بڑا فروخت کنندہ یعنی ایکسپورٹر ہے، اگر وہاں آپ کا کوئی جاننے والا رہتا ہے، تو اس سے کہو کہ وہ کسی کمپنی کا نمائندہ بن کر ان کے پاس جائے، مطلوبہ شے کی تکنیکی خصوصیات حاصل کرے اور ان سے نرخ یا شے کی قیمت بھی جان لے۔

''دوسرا آسان حل یہ ہے کہ آج کل بیشتر کاروبار انٹرنیٹ اور ای میل کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ آپ اپنی ویب سائٹ بناؤ اور پھر اس شے کے جو بڑے ایکسپورٹر ممالک ہیں، ان کی کمپنیوں کو ای میل کرو اور ان سے کوٹیشن یعنی تکنیکی خصوصیات کے ساتھ اپنی مطلوبہ شے کا ریٹ لو۔ جب آپ نے کام شروع کرنا ہو، تو ان سے

www.pdfbooksfree.pk

شے کے نمونے بھی منگوا لو تاکہ آپ کو ان کے معیار کا اندازہ بھی ہو جائے۔"

علی نے پوچھا: "طیب بھائی! مجھے ان کمپنیوں کا کیسے پتا لگے گا جن سے میں نے ریٹ لینا ہے؟

میں نے جواب دیا: "اس کا بہت آسان حل ہے لیکن اکثر پاکستانی اسے نہیں جانتے۔ وہ یہ کہ کاروبار میں ہر سیکٹر یا شعبے کی کاروباری کمپنیوں کی اپنی تنظیمیں ہیں جو ویب سائٹس بھی رکھتی ہیں۔ ان تنظیموں کی ویب سائٹس پر جا کر تم سب ایکسپورٹروں کے نام و پتے حاصل کر لو۔ ویب سائٹس پر ان کے فون نمبر، ڈاک پتا اور ای میل سب کچھ درج ہوتا ہے۔ یہی اصول اس وقت بھی لاگو ہو گا جب تم اپنی شے کی مارکیٹنگ کے لیے امپورٹر کمپنیوں سے رابطہ کرو گے۔ امپورٹروں کی تنظیمیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ ان تنظیموں کی ویب سائٹس پر تمام رکن کمپنیوں کا سارا ڈیٹا موجود ہے۔"

علی نے اب اگلا سوال پوچھا: "طیب بھائی، ابھی آپ نے ایکسپورٹ والی اشیا کی مارکیٹنگ کا ذکر کیا۔ ہم ایکسپورٹ کا جو بھی کام شروع کریں، اس میں اپنی شے یا اشیا کی مارکیٹنگ کیسے کی جاتی ہے؟

میں نے بتایا "اس مقصد کے لیے تمھیں جامع حکمت عملی بنانی پڑے گی۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ تمہارے غیر ملکی گاہک کون ہیں۔ اس سلسلے میں تمھیں انٹرنیٹ اور اعداد و شمار سے مدد ملے گی۔ سب سے پہلے تو گوگل سرچ کے ذریعے یہ تلاش کرو کہ تمہاری شے کے دنیا میں سب بڑے امپورٹر ممالک کون سے ہیں اور پاکستان سے وہ شے سب سے زیادہ کن ملکوں کو ایکسپورٹ کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ان ممالک کی متعلقہ تنظیموں کی ویب سائٹس سرچ کرو۔

"اگر انگریزی میں تمھیں مطلوبہ ویب سائٹ نہیں ملتی تو گوگل ٹرانسلیٹ کے ذریعے شے کے الفاظ اس ملک کی زبان میں ترجمہ کر کے پھر سرچ کرو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ بے شمار ممالک جن کی مادری زبان انگریزی نہیں خصوصاً یورپی ممالک، ان کی ویب سائٹس انگریزی میں نہیں ہوتیں۔ انگریزی زبان میں سرچ کرتے وقت بھی مختلف متعلقہ الفاظ استعمال کرو۔ مثلاً اگر تم نے برطانیہ کی انتڑیوں سے ساسیج (ایک قسم کا کباب) بنانے والے کمپنیوں کی تنظیم کو سرچ کرنا ہے، تو ٹائپ کرو: ساسیج کیسنگ امپورٹرز ایسوسی ایشن یو کے/انگلینڈ۔ اگر اس سے مطلوبہ ویب سائٹ نہیں ملتی، تو ٹائپ کرو ایسوسی ایشن آف ساسیج کیسنگ امپورٹرز ایسوسی ایشن انگلینڈ/یو کے۔ وجہ یہ ہے کہ مختلف الفاظ لکھنے پر گوگل مختلف نتائج دکھاتا ہے۔ مطلوبہ نتائج تک پہنچنے کے لیے آپ کو مختلف الفاظ لکھ کر سرچ کرنی پڑتی ہے۔

"بہرحال تمہاری مطلوبہ شے کے جو پانچ، چھے بڑے امپورٹر ممالک ہیں، وہ اور جنھیں پاکستان یہ شے بڑی تعداد میں فروخت کرتا ہے، وہاں کی تنظیموں کی ویب سائٹس سے امپورٹر کمپنیوں کی ویب سائٹس کے پتے نکال کے ان کی فہرست بنا لو۔ اس میں ان کے نمبر، ای میل، ڈاک پتا وغیرہ سبھی کچھ شامل کر لو۔ اس کے بعد اپنی ایک ویب سائٹ بنواؤ۔ کاروباری ویب سائٹ زیادہ مہنگی نہیں بنتی، پاکستان میں کوئی بھی آئی ٹی کمپنی آپ کو پانچ ہزار روپے میں آپ کے کاروباری نام کی ایک اچھی ویب سائٹ بنا دے گی۔

اس ویب سائٹ میں اپنے دفتر، فیکٹری یا اس فیکٹری کی جس سے اپنا مال بنوا رہے ہو، کم از کم تین چار تصویریں ڈالو۔ یہ بہت ضروری ہے تاکہ دوسروں پہ اچھا

www.pdfbooksfree.pk

تاثر پڑے کہ یہ کمپنی سنجیدہ اور پروفیشنل انداز میں کام کر رہی ہے۔ غرض اپنے ممکنہ گاہکوں کے سامنے دفتر کی عمدہ تصویر پیش کرو۔ ممکن ہو، تو اپنے دفتر یا فیکٹری کی تین چار منٹ دورانیے پر مشتمل ایک مختصر سی ویڈیو بھی ڈال دو۔

''آج کل دنیا میں اربوں کھربوں روپے کی تجارت ایسی ہی ویب سائٹس کے ذریعے ہو رہی ہے جنھیں ہم ''بی ٹو بی'' یعنی بزنس ٹو بزنس ویب سائٹس کہتے ہیں۔ ان ویب سائٹس پر آپ اپنا اکاؤنٹ بناتے ہو۔ اس کے بعد دلچسپی رکھنے والی کمپنیاں آپ سے پہلے متعلقہ شے یا اشیا کی قیمت معلوم کرتی ہیں۔ انھیں آپ کا ریٹ پسند آ جائے، تو وہ آپ سے نمونے منگواتی ہیں۔ وہ پسند آ جائیں، تب آپ کو آرڈر دیتی ہیں۔ اس طرح کی سب سے بڑی ایک چینی کمپنی ''علی بابا کام'' (alibaba.com) ہے۔ اس کے ذریعے ہر مہینے کھربوں روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔

علی بابا ڈاٹ کام اور اس طرح کی دوسری بزنس ٹو بزنس ویب سائٹس پر اپنی کمپنی کا اکاؤنٹ بناؤ اور ان پر کمپنی کی متعلقہ معلومات اور تصویریں اپ لوڈ کرو۔ علی بابا اور اس طرح کی دوسری ویب سائٹس پر ہر مہینے ''آر ایف کیو'' (quotations for request) یعنی تمہاری متعلقہ شے/اشیا خریدنے کے سلسلے میں قیمت معلوم کرنے کی غرض سے مختلف کمپنیاں اکثر درخواستیں دیتی ہیں۔ ان درخواستوں کا فوری جواب دیتے رہو۔ اگر تم نے ۵۰ کمپنیوں کو جواب دیا، تو اس میں سے دس تم سے نمونے منگوائیں گی۔ ان میں سے ایک دو نے بھی آرڈر دے دیا، تو تمہارا کام چل نکلے گا۔ اس کے علاوہ یہ سرچ کرو کہ تمھاری شے خریدنے والے ممالک میں کون سی بزنس ٹو بزنس ویب سائٹس زیادہ مقبول ہیں۔ علی بابا کے علاوہ ان پر بھی اکاؤنٹ لازمی بناؤ اور اسے مسلسل چیک کرتے رہو۔

''اگلا اہم کام یہ کرو کہ علی بابا پر اپنے اکاؤنٹ کی تصدیق (verify) کراؤ۔ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ آپ کے پاس اپنے اکاؤنٹ کی تصدیق کروانے کی آپشن ہوتی ہے۔ اگر آپ اس پہ کلک کر کے دی گئی ہدایات پر عمل کریں، تو علی بابا کا نمائندہ آپ سے ملنے آ جائے گا۔ وہ آپ کی کمپنی کی قانونی دستاویزات اور آپ کی فیکٹری یا دفتر دیکھے گا۔ اگر وہ مطمئن ہو کر گیا، تو آپ کی کمپنی کو علی بابا ویب سائٹ پر تصدیق شدہ (verified) کا درجہ مل جائے گا۔

''اس عمل کا سب سے بڑا اور اہم فائدہ یہ ہے کہ آپ کی کمپنی کی خریدار کے سامنے ساکھ بنے گی کہ یہ واقعی ایک باقاعدہ کمپنی ہے، کوئی گھر میں بیٹھ کر تنہا آدمی فراڈ نہیں کر رہا۔ پھر کوئی بھی غیر ملکی کمپنی آپ سے معاہدہ کرتے ہوئے نہیں گھبرائے گی، اسے آپ اور آپ کی کمپنی پر اعتبار ہوگا۔

''اب آتے ہیں کمپنیوں سے ملنے والے اس ڈیٹا کی طرف جو تم نے اکٹھا کیا۔ سب سے پہلے ان غیر ملکی کمپنیوں کو اچھی سی ای میل بنا کر بھیجو۔ اس میں اپنی کمپنی کا تعارف، متعلقہ شے یا مصنوعہ کے کوالٹی سرٹیفکیٹ، اپنی ویب سائٹ، ڈاک کا پتا وغیرہ سب معلومات شامل ہوں۔ ایک پروفیشنل کاروباری ای میل کیسے لکھی جاتی

www.pdfbooksfree.pk

ہے، تم انٹرنیٹ سے سرچ کر کے دیکھ سکتے ہو۔

''دوسرے تمھاری شے کے امپورٹر ممالک میں اگر کوئی تمہارا دوست، رشتے دار یا کوئی جاننے والا ہے، تو اس سے بات کر کے یہ معاہدہ کرو کہ تم وہاں ہماری کمپنی کے نمائندے بن کر کام کرو۔ جو آرڈر تم لاؤ گے، اس پہ ہم تمھیں ۵ فیصد یا ۱۰ فیصد یا جتنا بھی آپس میں طے ہو، اتنا کمیشن دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے، کسی غیر ملکی کمپنی کو کبھی ہمارے نمائندے سے ملاقات کی ضرورت پیش آئے، تو تم ہمارے نمائندے کے طور پر ان سے ملاقات کر آنا۔ ہم اس کے عوض تمھیں ایک یا دو فیصد اس آرڈر کی فروخت میں سے حصہ یا ایک مخصوص فیس دیں گے۔

''تیسرا طریقہ جو سب سے بہتر ہے، وہ یہ ہے کہ اگر آپ دو حصے دار ہیں، تو کم از کم پہلا آرڈر ملنے تک ایک حصے دار اسی مُلک میں قیام کرے۔ وہاں سے آرڈر لے کر ہی وہ پاکستان کی راہ دیکھے۔ جو خرچہ ہوگا، اس کو آپ فزیبلٹی رپورٹ بناتے وقت اپنے اخراجات میں شامل کرلیں۔

''ایکسپورٹ کے کاروبار میں مددگار بننے والا چوتھا اور سب سے اہم طریقہ ہے کاروباری نمائشوں میں شرکت۔ دنیا بھر میں ہر سال مختلف ممالک میں کاروباری نمائشیں لگتی ہیں۔ وہاں مختلف مُلکوں کی کمپنیاں اپنے اسٹال لگاتی ہیں۔ اسی طرح کئی مُلکوں کے خریدار ان نمائشوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اس سے انھیں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ تمام کمپنیوں کی مصنوعات ایک ہی جہت تلے مل جاتی ہیں۔ یوں مختلف کمپنیوں کی اشیا دیکھنے سے ان کی قیمتوں اور معیار کا بہتر اندازہ اور تقابل ہو جاتا ہے۔

اسٹال لگانے والی کمپنی کو یہ فائدہ ملتا ہے کہ ایک تو عالمی مارکیٹ میں بطور بڑی کمپنی اس کا نام آتا ہے جس پر اعتبار کرنا ممکن ہے۔ دوسرے کمپنی کو نئے گاہک ملتے ہیں۔ تمہارے کاروباری شعبے کی جو عالمی نمائشیں منعقد ہوتی ہیں، خصوصاً ان مُلکوں میں جہاں تمھاری شے سب سے زیادہ امپورٹ ہو، ان میں لازمی شرکت کرو تاکہ تمھیں نئے آرڈرملیں اور عالمی مارکیٹ میں کمپنی کی ساکھ بھی بنے۔

''پانچواں طریقہ یہ ہے کہ آپ ان ممالک میں اپنے کمیشن ایجنٹ تعینات کرو۔ یہ لوگ بھی آپ کو انٹرنیٹ کے ذریعے مل جائیں گے۔ جس طرح ہمارے اولیکس ڈاٹ کام (olx.com.pk) اور روزی پی کے (Rozi.pk) ہیں، اسی طرح ان کے ہاں بھی ملازمین ڈھونڈ کر دینے والی ویب سائٹس ہیں جو انٹرنیٹ پر سرچ کرنے سے مل جائیں گی۔ لیکن یاد رہے، کمیشن ایجنٹ کے ذریعے پہلے رقم منگوائیں اور پھر مال بھیجیں۔ یا پھر مال بھیجنے سے پہلے کمپنی کی اچھی طرح تصدیق کرلیں کہ وہ قابل اعتبار ہے تاکہ مالی نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔

''چھٹا طریقہ ہے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال۔ جو کمپنیاں آپ کی ای میل کا جواب دیں، ان کے متعلقہ منیجر کا موبائل نمبر لے کر ان کے ساتھ مسلسل واٹس ایپ (whatsapp) اور سکائی پی (skype) کے ذریعے رابطے میں رہیں۔ آج کل ہر ایک کے پاس موبائل فون ہے۔ آپ متعلقہ غیر ملکی کمپنی سے بہتر اور فوری رابطہ کرنے کے علاوہ دیرپا تعلقات بھی استوار کر سکتے ہیں۔ فیس بک پیج بنانا اس لیے نہیں کہوں گا کہ وہ تب کام آتا ہے جب ہم نے عوامی سطح پر کوئی چیز بیچنی ہو۔ چونکہ تمہاری مارکیٹنگ مخصوص کمپنیوں تک محدود ہو گی۔ لہٰذا فیس بک پیج اس معاملے میں اتنا کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔

''ساتواں طریقہ یہ ہے کہ انھیں اپنی کمپنی کی تشہیری

www.pdfbooksfree.pk

اشیا روانہ کرو جن پر کمپنی کا نام کندہ ہو۔ مثلاً اگر آپ کی شے یا مصنوعہ کے خریدار یورپی ہیں، تو انھیں کرسمس کے موقع پر آپ اپنی کمپنی کے کیلنڈر، گھڑیاں، پیپر ویٹ، یا پاکستان کے ہینڈی کرافٹس سے بنی اشیا مثلاً ٹیبل لیمپ وغیرہ بھیج سکتے ہیں۔ یہ بہت اچھا اور اہم مارکیٹنگ گر ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو آپ کی کمپنی پر اعتبار قائم ہوتا ہے کہ یہ سنجیدہ طور پر کاروبار کرنا چاہتی ہے۔ دوسرا یہ کہ کمپنی کی تشہیری مصنوعات غیر ملکی کمپنی کے منیجر یا مالک کے کمرے میں مسلسل لگی رہتی ہے۔ لہٰذا جب اس نے آرڈر دینا ہو، تو آپ کی کمپنی سے کوٹیشن اور نمونے لازمی لے گا۔''

میں نے پھر ''لیکن'' پر زور دیتے ہوئے کہا ''لیکن ان تمام تشہیری طریقوں کا تبھی فائدہ ہوگا، اگر آپ کی کمپنی کی بنی مصنوعہ یا برآمد ہونے والی شے کی قیمت اور معیار اچھا ہو۔ آپ جتنی مرضی تشہیر کر لیں، اگر آپ کی مصنوعات کا ریٹ اور معیار اچھا نہیں، تو شاید کوئی ایک بار تو مال خرید لے، لیکن اگلی بار کبھی نہیں خریدے گا۔''

''طیب بھائی، ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرتے ہوئے مجھے کیا ریٹ دینا چاہیے اور میں یہ کیسے یقین حاصل کروں کہ میری مصنوعہ کا معیار عالمی معیر کا مقابلہ کر سکتا ہے؟'' علی نے سنجیدہ ہو کر سوال پوچھا۔

میں نے کہا ''دیکھو کاروبار کے شروع میں آپ گاہک بناتے اور پھر انھی سے ساری عمر کمائی کرتے ہیں۔ اس لیے شروع میں آپ کی توجہ کمانے پر کم اور گاہک بنانے پر زیادہ ہونی چاہیے۔ ایک بار جب کوئی گاہک بن جائے اور آپ سے دو تین بار مال منگوا لے تو پھر اس کا کسی دوسرے کے پاس جانا قدرے مشکل ہوگا۔ امپورٹر اچھی کمپنی کو کبھی نہیں چھوڑتا کیوں کہ اُسے آپ اور آپ کی مصنوعات/اشیا پر اعتبار ہوتا ہے۔ کاروبار کے شروع میں آپ اپنی شے/مصنوعہ کی قیمت مارکیٹ میں مروج ریٹ سے کم از کم ۱۰ تا ۲۰ فیصد کم رکھو۔ اگر آپ کی ایکسپورٹ مصنوعہ اس قسم کی ہے جس میں منافع کم ہے، تو بھی کم از کم ۵ تا ۱۰ فیصد تک مارکیٹ ریٹ سے نیچے قیمت رکھنی ہوگی۔

''جب تم کاروبار شروع کرتے ہوئے مختلف ممالک کی ایکسپورٹر کمپنیوں سے ریٹ لو گے، تو تمھیں معلوم ہوگا کہ ان کے ریٹ ایک مخصوص رینج میں ہوں گے مثلاً ۲ سے ۳ ڈالر تک۔ جس کمپنی کا تمھیں کم سے کم ریٹ ملے، اس سے بھی ۵ تا ۲۰ فیصد نیچے اپنی مصنوعہ کی قیمت رکھو، تو بہتر ہوگا۔ اس کا دور رس فائدہ یہ ہے کہ کل کو ایک ڈیڑھ سال بعد تم اپنا ریٹ بڑھا دو اور کم از کم مارکیٹ ریٹ کے قریب لے آؤ، تب بھی امپورٹر کمپنی کہیں نہیں جائے گی کیوں کہ اسے علم ہوگا، اب بھی سب سے سستا ریٹ تم سے ہی مل رہا ہے اور ساتھ میں معیار بھی مناسب ہے۔

''کاروبار کے حوالے سے ایک مشہور پنجابی مثل ہے: پہلے سال کھئی، دوجے سال چٹی، تیجے سال ہٹی۔ مطلب یہ کہ جب آپ کاروبار شروع کرتے ہیں، تو پہلے سال نقصان ہوتا ہے، دوسرے سال آپ نہ نفع نہ نقصان کی حالت پہ آجاتے ہیں اور تیسرے سال سے آپ کو

QUALITY MANAGEMENT SYSTEM
ISO 9001:2008
CERTIFIED

www.pdfbooksfree.pk

منافع ملنا شروع ہوتا ہے۔ یہ صرف کہاوت ہی نہیں بلکہ حکمت عملی بھی ہے۔ پہلے سال آپ اپنا منافع بالکل کم رکھیں اور گاہک بنائیں، دوسرے سال آپ تھوڑا بہتر منافع لینا شروع کریں اور تیسرے سال آپ مارکیٹ کے برابر آجائیں۔

کاروبار میں قیمت کے بعد شے کے معیار کو اہمیت حاصل ہے۔ یاد رکھو، بین الاقوامی مارکیٹ میں عمدہ معیار کے بغیر آپ کچھ نہیں بیچ سکتے۔ غیر معیاری چیز فروخت کر کے آپ الٹا اپنا اور اپنے ملک کا نام بدنام کرو گے۔ یوں دوسرے ممکنہ ایکسپورٹروں کے لیے بھی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ایک شے کا معیار سمجھنے اور جانچنے کے لیے پہلا حل تو وہی ہے جس کا میں نے پچھلی ملاقات میں ذکر کیا تھا۔ وہ یہ کہ تم جس شے کو ایکسپورٹ کرنا چاہتے ہو، اس سے متعلقہ کسی کمپنی میں انٹرن شپ کرو اور باسلسلہ کاروبار ساری تکنیکی چیزیں سیکھ لو۔ تم ابھی تعلیم پا کر فارغ ہوئے ہو، کوئی بھی کمپنی ڈھونڈ کے اس میں انٹرن شپ کی درخواست دے دو۔

پندرہ بیس کمپنیوں میں دو گے، تو کوئی نہ کوئی کمپنی تو رکھ ہی لے گی۔ تم ان کے لیے مفت میں کام کرو گے، تو وہ بھی چاہیں گے کہ انھیں کوئی ایسا بندہ مل جائے۔ اب کمپنی میں اپنی مرضی کے شعبے میں کام کرنا اور سیکھنا تمہاری اپنی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ تم اپنے دوست احباب سے بھی اس سلسلے میں مدد لے سکتے ہو۔

''دوسرا حل سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہے۔ کاروباری دنیا میں کسی کمپنی کی مصنوعات کا عمدہ معیار جانچنے کے لیے دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کتنے بین الاقوامی سرٹیفکیٹس حاصل کر رکھے ہیں۔ گویا وہ عالمی سطح پر آپ کی مصنوعہ کے معیار کی پہچان بنتے ہیں۔ ان سرٹیفکیٹس میں آئی ایس او ۹۰۰۰، آئی ایس او ۹۰۰۱، ہیسپ (Haccp) اور اسی نوعیت کے دیگر سرٹیفکیٹس شامل ہیں۔ اگر آپ کی کمپنی یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لے، تو اس کے بہترین معیار پر عالمی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ تب امپورٹر آپ کی مصنوعہ کے معیار پر اعتبار کرتا ہے۔

''ان سرٹیفکیٹس کو کیسے حاصل کیا جائے؟ ان کا طریقہ کار اور دوسری تفصیلات ان سرٹیفکیٹس کو جاری کرنے والی عالمی کمپنیوں کی ویب سائٹوں پر موجود ہیں۔ ان کی شاخیں پاکستان میں بھی ہیں۔ ان کی ویب سائٹ سے پاکستان کی شاخ کا فون نمبر لو اور کال کر کے مطلوبہ معلومات حاصل کر لو۔ مختلف مصنوعات پر مختلف قسم کے کوالٹی سرٹیفکیٹس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کمپنیوں کی ویب سائٹ پر جاؤ اور ان سے فون پہ بات کر کے دیکھ لو کہ تمہاری مصنوعہ پر کس قسم کے سرٹیفکیٹ کا اطلاق ہو گا۔''

اب علی نے سوال پوچھا: ''طیب بھائی یہ بتائیے کہ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرتے ہوئے کون سے سرکاری لائسنس اور دستاویزات درکار ہوں گی؟ میں کل ہی پڑھ رہا تھا کہ حکومت پاکستان نے برآمدات کا طریق کار سہل بنانے کی خاطر زیادہ مراعات دینے کا اعلان کیا ہے۔''

میں نے بتایا ''کاروبار کے آغاز میں کچھ زیادہ سرکاری دستاویزات درکار نہیں ہوتیں۔ اوّل تمھیں اپنی کمپنی رجسٹر کروانی پڑے گی اور اس کا ''این ٹی این'' یعنی نیشنل ٹیکس نمبر اور ''ایس ٹی این'' یعنی سیلز ٹیکس نمبر لینا پڑے گا۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو یعنی ایف بی آر کی ویب سائٹ www.fbr.gov.pk پر جا کر تم بآسانی اپنا نیشنل ٹیکس نمبر لے سکتے ہو۔ حکومت پاکستان نے اس عمل کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ اب تمھیں کسی

www.pdfbooksfree.pk

وکیل کی بھی ضرورت نہیں۔ پھر بھی تم کوئی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو، تو کسی انکم ٹیکس کے وکیل کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تمہاری کمپنی رجسٹر کروا کے تمھیں این ٹی این بھی لے دے گا۔

''دوسرے تمھیں سسٹم ہاؤس میں اپنی کمپنی کی بطور ایکسپورٹر رجسٹریشن کرانی ہوگی۔ جب بھی تم باہر بھجوانے کے لیے مال تیار کرو گے، تمہارا کلیرنگ ایجنٹ تمہاری رجسٹریشن کروا دے گا۔ اس کے علاوہ ایکسپورٹ کے لیے تمھیں جو دستاویزات درکار ہوں گی، ان میں تمہاری انوائس یعنی امپورٹر کمپنی کے نام رسید، بل آف لیڈنگ (bill of lading) اور پیکنگ لسٹ شامل ہیں جو تم اپنی شپنگ کمپنی کو دو گے اور وہ تمھارے غیر ملکی خریدار کی شپنگ کمپنی کو دے گی۔

پیکنگ لسٹ ایک دستاویز ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ سامان پیک کیسے ہوا یعنی مال کے کل کتنے کارٹن ہیں، ایک کارٹن میں کتنے پیک ہیں اور ایک پیک میں آپ کی مصنوعہ کے کتنے یونٹ ہیں۔ اسی طرح بل آف لیڈنگ وہ دستاویز ہے جو بندرگاہ یا ہوائی اڈے پر سامان کلیئر کرواتے ہوئے آپ کا شپنگ ایجنٹ بطور قانونی دستاویز دوسری کمپنی کے شپنگ ایجنٹ کے حوالے کرتا ہے۔ بل آف لیڈنگ کے بغیر سامان بندرگاہ سے نکل نہیں سکتا اور دوسرے ملک کی بندرگاہ پر پہنچ کر کلیئر نہیں ہوتا۔ ان دستاویزات کے نمونے تم انٹرنیٹ پر ان کے ناموں سے سرچ کر کے دیکھ سکتے ہو تاکہ انہی نمونوں کی بنیاد پر اپنی مصنوعہ کے لیے یہ دستاویزات تیار کر سکو۔''

علی اگلا سوال کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے کہا

''مجھے علم ہے کہ تم کیا پوچھنے لگے ہو، تم جاننا چاہتے ہو کہ ہماری مصنوعہ / شے خریدنے والی غیر ملکی کمپنی ہمیں رقم (Payment) کیسے بھیجے گی اور کیا ہمیں بل کی رقم نقد لینی چاہیے؟ اگر نہیں، تو پھر دوسرا طریقہ کیا ہے؟''

علی کہنے لگا ''ارے واہ، آپ تو اب میرے دل کی باتیں بھی جاننے لگے ہیں۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا ''جب تم اتنی دلجمعی سے بات سنو گے، تو تمہارے دل کی بات، تو میں جان ہی لوں گا۔ بہرحال اصل موضوع کی طرف آؤ۔ اصولی طور پر تو تمھیں پہلی بار نقد رقم ہی منگوانی چاہیے۔ یہ تم ''ٹی ٹی'' (T/T) کے ذریعے منگوا سکتے ہو جو کسی بھی منی ایکسچینج سے منگوائی جا سکتی ہے۔ لیکن ہر کمپنی ایسا نہیں کرے گی اور نہ ہی ہر بار ایسا ہوگا۔

''غیر ملکی کمپنیوں سے رقوم منگوانے کے دو تین طریقے ہیں۔ ایک کو ہم ''ایل سی'' (L/C) یعنی لیٹر آف کریڈٹ کہتے ہیں۔ اس طریقہ کار میں آپ بینک جا کر کہتے ہیں کہ فلاں غیر ملکی کمپنی نے مجھے رقم بھجوانی ہے اور اسی سلسلے میں وہ اپنے ملک کے فلاں بینک میں ایل سی کھلوانا چاہتی ہے۔ آپ کا بینک پھر اس کمپنی کے بینک سے تمام تفصیلات لیتا ہے۔ پھر آپ کی ایل سی کی درخواست منظور کر کے آپ کو کہہ دیتا ہے کہ آپ رقم منگوا لیں۔ ادائیگی کی اس صورت میں بینک آپ کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر غیر ملکی کمپنی آپ کو رقم ادا نہیں کرتی، تو اس صورت میں بینک آپ کو روپے ادا کرتا ہے۔

رقم کی ادائیگی کے دوسرے طریقے کو ''سی ڈی''

DS-CONCEPT
Intelligent Trade Finance

www.pdfbooksfree.pk

(C/D) کہتے ہیں یعنی دستاویزات کے بدلے نقد ملنا۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ اپنا امپورٹ شدہ مال کلیئر کروانے کے لیے آپ کو بل آف لیڈنگ، اصلی انوائس اور پیکنگ لسٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ یہ دستاویزات اپنے بینک میں جمع کرواتے ہو۔ وہ انھیں غیرملکی کمپنی کے بینک کو بھیجتا ہے۔ وہ غیرملکی بینک اپنے ملک کی کمپنی کو تبھی مال دیتا ہے جب وہ انھیں نقد رقم دیتی ہے۔ لیکن اگر غیرملکی کمپنی آپ کی دستاویزات نہ لینے آئے، تو اس صورت میں بینک آپ کی رقم لوٹانے کا ذمے دار نہیں ہوتا۔''

اب علی نے لقمہ دیا: ''طیب بھائی، ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرتے وقت کسی سرکاری یا نجی ادارے سے مالی مدد مل سکتی ہے؟''

میں نے جواب دیا ''تم نے اچھا اور بروقت سوال پوچھا۔ مالی مدد بالکل مل سکتی ہے، لیکن افسوس پاکستان میں یہ رقم تمھیں نجی سیکٹر ہی سے ملے گی۔ دنیا میں ہر ملک نے اپنا ایکسپورٹ امپورٹ بینک بنا رکھا ہے۔ وہ ایکسپورٹ کا کاروبار کرنے والوں کو آسان شرائط پر قرضے دیتا ہے۔ افسوس پاکستان میں ایسے ہی ایک بینک کی سمری منظور ہونے کے باوجود اس کا دور دور تک کہیں نام ونشان نہیں۔ بہرحال ڈس کونسیپٹ (ds concept) نامی بین الاقوامی کمپنی کی ایک شاخ کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں بھی کھلی ہے۔ اس کی ویب سائٹ کا نام ہے:

www.ds-concept.net/pk

یہ کمپنی آپ کو ایکسپورٹ کا کاروبار کرنے کے لیے مخصوص شرائط پر سرمایہ فراہم کرتی ہے بشرطیکہ آپ کے پاس آرڈر ہو۔

''عام طور پر غیرملکی کمپنی جب آپ سے مال خریدے، تو وہ آپ کو سامان کی تیاری کے لیے ۳۰ سے ۶۰ دنوں کا وقت دیتی ہے۔ اگر آپ نے اس کمپنی کے ساتھ یہ طے کیا کہ رقم دستاویزات کے بدلے ملنی ہے، تو وہ آپ کو ۶۰ دن بعد ملے گی جبکہ آرڈر تیار کرنے کے لیے آپ کو ابھی روپے چاہئیں۔

اگر آپ سرمایہ فراہم کرنے والی کمپنی کو اپنے آرڈر کی دستاویزات دے دیں، تو وہ آپ کو نقد رقم دیتی ہے۔ اس رقم سے پھر اپنا آرڈر تیار کرانا ممکن ہوتا ہے۔ جب آپ کا بل خریدار کمپنی ادا کرے گی، تو اُسے سرمایہ کار کمپنی رقم لے گی اور اپنی فیس رکھ کر باقی رقم آپ کو دے گی۔

سرمایہ کار کمپنی سے مدد لینے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنے نیٹ ورک کے ذریعے آپ کی خریدار کمپنی کی صلاحیت بھی جانچتی ہے کہ آیا یہ پیسے بھی دے گی یا نہیں اور اس حوالے سے اس کی تاریخ کیسی ہے۔ سی ڈی کے علاوہ یہ کمپنی بقیہ ادائیگی کے طریق کار پر بھی کام کرتی ہے جس کی تفصیلات تم ان کی ویب سائٹ سے جان سکتے ہو۔''

ہم باتوں باتوں میں ایک کلو مٹن کڑاہی کھا گئے تھے اور پتا بھی نہیں چلا۔ علی نے حیران ہو کر کہا ''اتنی زیادہ کڑاہی، تو میں نے آج تک نہیں کھائی۔''

میں نے اسے بتایا کہ جتنے انہماک سے تم نے باتیں سنی ہیں، اس میں غرق ہو کر انسان کی دوسرے کاموں پہ توجہ نہیں رہتی۔ اگر تم اسی انہماک سے کاروبار پر محنت کرنے لگے، تو ان شاء اللہ کامیاب ہو گے۔ چلو پشاوری قہوہ پیتے ہیں۔ وہ ہاضمے کے لیے اکسیر ہوتا ہے۔ میں وہاں تمھیں بتاؤں گا کہ جانوروں کی انتڑیاں برآمد کر کے منافع بخش کاروبار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ●●●

www.pdfbooksfree.pk

معرکہ کارگل کا دلیر مجاہد

جس نے بے سروسامانی کے باوجود برف پوش وادیوں میں طاقتور عدو کو تگنی کا ناچ نچا دیا

شاہ زیب

"میرے جوانو! آج ہم جس مشن کے لیے روانہ ہونے والے ہیں، اس میں کامیابی پانا مشکل سہی لیکن ناممکن نہیں۔ ہمیں دلیری و جرأت سے یہ مشن کامیاب بنانا ہے تاکہ کشمیر کی مقبوضہ وادی میں مسلمان بہنوں، ماؤں اور بچوں کی بے حرمتی کرنے والی بھارتی فوج کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے۔"

لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن نے یہ الفاظ اپنی سی کمپنی سے خطاب کرتے ہوئے اس وقت کہے جب وہ ان کی زیر قیادت کارگل کے محاذ پر جانے لگی۔ یہ ولولہ انگیز خطاب سننے کے بعد کمپنی کے افسروں اور جوانوں میں جہاد کا جذبہ دیدنی تھا۔ تمام نے بیک آواز ہو کر کہا "سر! آپ نے جو مشن ہمارے سپرد کیا، ہمیں پیچھے نہیں پائیں گے۔ آپ کے ساتھ جئیں گے اور آپ کے ساتھ ہی شہید ہوں گے۔"

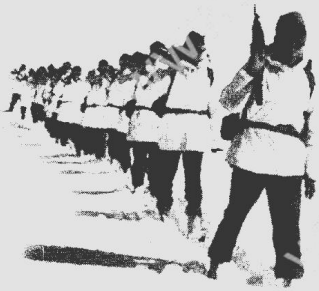

www.pdfbooksfree.pk

اس پر لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی گرجدار آواز پھر گونجی "آج سے نہ میں آپ کا افسر اور نہ آپ میرے ماتحت، ہم سب برابر ہیں۔ اکٹھے جئیں گے اور اکٹھے ہی شہید ہوں گے۔"

یہ سنتے ہی فضا اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ سرفروشوں کا یہ قافلہ ۲رجولائی ۱۹۹۹ء کو گلگت روانہ ہوا۔ یونٹ ۳۳ ایف ایف کے باقی افسر اور جوان بھی ہمراہ تھے۔ عام طور پر جب کوئی یونٹ سرد علاقوں میں تعینات ہو، تو اسے پہلے تین ماہ گلگت چھاؤنی میں رکھا جاتا ہے تاکہ جوان مقامی موسم سے مانوس ہو جائیں۔ اکثر اوقات بلند برفانی پہاڑی سلسلوں میں پہنچ کر جوان بے شمار جسمانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آکسیجن کی قلت کے باعث انسانی پھیپھڑے پھٹ جاتے ہیں اور دشمن سے نبردآزما ہونے کے بجائے موذی بیماریوں ہی سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

لیکن ۳۳ ایف ایف یونٹ کو صرف ایک دن کا قیام دے کر کارگل کی ۱۸ ہزار فٹ بلند چوٹیوں پر جنگ لڑنے بھیج دیا گیا۔ اس سے جوانوں کی صحت پر برا اثر پڑا۔ لیکن دفاعِ وطن کی پکار پر سبھی جوانوں نے اپنی ہمت اور حوصلے سے موسمی صعوبتوں کو مات دے دی۔ انہوں نے برفانی گھاٹیوں اور برف پوش بلند ترین پہاڑی سلسلوں کو عبور کرنے کا ناقابلِ یقین سفر چار دن میں پیدل ہی طے کر لیا۔ یونٹ کے جوان اور افسر دن دھنستی برف کی تہ پر چلتے رہے۔ جہاں دس قدم چل کر کچھ دیر سانس بحال کرنے کی غرض سے رکنا پڑتا۔ ان غیور جوانوں کی منزل وہ بلند اور دشوار ترین چوٹیاں تھیں جہاں سے کارگل اور سیاچن جانے والی واحد سڑک گزرتی ہے۔ عسکری لحاظ سے اس سڑک پر قبضہ بہت ضروری تھا تاکہ دشمن کی شہ رگ کاٹ کر اسے کشمیر سے بھاگنے پر مجبور کیا جا سکے۔

دورانِ مسافت ایک مقام ایسا آیا جہاں برف پوش پہاڑی بالکل عمودی تھی۔ آسمان سے چھوتی چوٹی کو عبور کرنا ناممکن نظر آرہا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر کے مطابق یہ کام کمانڈوز ہی انجام دے سکتے تھے کہ وہ چوٹی پر پہنچ کر رسی کے ذریعے جوانوں کو پہاڑی کی بلندی پر چڑھاتے۔ سبھی جوان طویل مسافت پیدل طے کرنے اور سرد ترین موسم میں چلتے چلتے نڈھال ہو چکے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ عمودی پہاڑی پر چڑھ سکیں۔

اسی اثنا میں لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن نے کمانڈنگ آفیسر سے کہا "سر! کمانڈوز بلوانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ کی تائید و حمایت سے میں یہ معرکہ سر کر کے دکھاتا ہوں۔" دبلے پتلے نوجوان کے چہرے پر تھکاوٹ اور بے آرامی کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک دیکھ کر محسوس ہوتا کہ دھن کا پکا جوان یہ کٹھن کام کر سکتا ہے۔ کمانڈنگ آفیسر نے اسے سمجھایا کہ عمودی برف پوش پہاڑی پر چڑھنا آسان کام نہیں۔ پھر تم ابھی پاکستان ملٹری اکیڈمی سے فارغ ہوئے ہو۔ پیشہ وارانہ تربیت کے دیگر کورس بھی نہیں کیے۔ انفنٹری کا بنیادی کورس ۲ اگست کو شروع کرنا تھا کہ کارگل کی دشوار گزار وادیوں نے اسے پکار لیا۔

لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن نے کمانڈنگ آفیسر کو کہا "مانا کہ میں آج پہلی مرتبہ یہ بلند ترین چوٹیاں عبور کرنے آیا ہوں۔ ہتھیاروں کے ساتھ ان چوٹیوں پر چڑھنا انتہائی مشکل ہے لیکن جناب، میں نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی۔ میرے اٹھتے قدم ہمیشہ آگے ہی بڑھے ہیں، کبھی پیچھے نہیں ہٹے پھر مجھے ایک غازی کا بیٹا ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔"

دراصل فیصل ضیا گھمن بچپن سے عسکری ناول بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ اسی شوق کی بدولت اس نے کئی مرتبہ

www.pdfbooksfree.pk

اپنے والد سے ڈانٹ بھی کھائی۔ لیکن عسکری ناولوں نے اس کے اندر ایسا معرکہ آرا انسان پیدا کر دیا جو مشکل سے مشکل جنگی مہم سر کرنے کے لیے ہمہ وقت خود کو تیار پاتا۔ اب بھی وہ خود کو جنگی ناول کا کردار ہی محسوس کرتا۔

آخر کمانڈنگ افسر نے اجازت دے دی۔ وہ ایک حوالدار کے ساتھ عمودی برف پوش پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ یونٹ کے سبھی افسر اور جوان فیصل کی ہمت و جذبے کو دل ہی دل میں خراج تحسین پیش کرنے لگے۔ انھوں نے اس کی کامیابی کے لیے دعا بھی مانگی۔ کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد لیفٹیننٹ فیصل حوالدار سمیت اس عمودی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب رہا۔ اس پر وہ بلاشبہ مبارک باد کے مستحق تھے۔ یونٹ کا ہر شخص اس کی جرأت اور بہادری کی تعریف کر رہا تھا۔

سی کمپنی کے وہ جوان پھولے نہ سماتے جنھیں لیفٹیننٹ فیصل کی سرپرستی حاصل تھی۔ اب چوٹی سے رسے نیچے پھینکے گئے۔ تمام جوانوں نے باری باری پہاڑی عبور کی۔ گھروں میں نرم و گداز بستروں پر سونے والے مجاہدوں کے لیے آرام کرنے اور سونے کو یہاں برف کا بستر بچھا تھا۔ سخت سرد موسم اور برفانی طوفان ان کے ارادے پست کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن شیر دل جوان وطن کی خاطر سبھی دکھ اور مصیبتیں جھیلنے پر آمادہ تھے۔

۱۶ر جولائی ۱۹۹۹ء کو یونٹ کی سبھی کمپنیاں مقررہ جگہ پہنچ گئیں۔ لیفٹیننٹ فیصل، سی کمپنی کے دس جوانوں سمیت اپنی یونٹ سے تین سو گز دور جانب مشرق اس مقام پر مورچہ زن ہوئے جہاں کارگل سے سیاچن جانے والی واحد سڑک گزرتی تھی۔ معرکہ کارگل میں بھارتی فوج کو اس لیے زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا کہ وہ پستی میں تھے۔ بلند چوٹیوں پر بیٹھے مجاہدین انھیں دور ہی سے دیکھ کر گولیوں سے بھون دیتے۔ مزید برآں سیاچن میں ہزارہا بھارتی فوجی محصور تھے۔ پاک فوج کے جوانوں نے ان کی خوراک اور اسلحے کی رسد روک دی۔ اگر ۵ر جولائی کو واشنگٹن میں نواز کلنٹن جنگ بندی معاہدہ نہ ہوتا اور پاکستانی فوج محاصرہ جاری رکھتی، تو سیاچن پر ہزارہا بھارتی فوجی اپنی موت آپ مر جاتے۔

کارگل لیہہ روڈ سے کچھ ہی فاصلے پر ارشدنامی پوسٹ پر لیفٹیننٹ فیصل دس جوانوں سمیت دشمن کے انتظار میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ یاد رہے، کارگل کی ان وادیوں میں بھارتی بوفوز توپوں نے اتنی شدید گولہ باری کی تھی کہ ان کے دھانے ناقابل استعمال ہو گئے۔ بعد میں بھارت کو وہ دھانے سوئٹزرلینڈ سے منگوانے پڑے۔ پورے علاقے میں بھارتی ہیلی کاپٹر اور جنگی جہاز مسلسل بمباری کر رہے تھے۔ وہ پاکستانی ٹھکانوں پر نہ صرف میزائلوں سے حملہ کرتے بلکہ پوزیشن بتا کر بھارتی توپ خانے سے فائر کراتے۔ ان ہیلی کاپٹروں سے زہریلی گیس کے بم بھی گرائے گئے۔ لیکن پاکستانی مجاہدوں اور کشمیری مجاہدین کو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید و حمایت حاصل تھی۔ اس لیے گیس بم اور میزائل کارگر ثابت نہ ہوئے۔ بلکہ ہوا کے بدلتے رخ نے ہر بار ان گیس میزائلوں نے بھارتی فوجیوں ہی کو متاثر کیا۔

۱۶ر جولائی کی شام بھارتی فوج نے ارشد پوسٹ پر زبردست حملہ کر دیا۔ کئی گھنٹے مجاہد جاری رہا۔ جنگ کے دوران سی کمپنی کے دو جوان شہید ہو گئے۔ بھارت کے درجنوں فوجی جہنم واصل ہوئے۔ سفید برف سے ڈھکی برفانی ڈھلوانیں بھارتی فوجیوں کے خون سے سرخ ہو گئیں۔ حملہ تو پسپا ہو گیا لیکن رات کے سناٹے میں زخمی انسانوں کی آہ و بکا سنائی دیتی رہی۔

www.pdfbooksfree.pk

۱۷ر جولائی کا سورج طلوع ہوا، تو برفانی پہاڑیاں سرخ دکھائی دیں۔ سی کمپنی کے باقی ماندہ آٹھ جوان مستعدی سے اپنی پوسٹ پر دشمن کا انتظار کرتے رہے لیکن بھارتیوں کو دوبارہ حملے کی ہمت نہ ہوئی۔

۱۹ر جولائی کو بھرتی فوج نے ارشد پوسٹ پر ایک کمپنی کی نفری سے حملہ کیا جسے لیفٹیننٹ فیصل کی زیرِ قیادت پاک فوج کے غیور جوانوں نے روک لیا۔ دشمن کو بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچا کر پسپا ہونا پڑا۔ اسی رات کارگل لیہہ روڈ پر بھارتی فوج کے ٹرکوں پر مشتمل قافلہ نظر آیا۔ یہ قافلہ سیاچن میں تعینات بھارتی فوج کے لیے خوراک لے کر جا رہا تھا۔ لیفٹیننٹ فیصل نے توپوں سے نشانے لگوا کر بھارتی فوج کا پورا قافلہ راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ فیصل ضیا کے کامیاب جنگی معرکوں کی خبریں کمانڈنگ افسر تک مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ وہ فیصل کو ہر معرکے کے بعد وائرلیس پر شاباش دیتے۔

۲۲ اور ۲۳ر جولائی کی رات دشمن نے ایک بٹالین نفری کے ساتھ ارشد پوسٹ پر پھر چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر حملہ کیا۔ بھارتی میجر نے دستی مائیکروفون پر ارشد پوسٹ پر تعینات پاک فوج کے جوانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''تمہیں گھیرا ڈال لیا گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ ہتھیار ڈال دیں۔ بھارتی فوج ان کو زندگی کی ضمانت دیتی ہے۔''

یہ اعلان سن کر لیفٹیننٹ فیصل ضیا نے بلند آواز میں کہا کہ میں اپنے جوانوں کے ساتھ ارشد پوسٹ پر موجود ہوں۔ اگر ہمت ہے تو آگے بڑھو۔ مسلمان ہتھیار ڈالنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ شہادت کی موت ہی ہماری زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔''

فیصل کا جواب سن کر بھارتی میجر ششدر رہ گیا کہ بارہ سو بھارتی سپاہیوں کی موجودگی میں جو ہر قسم کے جدید اسلحہ سے لیس تھے، پاک فوج کا یہ کتنا دلیر افسر ہے کہ گھیرے میں آنے کے باوجود مقابلے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ ۴ گھنٹے تک ارشد پوسٹ پر بھارتی فوج چاروں طرف سے گولہ باری کرتی رہی۔ لیکن فیصل کی قیادت میں مجاہدوں نے مردانہ وار مقابلہ کر کے حملہ پسپا کر دیا اور بھارتیوں کو ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ چناں چہ نفری سمیت بھارتی میجر اپنے زخم چاٹتا واپس لوٹ گیا۔

میں اپنے جوانوں کے ساتھ ارشد پوسٹ پر موجود ہوں۔ اگر ہمت ہے تو آگے بڑھو۔ مسلمان ہتھیار ڈالنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ شہادت کی موت ہی ہماری زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔''

بھارتی فوج کی اندھا دھند گولہ باری سے برفانی پہاڑیوں پر پھیلی برف زہریلی ہوگئی۔ پیاس بجھانے کے لیے جب برف پگھلائی جاتی، تو زہریلا پانی پینے والوں کو خونی پیچیش لگ جاتے۔ فیصل سمیت سی کمپنی کے تمام جوان پیچش ہونے سے انتہائی لاغر اور کمزور ہونے لگے۔ پھر بھی ان کی جرأت اور بہادری کے باعث دشمن ارشد پوسٹ پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا۔

بھارتی فوج کا رخ پھر ارشد پوسٹ سے چند سو گز دور واقع ایک اور پاکستانی چوکی کی طرف ہو گیا۔ وہاں کیپٹن کھوسہ مٹھی بھر جوانوں کے ساتھ تعینات تھے۔ بھارتی فوج کا دباؤ اس چوکی پر مسلسل بڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر لیفٹیننٹ فیصل اور کیپٹن شاہد، کیپٹن کھوسہ کی مدد کے لیے نیچے اترے۔ دشمن مسلسل گولہ باری کر رہا تھا۔ بھارتی فوج کی بھاری نفری اس پاکستانی چوکی کو گھیرے میں لیے زبردست فائرنگ کر رہی تھی۔ اب اس جنگی معرکے میں

www.pdfbooksfree.pk

لیفٹیننٹ فیصل اور کیپٹن شاہد بھی شریک ہو گئے کیونکہ دونوں تجربہ کار افسر بھارتی حربوں کو اپنی حکمت سے کئی مرتبہ ناکام بنا چکے تھے۔ انھیں بھارتی فوج سے نمٹنے کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔

لیکن جونہی لیفٹیننٹ فیصل وہاں پہنچے، ان کے ماتھے کو چیرتی ایک گولی جسم میں پیوست ہوگئی۔ عزم و ہمت کے پیکر کا لہو برفانی چوٹیوں پر بہنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہی انھوں نے جام شہادت نوش کر لیا جس کے لیے وہ پاک فوج میں شامل ہوئے تھے۔ یہ ۲۳ جولائی کی شب تھی جب فیصل ضیا نے شہادت کو گلے لگایا۔ آہستہ آہستہ ارشد پوسٹ کے دیگر جوان بھی اپنے قائد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شہید ہو گئے۔

اس طرح انھوں نے یوں وہ وعدہ پورا کر دکھایا جو محاذ جنگ پر روانہ ہونے سے قبل اپنے قائد اور راہنما لیفٹیننٹ فیصل گھمن کے ساتھ کیا تھا۔ ارشد پوسٹ (لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن کی شہادت کے بعد فیصل ضیا چوکی) پر دشمن نے قبضہ کر لیا۔ دشمن کے زیر قبضہ علاقے سے شہیدوں کی میتیں واپس لانا مشکل مرحلہ تھا۔ اس سلسلے میں کئی کمانڈو ز ایکشن کیے گئے۔ جس میں میجر سمیت کئی جوان زخمی ہوئے۔ تب کہیں جا کر لیفٹیننٹ فیصل ضیا سمیت شہداء کی میتیں سکردو واپس لائی جا سکیں۔

☆☆

۲۶ جولائی ۱۹۹۹ء کو نماز مغرب کی ادائیگی کے دوران فون کی گھنٹی بجی جس کا لاشعور میں پہلے سے انتظار تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد لیفٹیننٹ فیصل ضیا کے والد گرامی، میجر ضیا قادر گھمن نے فون کا رسیور اٹھایا۔ دوسری جانب ایف ایف ۳۳ کے کرنل سجاد بول رہے تھے۔ انھوں نے نہایت ضبط و تحمل سے بتایا کہ لیفٹیننٹ فیصل ضیا کو گولی لگ گئی ہے۔ وہ زخمی حالت میں ہیں ڈاکٹر ان کی مکمل دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ فیصل کے بارے میں وقفے وقفے سے آپ کو اطلاع دی جاتی رہے گی۔ جونہی فون بند ہوا، باپ کو بیٹے کی شہادت کا یقین ہو گیا..... کارگل جانے سے پہلے ہی میجر ضیا قادر نے نمازوں کے بعد جب بھی اپنے بیٹے کا تصور کیا، وہ انھیں سبز ہلالی پرچم میں لپٹا چارپائی پر لیٹا دکھائی دیا۔

والد کی بے قراری میں اضافہ ہوا، تو انھوں نے ایک عزیز کو فون کیا جو ان دنوں سکردو ہی میں تعینات تھے اور کہا کہ آپ سکردو کے فوجی اسپتال میں جا کر پتا لگائیے، فیصل واقعی وہاں موجود ہے اور کس حالت میں؟۔ دس منٹ بعد دوبارہ فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف سکردو سے میجر صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ ضیا قادر گھمن کو بتانے لگے، کہ یونٹ میں شہدا کی جو فہرست آئی ہے، اس میں لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن کا نام بھی درج ہے۔ یہ کہتے ہی ان کی زبان سے ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' نکلا اور فون بند ہو گیا۔

اسی روز لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ ہزار ہا لوگ شہید کے آبائی گھر کے باہر جمع ہو گئے۔ ہر شخص کلمہ شہادت کا ورد کر رہا تھا۔ لوگ جب بلند آواز میں کلمہ پڑھتے، تو محسوس ہوتا جیسے آج شہید کے گھر اللہ کی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں اور جمع ہونے والے انسان نہیں فرشتے ہیں جو شہادت کی گواہی دینے زمین پر اترے۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۹ء کی دوپہر جب سبز ہلالی پرچم میں لپٹا شہید کا جسد خاکی گھر پہنچا، تو شدت جذبات سے ماں کی حالت غیر ہو گئی۔ بھائی تابوت سے لپٹ لپٹ جاتے۔ شہید کے والد نے کسی حد تک خود کو سنبھالے رکھا۔ شہادت کے پانچ روز بعد بھی لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی نعش تر و تازہ تھی۔ جسم اتنا نرم جیسے زندہ انسان کا۔ ماتھے پر جہاں

www.pdfbooksfree.pk

گولی لگی تھی، پانچ دن بعد بھی زخم سے خون قطروں کی صورت رس رہا تھا۔

جب شہید کا جسد خاکی تدفین کے لیے ڈیفنس قبرستان لے جایا گیا، تو وہاں بادلوں کا ایک ٹکڑا قبرستان پر سایہ کرنے ٹھہرا رہا۔ تدفین کے بعد سب لوگ واپس چلے گئے۔ دوسری صبح محسوس ہوا کہ قبر پر کتبہ ٹیڑھا لگا ہے۔ شہید کے والد کی اجازت سے جب کتبے والی جگہ کھودی گئی تو وہاں سے سیمنٹ کا ایسا ٹکڑا ملا جس پر کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ'' کھدا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی عظیم تخلیق کار نے کلمہ طیبہ کا پہلا حصہ نہایت محنت اور خوبصورتی سے تراشا ہے۔ یہ ٹکڑا آج بھی شہید کے گھر فریم میں محفوظ ہے۔ اسے دیکھ کر شہید کے والد کو یقین ہو گیا کہ بیٹے کی قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی۔ قرآن مجید میں آیا ہے، بے شک اسلام کی سربلندی اور دفاعِ وطن کے لیے جان کی قربانی دینے والا شہید زندہ ہوتا ہے، لیکن ہمیں اس کی زندگی کا شعور نہیں۔ فیصل کی شہادت نے یہ سچ کر دکھایا۔

☆☆

کارگل کی جنگ

یہ مئی ۱۹۹۹ء کی بات ہے جب کشمیری مجاہدین نے مقبوضہ کشمیر میں کارگل سیکٹر کی پہاڑیوں پر قبضہ کیا۔ مدعا بھارتی فوج کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا تھا۔ یوں اس معرکے کا آغاز ہوا جو ''کارگل جنگ'' کہلایا۔ کشمیری مجاہدین کی مدد کے لیے بعدازاں پاک فوج کو بھی جنگ میں شامل ہونا پڑا۔ یہ جنگ جولائی تک جاری رہی۔ بھارتی فوج نے عددی برتری جدید ترین اسلحے سے فائدہ اٹھا کر پھر کارگل کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔

کارگل جانے والی پاک فوج کے دستوں میں لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی یونٹ بھی شامل تھی۔ آپ نے معرکہ کارگل میں جام شہادت نوش کیا۔ زیرنظر مضمون ان کی شہادت کے فوراً بعد لکھا گیا تھا۔ اب شہید کے والد میجر (ر) ضیا قادر بھی وفات پا کر رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہو چکے۔

لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن یکم مئی ۱۹۷۸ء گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد میجر ضیا قادر تعینات تھے۔ ابتدائی تعلیم منگلا میں پائی۔ میٹرک کا امتحان ایف جی پبلک اسکول، منگلا سے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ایف ایس سی گورنمنٹ ڈگری کالج گوجرانوالہ سے کیا۔ ایف ایس سی کے بعد ۱۹۹۵ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی چلے گئے، ۱۹۹۸ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی سے ابتدائی تربیت مکمل کی۔ بعدازاں شہید نے والد کی یونٹ ایف ایف ۳۳ کو منتخب کیا۔ یونٹ میں انھوں نے محنت اور جدوجہد سے اپنا لوہا منوایا۔ وہ باپ کی بیساکھی لیے آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا۔ بلکہ آزمائش اور امتحان کی ہر گھڑی میں ثابت قدم رہا۔

شہید کے والد میجر ضیا قادر گھمن کہتے ہیں، چونکہ میں خود فوج میں تھا اس لیے فیصل سمیت میرے تینوں بیٹوں کی تربیت نیم عسکری ماحول میں ہوئی۔ فیصل کو بچپن ہی سے فوج میں جانے کا بے حد شوق تھا۔ میں جب گھر آ کر وردی اتارتا تو فیصل میرے فوجی بوٹ پہن کر گھر میں گھومتا پھرتا۔ وہ بہت بہادر، خوددار اور ملنسار تھا۔ لیکن اس کی حقیقی دوستی اسلامی، عسکری اور تاریخ کی کتابوں سے تھی۔ وہ مطالعے کا اس حد تک شوقین تھا کہ مجھ سے کئی مرتبہ ڈانٹ کھائی۔ میری تمنا تھی کہ وہ زیادہ وقت درسی

www.pdfbooksfree.pk

کتابوں کے مطالعے میں گزارے۔ لیکن جب بھی سمجھانے کی کوشش کی، تو اس نے ایک ہی جواب دیا ''ابا جان آپ کو اچھے نتائج چاہئیں، وہ آپ کو مل جائیں گے۔ آپ مجھ سے مطالعے کا شوق نہ چھینیے۔''

کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا کہ کہ ذرکی وجہ سے وہ کوئی نہ کوئی جنگی ناول لیے غسل خانے چلا جاتا۔ کافی دیر تک نہ نکلتا، تو والدہ کو فکر لاحق ہوتی۔ وہ چوری چھپے دھیمی آواز میں فیصل کو نکلنے کا کہتی۔ جب وہ نکلتا، تو پسینے سے شرابور ہوتا۔ نکلتے ہی والدہ سے کہتا کہ تھوڑا سا ناول رہ گیا تھا، وہ بھی پڑھ لینے دیتیں۔ نسیم حجازی کے ناول، فیصل ضیا گھمن شہید کے پسندیدہ ناول نگار تھے۔ ان کے تمام ناول اور کردار اسے ازبر ہو گئے تھے۔ وہ چھوٹے بھائیوں سے ناولوں کے کرداروں کی جرأت و بہادری پر اکثر بحث کرتا۔

حضرت خالدؓ بن ولید، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم اس کے پسندیدہ مسلمان جرنیل تھے۔ وہ اکثر کہتا کہ جب بھی قدرت نے موقع دیا، تو میں بھی ان کی طرح کے کارنامے انجام دوں گا۔ اس کی آنکھوں میں خاص چمک تھی۔ وہ نہ صرف اچھا قاری بلکہ بہترین لکھاری بھی تھا۔ اپنی ڈائری روزانہ لکھتا جس میں دوران تربیت کے واقعات تفصیل سے درج کرتا۔

شہید کے والد مزید بتاتے ہیں کہ فیصل عام بچوں کی طرح بھارتی فلموں اور گانوں کا شوقین نہیں تھا بلکہ فارغ وقت مطالعے ہی میں گزارتا۔ ایک ذمے دار بیٹا تھا۔ اس کے ذمے جو کام لگایا جاتا، وہ نہایت خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچاتا۔ وہ میرا بیٹا تھا اور دوست بھی۔ فوج میں شمولیت کے بعد ذمے داری کا احساس اس کی شخصیت کا خاصہ رہا۔ فیصل کو سفارش سخت ناپسند تھی۔ وجہ یہ کہ اس سے حق دار کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اسکول سے لے کر فوج میں جانے تک ہر امتحان کا سامنا فیصل نے ازخود کیا اور کسی جگہ میری سفارش نہیں لی۔ فوجیوں کی زندگی حق تلفی اور ناانصافی ختم کرنے کے لیے ہی وقف ہے۔ فوج میں اگر کوئی سفارش کا سہارا لے، تو وہ اپنے عظیم مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔

میجر ضیا قادر بتاتے ہیں ''میں گزشتہ ۲۳ سال سے سگریٹیں پینے کے باعث سگریٹ نوشی کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن فیصل نے یہ کہہ کر میرے سگریٹ چھڑوا دیے ''ابو تمباکو نوشی اچھی بات نہیں۔'' میں نے پھر آج تک سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا حالانکہ میں بیٹے فیصل کا کہا ٹال بھی سکتا تھا۔ کجانے بیٹے کی نصیحت میں کیا مصلحت پنہاں تھی کہ میں اس سے صرف نظر نہیں کر سکا۔ میرا بیٹا بہت ذہین تھا، ہمیشہ ہر امتحان میں اوّل آتا۔ شہادت کا جام پی کر بھی اس نے عسکری امتحان میں اوّل پوزیشن لی جس پر بلاشبہ مجھے فخر ہے۔

شہید کی والدہ کا کہنا ہے ''بے شک شہادت عظیم اعزاز ہے جو ہمیں فیصل کی بدولت حاصل ہوا۔ میں جب فیصل شہید کی تصویر پہ نگاہ ڈالوں، تو اس کی آنکھیں اور ہونٹ ہلتے محسوس ہوتے ہیں۔ شاید وہ مجھے یہ کہتا ہے کہ امی جان! میں جنت میں بہت خوش و خرم ہوں اور مجھے وہاں کوئی تکلیف نہیں۔ اس کی جدائی ناقابل برداشت ہے۔ لیکن یہ سوچ کر مجھے تسلی ہوتی ہے کہ بیٹے نے بھی کشمیری مسلمان بہنوں اور ماؤں کی آبرو بچانے کے لیے اپنی جان دی۔ میرے خاندان کے کئی لوگ فوج میں موجود ہیں۔ لیکن گھمن خاندان کا یہ پہلا شہید ہے جسے ستارۂ جرأت کے اعزاز سے نوازا گیا''۔ یہ نشان حیدر کے بعد سب سے بڑا فوجی اعزاز تصور کیا جاتا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

جن دنوں صوبہ بہار میں زلزلہ آیا میں آسام کی ایک غیر معروف ریاست میں بحیثیت انجینئر ملازم تھا۔ زلزلے کے بعد امدادی کام شروع ہوا، تو میں نے بھی ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ ریاست کا وزیر بارسوخ شخص تھا۔ اس کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ چناں چہ مجھے ملازمت مل گئی۔ میرا کام تسلی بخش تھا۔ جلد ہی مجھے ایگزیکٹو انجینئر بنا کر موتی ہاری بھیج دیا گیا۔

اس جگہ پہلی مرتبہ قدرت کی تباہ کاریاں دیکھنے کا موقع ملا۔ دفتر میری کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ دفتر کی عمارت ابھی زیر تعمیر تھی۔ تین چار کمرے ہمارے تصرف میں تھے۔ سوائے میرے کمرے کے باقی کمروں میں سفیدی بھی نہ ہوئی تھی۔ فرش کی بھدی اینٹیں چھپانے کے لیے دری بچھا دی گئی۔ میرے کمرے میں دو بڑی کھڑکیاں اور دروازے تھے۔ ایک دروازہ بڑے کمرے میں کھلتا جہاں کلرک کام کرتے تھے۔ اس وقت چپراسی کے علاوہ عملے میں آٹھ کے قریب دیگر ملازمین بھی شامل تھے۔

جب با اصول اور عزت دار نے کیا

ایک روپے کا سوال

انسان دوستی اور لافانی محبت کے خمیر سے گندھی طرح دار کہانی

بلونت سنگھ

www.pdfbooksfree.pk

زلزلے نے جہاں ایک طرف خاندان کے خاندان تباہ اور بدحال کر دیے، وہاں بیکاروں کے لیے روزی کے دروازے بھی کھول ڈالے۔ کئی اشخاص کے لیے یہ سانحہ دولت و شادمانی کا مژدہ لایا۔ جب شام کو ہم لوگ سیر کرنے نکلتے، تو جگہ جگہ دھرتی ماتا کو نہنگ کی طرح منہ کھولے پاتے۔ بچے حیرت سے ان اتھاہ دراڑوں میں جھانکتے۔

سردیوں کی ایک صبح میں دفتر پہنچا، تو رگوناتھ نے کاغذوں کا بڑا سا پلندا میرے سامنے رکھ دیا۔ پچھلی شام میں دورے سے واپس آیا تھا۔ تین چار دن کے کاغذات جمع ہو گئے تھے۔ پہلے رگھوناتھ کاغذات رکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا، لیکن آج وہ ہاتھ سہلاتا میری میز کے قریب ہی کھڑا رہا۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ مجھے کچھ کہنا چاہتا ہے، میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری ذہنی کش مکش میں مبتلا ہے۔

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے چپراسی خبر لایا کہ پنڈت دیوی دیال اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں اس چاپلوس شخص سے ملنا نہیں چاہتا تھا، لیکن میری غیر حاضری میں وہ کئی مرتبہ گھر چکر لگا چکا تھا۔ بچوں کے لیے پھل اور مٹھائی بھی دے گیا تھا۔ میں نے بلوا لیا، اس پر رگھوناتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دیوی دیال سینما کے ''پاس'' لایا تھا۔ وہ شہر کا متمول رئیس تھا۔ اس کے باوجود وہ میری اتنی چاپلوسی کر رہا تھا کہ جی چاہا، دھکے دے کر باہر نکلوا دوں۔ میری بے اعتنائی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے دُوراز کار اشاروں سے اپنا مدعا بیان کیا، وہ چاہتا تھا کہ میں ٹھیکیداروں سے اس کے بھٹے کی اینٹوں کی سفارش کروں۔

صاحبِ تحریر

ہندوستان کے جن غیر مسلم قلم کاروں نے اردو افسانہ کو پروان چڑھایا، ان میں بلونت سنگھ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۶ء میں چل بسے۔ آپ نے پنجاب کے رسوم و رواج، روایات اور معاشرتی زندگی کو نہایت خوبی سے اپنے افسانوں میں موضوع بنایا۔ وہ انسانی نفسیات کی مختلف کیفیات کو افسانوں میں چابک دستی سے بیان کرتے تھے۔ خوددار ان کے فن کا نمائندہ افسانہ ہے۔

میرا دھیان رگھوناتھ کی طرف تھا۔ وہ ہمارے عملے میں سب سے معمر شخص تھا بلکہ دوسرے تو سب نوجوان تھے۔ دسویں پاس اسٹینوگرافر، نشست و برخاست میں سلیقہ مند، بات چیت میں ہوشیار، مجھے رگھوناتھ پر ہی بھروسا تھا۔ وہ ہمیشہ رک رک کر دھیمی آواز میں بات کرتا۔ اُسے دیکھ کر لگتا کہ وہ ایک ذمے دار شخص ہے۔ اسی وجہ سے اسے کام بھی زیادہ کرنا پڑتا۔

ملازمت کے لیے وہ براہ راست مجھے ملنے آیا تھا۔ اس دن دوپہر کھانا کھانے کے بعد قیلولے کے لیے پلنگ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ نوکر نے رگھوناتھ کا ملاقاتی کارڈ لا کر دیا۔ میں نے اس کی بے وقت آمد کو محسوس کیا۔ نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ ملازمت لینے آئے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ دفتر میں ملیں۔

اتفاق کی بات اس وقت میں ڈرائنگ روم میں ایک

www.pdfbooksfree.pk

کتاب لینے گیا۔ سونے سے پہلے کسی رسالے یا کتاب کی ورق گردانی کرنا میری عادت سی ہوگئی تھی۔ کھڑکی میں سے مجھے رگھوناتھ واپس جاتا دکھائی دیا۔ کھدر کا نیل لگا ہوا پائجامہ، انگلش ٹوپی کا پرانا گرم کوٹ اور سر پر کالے رنگ کی گول ٹوپی۔ گھٹنے کے قریب اس کے پائجامے میں ابھار سا پیدا ہوگیا تھا۔ اسے دیکھ کر خیال آیا، بیچارا بوڑھا شخص ہے، اس کو بلا لینا چاہیے۔ چناں چہ نوکر بھیج کر بلوالیا۔

جب اس کے چہرے خصوصاً نیچے کو لٹکتی سفید مونچھوں پر نگاہ ڈالی، تو مجھے اپنا جواب یاد کر کے افسوس ہوا۔ اس نے آتے ہی بے موقع آمد پر معذرت چاہی۔ وہ میرا زیادہ وقت خراب نہیں کرے گا۔ وہ نوکری کے لیے آیا تھا اور ٹائپ کرنا جانتا تھا۔ ہر قسم کی کارروائی نیز دفتری خط کتابت میں اس کا کافی تجربہ تھا۔

میں نے اسے شام تک بٹھائے رکھا۔ وہ اسی جگہ کا باشندہ تھا۔ میں اس سے مختلف باتیں پوچھتا اور اس کے چشم دید واقعات کے حالات بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ باتوں باتوں میں، میں نے اس کے ذاتی حالات بھی معلوم کر لیے۔ پہلے وہ متمول شخص تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ سب سے بڑا وٹرنری ڈاکٹر کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت کرنے لگا۔ اس کے ملازم ہوجانے پر گھر والوں کو کچھ تسلی ہوئی۔ کیونکہ اس کی کمائی کا بیشتر حصہ بیٹوں کی تعلیم اور لڑکیوں کی شادیوں پر خرچ ہو چکا تھا.....

لیکن جب برے دن آئیں تو، آنکھ جھپکتے میں تقدیر کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ بھرا پرا گھر بری طرح تباہ ہوا۔ لڑکے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے۔ شادی شدہ لڑکیاں بھی والدین کو ملنے آگئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا، زلزلے نے یہ سازش کر رکھی تھی کہ گھر کے سب افراد کو یکجا کر کچل دیا جائے۔ قدرت کی ستم ظریفی، اب گھر میں رگھوناتھ کی نیم پاگل بیوی، بیوہ بہن اور اس کا تین سالہ پوتا رہ گئے تھے۔ صرف بڑا لڑکا بچا، لیکن وہ بھی دق میں مبتلا ہو کر گھر پہنچا۔ باپ نے رہی سہی پونجی اس پر خرچ کردی، لیکن موت کے چنگل سے نہ بچا سکا..... اس کی آپ بیتی سن کر میرا دل بھر آیا۔

شام کی چائے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا ''رگھوناتھ جی، اتنے مصائب جھیلنے کے بعد بھی آپ کا حوصلہ اور ثابت قدمی دیکھ کر میں آپ کی بہت عزت کرنے لگا ہوں۔''

وہ اپنی چھڑی سے زمین کریدنے لگا۔ ''نوازش ہے جناب کی.....'' قدرے سکوت کے بعد مجھ سے نظر ملانے سے کتراتے ہوئے بولا..... ''لیکن میرا حافظہ کچھ کمزور ہو گیا ہے..... میں بھول جاتا ہوں کئی باتیں.....''

وہ رخصت ہوا، تو میں دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

میری سفارش پر وہ دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر ہوگیا۔ اس کی موجودگی میرے لیے اطمینان کا باعث تھی، مجھے تسلی اس بات کی تھی کہ دفتر میں کم از کم ایک ذمے دار شخص موجود ہے۔ چونکہ میں خود محنتی اور ذمے دار شخص ہوں، اسی لیے اس قسم کے اشخاص کو پا کر ہمیشہ خوشی محسوس کرتا ہوں۔ غیر ذمے دار کلرکوں کا مجھے بہت تلخ تجربہ تھا۔ کئی بار مجھے رگھوناتھ سے مشورہ بھی لینا پڑا۔ بارہا ایسا ہوا کہ ضروری کام پڑنے پر میں اطمینان کے ساتھ دورے پر چلا جاتا۔ میری غیر حاضری میں دفتر کے کام میں گڑبڑ نہ ہوئی۔

رگھوناتھ کی بعض حرکتوں سے میرا دل بہت متاثر ہوتا۔ مثلاً اس کے کوٹ کا کالر گردن کے قریب پھٹ گیا تھا۔ وہ قمیص کا کالر اس پر چڑھا اسے چھپائے رکھتا۔ کبھی

www.pdfbooksfree.pk

ایسا بھی ہوتا کہ فائل لیے میرے کمرے کی طرف بڑھتا۔ پردے کے قریب پہنچ کر ایک دم رُک جاتا۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس وقت وہ کوٹ کے کالر پر قمیص کا کالر چڑھا رہا ہے..... کبھی کبھی بوسیدہ کف کوٹ سے باہر نکل آتے۔ وہ زخم چھپاتے کبوتر کی طرح انگلیوں سے کف کو کوٹ کے بازو کے اندر کر دیتا۔ ہر چند وہ یہ حرکتیں اس انداز سے کرتا کہ مجھے پتا نہ چلے، لیکن میری متجسس نگاہوں سے کوئی حرکت پوشیدہ نہ تھی۔

دیوی دیال باتیں کیے جا رہا تھا لیکن میرا دھیان دوسری طرف تھا۔ چناں چہ جس قدر جلد ہو سکا، میں نے اس کو ٹالا۔ پھر تھوڑی دیر تک رگھوناتھ کا منتظر رہا، لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ دو تین مرتبہ بنا بیاس چپراسی سے پانی منگوا کر پیا۔ کھڑکی کے آگے کھڑا لمبے لمبے کش لیتا رہا تاکہ رگھوناتھ کو معلوم ہو جائے، میں اتنا مصروف بھی نہیں، وہ چاہے، تو آ کر مجھ سے بات کر لے۔ اس کے بعد کچھ دیر کاغذات دیکھتا رہا..... کھانا بھی دفتر ہی میں منگوایا لیکن وہ نہ آیا۔

شام کو دفتر کا وقت ختم ہو جانے پر عملہ میری روانگی کا منتظر تھا۔ میں نے چپراسی کی زبانی کہلوا دیا کہ وہ میرا انتظار نہ کریں۔ کھڑکی میں سے ان لوگوں کو ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیروں کے قریب سے ہو کر جاتے دیکھتا رہا۔ وہ اسکول کے لڑکوں کی طرح ایک دوسرے پر لپکتے جھپٹتے چلے جا رہے تھے لیکن ان میں رگھوناتھ شامل نہ تھا۔ چپراسی نے بتایا کہ وہ ابھی کام کر رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد رگھوناتھ اندر آیا۔ میں نے قلم ایک طرف رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا ''کیا آپ کا کام ختم نہیں ہوا؟ آج آپ نے دوپہر کے وقت بھی آرام نہیں فرمایا..... اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے.....''

میں جواب میں ہنس پڑا۔ معمول کی نسبت زیادہ بے تکلفانہ انداز میں بولا: ''آپ بزرگ ہیں، خدمت کرنا تو ہمارا فرض ہے..... آپ ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے؟ اگر کچھ کام باقی رہ گیا ہو، تو کل کر لیجیے۔''

''جی بس اب چلا جاؤں گا..... آپ، کیا آپ ابھی تشریف رکھیں گے؟''

''جی ہاں میں ایک صاحب کا منتظر ہوں۔''

رگھوناتھ ادھر اُدھر بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا ''آپ باہر لان میں بیٹھنا پسند کریں گے؟ کہیے تو کرسیاں نکلوا دوں۔''

میں رگھوناتھ کے روبرو زیادہ افسرانہ شان کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ کچھ اس لیے اور کچھ اپنی عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ کبھی کبھی پدرانہ لہجے میں باتیں کرنے لگتا تھا۔

''نہیں رگھوناتھ جی، میں ذرا یہ کاغذات دیکھوں گا۔''

قیاس سے معلوم ہوتا تھا، وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کچھ تذبذب میں تھا۔ وہ دفتر کی نامکمل عمارت، فرنیچر، ٹھیکیداروں، ایک حد سے زیادہ رشوت خور اوورسیئر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے کچھ کہنے کے انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں ہمہ تن گوش تھا..... ''اچھا..... تو..... اگر آپ اجازت دیں..... میں جا سکتا ہوں۔''

میں مایوس سا ہو گیا۔ ''ضرور ضرور.....'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔

اس نے کھانس کر چھڑی اٹھائی۔ ٹوپی سر پر درست کرتے ہوئے وہ رک رک کر دروازے کی طرف بڑھا۔

''رگھوناتھ جی!''

''جی'' وہ واپس چلا آیا۔ اور میرے سامنے میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ ''کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر یونہی کمرے کے کونے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں سے مبہم سی آواز نکلی۔

''کہیے نا۔''

''میں..... میں.....'' اس نے اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔ ''مجھے.....''

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''رگھوناتھ جی آپ کرسی پر تشریف رکھیے۔ کوئی حرج نہیں، تشریف رکھیے۔''

وہ بیٹھ گیا۔ مجھے منتظر پاکر وہ آہستہ سے بولا ''میں بہت شرمسار ہوں۔''

میں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ''رگھوناتھ جی! آج تو آپ نے تکلف کی حد کردی..... توبہ!''

لاٹھی سے فرش بجاتے ہوئے وہ بڑی جرأت سے کام لے کر بولا۔ ''مجھے ایک روپیہ درکار ہے.....''

''ایک روپیہ؟'' میں نے حیرت سے نسبتاً بلند آواز میں پوچھا۔

اس نے پھر میری طرف اچٹتی نظر سے دیکھا۔ شاید وہ میرے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اس نے دھیمی آواز میں کہا ''شاید آپ کو یاد ہو۔ آپ نے مجھ سے ایک روپیہ لیا تھا۔ یہ تین ساڑھے تین مہینے پہلے کی بات ہے.....''

ایک روپیہ؟..... وہ کب؟ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ میرے چہرے پر غور وخوض کے آثار دیکھ کر اس نے پھر کہا۔ ''اس دن بینک کا چپراسی آیا تھا۔ آپ کے پاس دس سے کم کا نوٹ نہیں تھا۔ آپ نے پھر مجھ سے ایک روپیہ لیا تھا۔ یہ بھی ہدایت کی تھی کہ اگر آپ کو یاد نہ رہے، تو میں آپ کو یاد دلا کر روپیہ واپس لے لوں۔'' وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔ ''اور میں نے جواب میں کہا تھا کہ ایک روپیہ بھی کوئی بڑی رقم تھی جو میں یاد دلاتا پھروں..... سچ پوچھیے تو میں بھول چکا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں، میرا حافظہ کمزور ہو چکا..... لیکن کل شام مجھے نہ معلوم کس طرح یہ بات یاد آگئی۔ مجھے امید ہے آپ بھولے نہیں ہوں گے۔''

مجھے یاد آگیا۔ رگھوناتھ پر مجھے بے اعتمادی نہیں تھی۔ افسوس اس امر کا تھا کہ میں روپیہ واپس کرنا بھولا کیوں؟ وہ روپیہ..... لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے واپس کر دیا تھا، اسی دن شام کو۔ یقیناً میں نے واپس کر دیا تھا۔

رگھوناتھ اس جرأت کے لیے معذرت کرتا رہا۔ میں نے چپکے سے اپنی نوٹ بک نکالی۔ لکھا تھا، اکتوبر کی سات تاریخ کو رگھوناتھ سے ایک روپیہ لیا گیا۔ میں نے یادداشت کے لیے نوٹ بک پر لکھ لیا تھا۔ اسی شام کو روپیہ واپس کرنے کے بعد میں نے اس کے آگے انگریزی میں نوٹ لکھ دیا۔

میں اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں ایسا غیر ذمے دار اور بے اصول شخص نہیں کہ اس کا روپیہ لے کر بھول جاتا۔ ''رگھوناتھ جی میں نے وہ روپیہ.....''

''میں پھر دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔ باور فرمائیے، شرم کے مارے میری نظر نہیں اٹھتی..... ضرورت ہی کچھ ایسی آن پڑی ورنہ میں ایک روپیہ کے لیے تقاضا نہ کرتا۔''

میں خاموش ہو گیا۔ رگھوناتھ پانی پانی ہوا جاتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

بارگاہِ ایزدی میں مناجات

تیرے در پہ جب کوئی بھولا بھٹکا بندہ آتا ہے
فضل و کرم تیرا ہی اس کو سیدھی راہ دکھلاتا ہے

خالق کا مخلوق سے اپنی رشتہ بڑا پرانا ہے
پالن ہار ہے خلقت کا وہ سارے جگ کا داتا ہے

تجھ کو اپنے دل کا سارا حال سناتے رہتے ہیں
تیرے وہ بندے کہ جن کا تجھ سے سچا ناتا ہے

غم کے اندھیاروں کے اندر رستہ جب کھو جاتا ہے
بھولے بھٹکے راہی کو پھر منزل تو دکھلاتا ہے

دنیا کے آلام کے ہاتھوں جو کوئی ہمت ہار گیا
لطف و کرم تیرا ہی مولا اس کی آس بندھاتا ہے

لے لیتی ہے رحمت تیری اس کو اپنے ہاتھوں میں
جو کوئی تیری یاد میں چپکے چپکے نیر بہاتا ہے

جل تھل کر دیتی ہے تیری رحمت دنیا والوں کو
نیلی چھت کی چھتری سے جب اپنا مینہ برساتا ہے

یوں تو تیری قربت سے محروم کوئی انسان نہیں
ڈھونڈنے والا سچے دل سے تجھ کو آخر پاتا ہے

خادم بھی رہتا ہے ہر دم طالب تیری بخشش کا
ورنہ بے حد وزنی اس کی بدعملی کا کھاتا ہے

(خادم بلاغوی، اسلام آباد)

اس کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ مارے ندامت کے زمین میں سما جانا چاہتا ہو۔

''نہیں نہیں رگھوناتھ جی، معمولی بات ہے۔'' یہ کہہ کر میں مسکرایا اور کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ ''شرمندہ تو میں ہوں۔ معافی کا طلب گار، تو مجھے ہونا چاہیے۔''

شکر گزاری کے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگے۔ ''آپ سے کیا چھپانا..... کل سے روٹی نہیں پکی..... آٹا ختم ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی میری عادت نہیں..... بس یہ تھی اصل بات..... ورنہ ایک روپیہ کی حیثیت کیا..... میں ہرگز آپ کو اس کی یاد نہ دلاتا۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آپ کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے..... میرا مطلب ہے تنخواہ ملنے پر واپس دے دیجیے گا۔''

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ ''میں نے آپ کو گھر کی حالت اس لیے بتائی کہ آپ ایک روپیہ کے لیے تقاضا کرنے پر مجھے اوچھا اور نیچ نہ سمجھنے لگیں۔'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جو میں عمر بھر نہیں بھلا سکتا۔ ''میں ایک با اصول اور عزت دار شخص ہوں۔ اگرچہ یہ گستاخی ہے کہ آپ مجھ پر عنایت فرمانا چاہیں اور میں انکار کروں۔ لیکن میں نے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا نہ ایک کوڑی کا قرضدار بننا منظور کیا۔ اس لیے آخری عمر میں بھی اپنے اصول سے گرنا نہیں چاہتا.....''

میں نے چپکے سے ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ پھر پیشانی سے پسینا پوچھتا پردہ ہٹا لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گیا۔

●●●

www.pdfbooksfree.pk

سائنس و ٹیکنالوجی کی مدد سے

انسان ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے؟

ان نرالے انسانوں کی تحیر خیز کہانی جو سائنسی تجربوں کے سہارے لافانی حیات کا خزانہ پانے نکلے ہیں

سید عاصم محمود

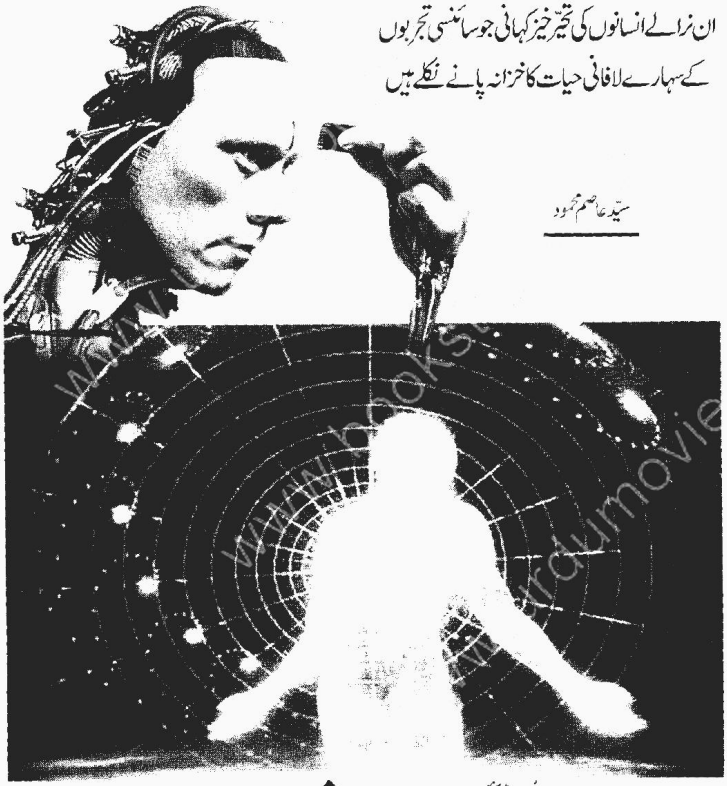

روایت ہے، یونانی سپہ سالار اسکندر اعظم ہمیشہ کی زندگی پانا چاہتا تھا۔ چناں چہ وہ ''آب حیات'' کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، یعنی ایسا پانی جسے پی کر وہ ہمیشہ کی زندگی پا سکے۔ دوران سفر اسے حضرت خضرؑ مل گئے۔ لہٰذا وہ اکٹھے سفر

www.booksfree.pk
www.urdumovie

www.pdfbooksfree.pk

کرنے لگے۔ چلتے چلتے وہ بحرِظلمات پہنچے جہاں سورج کی روشنی کا کوئی گزر نہ تھا۔

اسکندر اعظم تو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگا، لیکن حضرت خضرؑ اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی کے باعث آب حیات تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے پھر آب حیات نوش کیا اور ہمیشہ کی زندگی پائی۔ گویا اب حضرت خضرؑ تاقیامت زندہ رہیں گے۔

یہ تو صدیوں پرانی روایت تھی۔ مگر دورِ جدید کا انسان بذریعہ سائنس ہمیشہ کی زندگی پا لینے کے لیے بھرپور جدوجہد کر رہا ہے۔ بعض سائنس دانوں کی کوشش ہے کہ وہ ایسی کمپیوٹر نما مشین ایجاد کر لیں جس میں انسانی روح سما سکے۔ دیگر ماہرین طب ایسی ادویہ بنانا چاہتے ہیں جو انسان کی عمر زیادہ سے زیادہ بڑھا سکیں۔ اس جدوجہد میں اب محققوں کو نامی گرامی اور امیر شخصیات کی مدد حاصل ہو رہی ہے۔

بڑھاپا ختم کرنے والی ادویہ کی تیاری جاری ہے

مثال کے طور پر امریکی کمپنی، پے پال (Pay pal) کے شریک بانی، کھرب پتی پیٹر تھیل کو لیجیے۔ وہ کم از کم ۱۲۰ سال تک زندہ رہنا چاہتا ہے۔ گوگل کا کھرب پتی افراد کے مقابلے میں اس کی تمنا خاص نہیں لگتی۔ روسی انٹرنیٹ کا ''گاڈ فادر'' دیمتری اسکلوف ایک ہزار سال تک زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ مشہور امریکی سافٹ ویئر کمپنی، اوریکل کے شریک بانی، لیری ایلیسن کو یقین ہے کہ مستقبل میں انسان لافانی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ گوگل کا شریک بانی، سرگئی برن بھی ''موت سے دو دو ہاتھ'' کرنے کی آرزو رکھتا ہے۔

دنیا کی امیر ترین ہستیوں میں شامل یہ شخصیات مذاق نہیں کر رہیں اور نہ ہی ان کی باتیں مضحکہ خیز ہیں۔ وجہ یہی کہ کئی ماہرین طب ایسی تحقیقات میں محو ہیں جو مستقبل میں زندگی اور موت کے معنی ہی بدل ڈالیں گی۔

لافانی حیات کی تلاش

ہزارہا سال قبل جب باشعور انسان کا ارتقا ہوا اور وہ عقل و تدبر پا کر آدمی بنا، تو اس کے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا..... ہمیشہ کی زندگی کیونکر پائی جائے۔ وہ کون سا طریقہ ہے کہ انسانوں کو موت نہ آئے اور انھیں لافانی حیات مل جائے۔

تاریخ افشا کرتی ہے کہ مختلف چینی ریاستیں فتح کر کے مملکت چین کی بنیادیں رکھنے والا پہلا بادشاہ، قن شی ہوانگ بھی ہمیشہ کی زندگی چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے حکیموں و وزیروں کو ''آب حیات'' ڈھونڈنے کا حکم دیا۔

اس زمانے میں پارہ (Mercury) دریافت ہوا، تو اسے جادوئی مادہ سمجھا گیا۔ چناں چہ حکیموں نے پارے سے گولیاں بنائیں اور چینی بادشاہ کو یہ کہہ کر کھلا دیں کہ ان کے ذریعے وہ لافانی انسان بن جائے گا۔ مگر ۱۰ اگست ۲۱۰ قبل مسیح کو قن شی صرف پچاس سال کی عمر میں عالم بالا جا پہنچا۔ یوں وہ لافانی حیات پانے کی تمنا کا پہلا مشہور شکار بنا۔

www.pdfbooksfree.pk

رفتہ رفتہ انسان ترقی کے مدارج طے کرنے لگا، مگر ہمیشہ کی زندگی پانے کا خیال اس کے دامن سے وابستہ رہا۔ کیتھولک عیسائیوں کا ۲۱۳ واں پوپ، انوسینٹ ہشتم بھی لافانی حیات کا طلبگار تھا۔ اس نے ایک یہودی ڈاکٹر، گیا کوموڈی سان سے مشورہ کیا۔

ڈاکٹر گیا کومو نے اسے مشورہ دیا کہ وہ تین نو دس سالہ لڑکوں کا خون پیے۔ یوں ان لڑکوں کی جوانی اس میں منتقل ہو جائے گی۔ وہ جوان تو کیا ہوتا، انسانی خون نے اس کے جسم میں زہریلے اثرات پیدا کر ڈالے۔ چناں چہ ۲۵ر جولائی ۱۴۹۲ء کو وہ چل بسا۔

۱۸۶۸ء میں امریکا میں حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ ریاست کنکٹی کٹ کے ایک سیاست داں، لیونارڈ جونز نے امریکی صدارتی انتخابات میں حصہ لیا۔ جونز نے انتخابی مہم اس بنیاد پر چلائی کہ وہ عبادت کر کے اور بھوکا رہ کر ہمیشہ کی زندگی پا چکا۔ اگر امریکی عوام نے اسے صدر منتخب کیا، تو وہ لافانی حیات پانے کے گُر انھیں بھی بتا دے گا۔ افسوس کہ امریکیوں نے اسے منتخب نہیں کیا..... اور اگلے ہی سال بچارا نمونیے سے چل بسا۔

ان لرزہ خیز تاریخی حقائق کے باوجود دور جدید کے بعض کھرب پتی ہمیشہ کی زندگی پا کر ہر قیمت پر اپنے خوابوں کی تکمیل چاہتے ہیں۔ اسی لیے پیٹر تھیل نے حال ہی میں ایک غیر منافع بخش تحقیقی ادارے، میتھوزلا (Methuselah) فاؤنڈیشن کو ۳۵ کروڑ روپے (۳۵ لاکھ ڈالر) کی خطیر رقم عطیہ کی۔ اس امریکی ادارے سے منسلک سائنس داں ایسی ادویہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو بڑھاپا پیدا کرنے والی سات جسمانی وجوہ کا خاتمہ کر سکیں۔ یہ وجوہ درج ذیل ہیں:

خلیوں کی کمی، خلیوں کا حد سے زیادہ تقسیم ہونا (Excessive Cell division)، خلیوں کا بے وقت مر جانا، خلیوں میں کوڑا کرکٹ بھرنا، خلیوں کے باہر فضلہ جمع ہونا، مائٹو چونڈریا (Mitochondria) یعنی خلیے کے بجلی گھر میں تبدیلیاں اور خلیوں کے سالمات (Molecules) میں بڑھتا تال میل۔

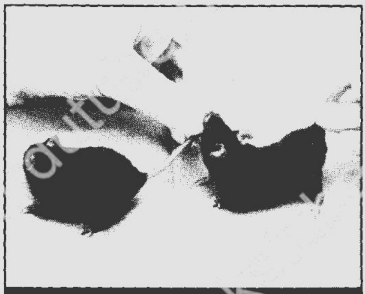
چوہوں کے تجربے سے بڑھاپا روک پروٹین، جی ڈی ایف ۱۱ دریافت ہوا

میتھوزلا فاؤنڈیشن کے محققوں اور دیگر ماہرین طب کا خیال ہے کہ انسانی جسم ایک مشین کی طرح ہے۔ لہٰذا وہ ایک ڈھانچا رکھتا ہے تاکہ روزمرہ کے تمام فعل بخوبی انجام دے سکے۔ جب اسی ڈھانچے کے کل پرزے استعمال سے ناکارہ ہو جائیں، تو وہ بکھر جاتا ہے..... گویا موت انسان کو آن دبوچتی ہے۔ لیکن ادویہ کی مدد سے خلوی و سالماتی سطح پر اس ڈھانچے کی مرمت کر دی جائے، تو وہ پھر صحیح طرح کام کرنے لگے گا۔ گویا انسان کو نئی زندگی مل جائے گی۔

لیکن سرگئی برن کے کالیکو (Calico) کمپنی منصوبے کے سامنے میتھوزلا فاؤنڈیشن کی تحقیق معمولی دکھائی دیتی ہے۔ یہ کمپنی ادویہ ساز امریکی ادارے، ایبوی (Abbvie) کے تعاون سے ''بڑھاپا روک دوا''

www.pdfbooksfree.pk

بنانا چاہتی ہے۔ اور سرگئی برن اس منصوبے پہ ''کھربوں روپے'' (اربوں ڈالر) خرچ کرنے کو تیار ہے۔

گوگل کے مالکان اپنے منصوبے بہت خفیہ رکھتے ہیں۔ تاہم امریکی میڈیا یہ جاننے میں ضرور کامیاب رہا کہ کالیکو کے سائنس داں فوکس او۳ (Fox03) نامی جین جیسا اثر رکھنے والی دوا ایجاد کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جن انسانوں میں درج بالا جین ہو، وہ طویل عمر پاتے ہیں۔ گویا فوکس او۳ کا اثر رکھنے والی دوا کھا کر یہ انسان اپنی عمر بڑھا سکے گا۔

امریکا اور یورپ میں کئی ادارے انسان کو لافانی بنانے والے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں امریکی ادارے ''گلین فاؤنڈیشن فار میڈیکل ریسرچ'' کو تمام اداروں میں ممتاز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۶۵ء میں امریکی سرمایہ دار، پال گلین نے قائم کیا تھا۔

۲۰۰۷ء سے گلین فاؤنڈیشن ہر سال ان محققوں میں بذریعہ ''گلین ایوارڈ'' ساٹھ لاکھ روپے تقسیم کرتی ہے جو بڑھاپا روک ادویہ پر مفید کام کر رہے ہیں۔ یہی ادارہ ایک اور ادارے، ایلسین میڈیکل فاؤنڈیشن سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ دونوں ادارے ان سائنس دانوں کو کھلے دل سے امداد دیتے ہیں جو موت کو شکست دینے والی ٹیکنالوجی تیار کرنے پر جتے ہیں۔

تھری ڈی پرنٹر میں بننے والا مصنوعی انسانی کان

ایک انوکھا تجربہ

۱۹۵۶ء میں ایک امریکی سائنس دان، کلائیو میکے نے کارنیل یونیورسٹی کی لیبارٹری میں خاصا بھیانک تجربہ کیا۔ اس نے دو چوہے لیے اور انھیں بذریعہ آپریشن پہلو کی جانب سے باہم سی دیا، گویا انھیں جڑواں بنا ڈالا۔ یوں وہ دونوں چوہوں میں خون کا نظام ملانا چاہتا تھا۔

اس تجربے کی خاصیت یہ تھی کہ ایک چوہا تو نوجوان، چونچال اور چست و چالاک تھا۔ جبکہ دوسرا بوڑھا، لاغر اور تقریباً مرنے کے قریب تھا۔ لیکن جوں ہی دونوں کا دوران خون مشترکہ ہوا، بوڑھے چوہے میں حیرت انگیز تبدیلیاں آنے لگیں۔ کھال پر سے جھریاں دور ہوئیں اور وہ نوجوان دکھائی دینے لگا۔ دوسری طرف نوجوان چوہے پر بڑھاپا چھا گیا۔

۱۹۵۶ء میں سائنس دان خون کی کیمیائی ہیئت کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ کلائیو میکے کا تجربہ حیرت افزا تھا، مگر وہ یہ نہیں جان سکا کہ بوڑھا چوہا کیونکر جوان ہوا۔ اسی لیے امریکی محقق نے حراروں (کیلوریز) کی تحقیق پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اسی تحقیق سے دریافت ہوا کہ جاندار کم حرارے کھائے، تو اس کی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تاہم خون کا تجربہ بھلا دیا گیا۔

اڑتالیس سال بعد ۲۰۰۴ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک محققہ، ایمی وینگرز نے کلائیو کے تجربے کی بابت پڑھا۔ ایمی بھی بڑھاپا روک ٹیکنالوجی پر تحقیق کر رہی تھی۔ اس

www.pdfbooksfree.pk

نے فیصلہ کیا، وہ بھی متوفی محقق کا تجربہ دہرا کر دیکھے گی کہ کیا نتیجہ پھر وہی نکلتا ہے۔

ایمی ویگیرز نے بھی نوجوان اور بوڑھے چوہوں کو پہلو سے سی دیا۔ یوں ان کا بھی دوران خون یکساں ہوگیا۔ اس تجربے کے ذریعے بھی بوڑھا چوہا چند ہی دنوں میں نوجوان بن گیا۔ جبکہ نوجوان چوہے پہ بڑھاپا چھانے لگا۔ ایمی نے چوہوں کے خون پر تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ جان سکے، کیا شے بوڑھے چوہے کو نوجوانی کا تحفہ عطا کرتی ہے۔

مختلف چوہوں پر تجربات کرنے کے بعد آخر ایمی نے ان کے خون میں ''جی ڈی ایف ۱۱'' (GDF-11) نامی پروٹین دریافت کیا۔ یہی پروٹین بوڑھے چوہے کو جوان بنا ڈالتا تھا۔ مزید تحقیق نے انکشاف کیا کہ یہ پروٹین بنیادی (Stem) خلیوں کو متحرک کرتا ہے۔

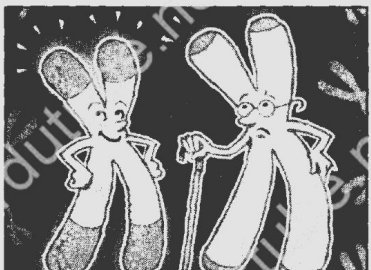
ٹیلومیٹر چھوٹے ہوجائیں، تو بڑھاپا آ چمٹتا ہے

دنیا کے ہر جاندار میں بنیادی خلیے ہی بافتوں (ٹشوز) کی مرمت کرتے ہیں۔ ایمی کو تحقیق سے پتا چلا کہ رفتہ رفتہ جاندار پر بڑھاپا چھائے، تو اس چوہے میں جی ڈی ایف ۱۱ کی مقدار گھٹ جاتی ہے۔ تب بنیادی خلیے بھی عمر رسیدہ ہوکر اپنا کام درست طریقے سے انجام نہیں دے پاتے۔ یوں بافتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور مرمت نہ ہونے کے باعث جاندار میں بڑھاپے کا آغاز ہوجاتا ہے۔

ایمی ویگیرز نے تحقیق جاری رکھی اور نت نئے انکشافات سامنے آتے گئے۔ معلوم ہوا کہ انسانی خون میں بھی جی ڈی ایف ۱۱ پروٹین ایک جین کی صورت پایا جاتا ہے۔ اور یہ کہ ایک چوہا یا انسان چاہے کتنا ہی بوڑھا ہوجائے، اس میں بنیادی خلیے موجود رہتے ہیں۔ گو جی ڈی ایف ۱۱ کی مقدار کم ہونے کے باعث وہ تقریباً بے اثر ہوجاتے ہیں۔

لیکن نوجوان خون جی ڈی ایف ۱۱ کی بھاری مقدار رکھتا ہے۔ اسی لیے جب بوڑھے چوہوں کو نوجوان خون ملا، تو جی ڈی ایف ۱۱ کی بھاری مقدار پا کر ان کے بنیادی خلیے دوبارہ متحرک ہوگئے۔ وہ پھر بافتوں کی مرمت کرنے لگے اور انھیں دوبارہ ''جوان'' بنا دیا۔ جب اعضا کی بافتیں جوان ہوئیں، تو چوہوں میں خود بخود شباب عود کر آیا اور وہ بڑھاپے کے دور سے نکل آئے۔ جی ڈی ایف ۱۱ کے کرشماتی کردار پر مزید تحقیق جاری ہے۔

۲۰۰۵ء میں امریکا کا مشہور سائنس داں، ڈاکٹر رونالڈ ڈی پنہو بھی بوڑھے چوہوں پہ تجربات کرنے لگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کن طبی طریقوں سے ان کا بڑھاپا روکنا ممکن ہے۔ ڈاکٹر رونالڈ کی دلچسپی کا مرکز ٹیلو میئر (Telomere) تھے۔ یہ ہر ڈی این اے کے اختتامی سرے ہیں، جیسے تسمے کے سروں پہ پلاسٹک باندھ کر انھیں بند کر دیا جاتا ہے۔

انسانوں اور جانوروں کے جسم میں ایک خامرہ (Enzyme)، ٹیلومیری (Telomerase) ٹیلومیروں کو صحت مند اور پائیدار رکھتا ہے۔ یوں ہر ڈی این اے انسانی بدن میں بخوبی اپنی ذمے داریاں انجام دیتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ لیکن بوڑھا ہونے پر جسم میں ٹیلومیرس کی مقدار گھٹ جاتی ہے۔ تب ٹیلومیئر بھی چھوٹے ہونے لگتے ہیں اور یوں ڈی این اے اپنا کام صحیح طرح نہیں کر پاتے۔ اسی خرابی سے بڑھاپے کی ظاہری خصوصیات جنم لیتی ہیں اور ڈاکٹر رونالڈ ڈی پنہوان کی وجہ جاننا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر رونالڈ نے اپنی ٹیم کے ساتھ جینیاتی طور پر ایسی چوہیا پیدا کی جس میں ٹیلومیرس خامروں کو حسب منشا بے حس یا سرگرم کرنا ممکن تھا۔ جب چوہیا نوجوان ہوئی، تو ایک دن ڈاکٹر رونالڈ نے اس کے بدن میں موجود سبھی ٹیلومیرسی خامروں کو بے حرکت کر دیا۔

جب ٹیلومیئروں کو اپنی خوراک نہیں ملی، تو وہ ناکارہ ہونے لگے۔ ان کی خرابی نے دیکھتے ہی دیکھتے چوہیا کو نوجوانی ہی میں بوڑھا کر دیا۔ اس کے بال جھڑ گئے، کھال لٹک گئی، دماغ سوکھ گیا اور ہڈیاں کمزور ہو گئیں۔ غرض وہ گور کنارے جا پہنچی۔

دیمتری اتسکوف اپنے ہولوگرام کے ساتھ

جب چوہیا مرنے کے قریب تھی، تو ڈاکٹر رونالڈ نے اس کے ٹیلومیرسی خامروں کو دوبارہ سرگرم کر دیا۔ بعدازاں جو کرشمہ ظہور پذیر ہوا، اس نے سبھی کو متحیر کر ڈالا۔ چوہیا کے مرجھائے اعضا پھر تندرست و توانا ہونے لگے۔ دماغ کی جسامت بڑھ گئی۔ بال بڑھے اور چمک دار ہو گئے۔ غرض بڑھاپے کی تمام نشانیاں دور ہو گئیں۔ گویا جانور کے جسم میں ٹیلومیرسی خامروں نے آب حیات جیسا کام کر دکھایا۔

سائنس داں اب جی ڈی ایف ۱۱ اور ٹیلومیرسی، دونوں پر مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ وہ اب انسانوں پر تجربات کر کے ان کے کمالات دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ یہ دونوں انسان کی عمر میں خاطر خواہ اضافہ کر دیں گے اور مستقبل کا انسان بیمار ہوئے بغیر طویل عرصہ زندہ رہ سکے گا۔

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسانوں میں غیر فطری طور پر جی ڈی ایف ۱۱ اور ٹیلومیرسی کی مقدار بڑھانے کی سعی ہوئی، تو وہ غیر معمولی امراض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ تاہم ڈاکٹر رونالڈ اور دیگر ماہرین طب نے ان خدشات کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ کامیاب تجربات نے ثابت کر دیا، سائنسی طور پر انسان کی عمر بڑھانا ممکن ہے۔ یہ اضافہ دو تین عشروں سے لے کر چند صدیوں تک محیط ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ماہرین طب کے جوش و جذبے میں اضافہ کر چکی۔ دوسری طرف طویل عمر کا خیال فلسفیوں کو دنگ کر دیتا ہے۔ ایک برطانوی فلسفی، مائیکل آسمتھ کا کہنا ہے:

''اگر انسان ۸۰ یا ۹۰ سال کے بجائے ۴۰۰ سو برس تک زندہ رہنے لگا، تو زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب آ جائے گا۔ تب ہمیں زندگی سے لے کر موت تک..... ہر شے کی نئے سرے سے تعریف کرنا ہوگی۔''

ایک تصور یہ ہے کہ اگر سائنس دانوں نے انسان کو دوبارہ نوجوان بنانے کا طبی طریقہ دریافت کر لیا، تو پھر کیا ہوگا؟ تب ہر انسان جیسے ہی بڑھاپے کی سرحد پر پہنچا، وہ

www.pdfbooksfree.pk

طبی طریقے کی مدد سے دوبارہ نوجوان ہو جائے گا۔ گویا اسے ایک طرح سے ہمیشہ زندہ رہنے کا لائسنس مل سکتا ہے۔ تب دل کا اچانک حملہ یا دماغی شریان پھٹنے ہی سے وہ ''بہ مشکل'' موت کے منہ میں پہنچے گا۔

تقریباً ہمیشہ کی یہ زندگی اپنے جلو میں مثبت اور منفی، دونوں قسم کے پہلو رکھے گی۔ مثال کے طور پر تب سبکدوشی کا عمل ختم ہو جائے گا۔ انسان صحت مند رہ کر تا عمر کام انجام دے گا۔ معاشرے میں بیمار اور بوڑھے نظر نہیں آئیں گے۔ شادیاں بھی کئی سو سال چلیں گی۔ غرض انسانی عمر میں اضافہ کئی تعجب خیز حقائق کا موجب بنے گا۔

ایک اور ندرت کی وجہ سے مستقبل میں انسان کو یہ فکر بھی نہیں رہے گی کہ اس کا خراب دل، گردے یا جگر اسے قبر میں دھکیل دے گا۔ وجہ یہ کہ اب ایک طرف لیبارٹریوں میں نامیاتی مادوں کے ذریعے انسانی اعضا ''اگائے'' جا رہے ہیں، تو دوسری سمت تھری ڈی پرنٹر میں جگر اور گردے تیار ہونے لگے ہیں۔ ماہرین کا تیسرا گروہ بنیادی خلیوں سے انسانی اعضا تیار کرنے میں لگا ہے۔ غرض مستقبل قریب میں انسانی اعضا کی اتنی کثرت ہو گی کہ جوں ہی کسی کا دل خراب ہوا، وہ بازار سے نیا خرید لے گا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے، بڑھاپے کو دور رکھنے کے لیے مستقبل کے انسان کو بہت پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ کبھی وہ اپنا جگر بدلوائے گا، تو کبھی گھٹنا! پھر اس پہ یہ خطرہ بھی منڈلاتا رہے گا کہ اگر وہ اسپتال سے دور ہوا اور یک دم دو سو سالہ دل جواب دے گیا، تو قصہ تمام!

درج بالا خرابیاں مدنظر رکھ کر بعض سائنس داں جسم کا بکھیڑا ہی ختم کرنا چاہتے ہیں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یعنی جسمانی ڈھانچے سے وابستہ ساری

غزل

تیری باتیں تیرے دن رات تو کچھ اور کہتے ہیں
میرے ہمدم ترے حالات تو کچھ تو اور کہتے ہیں

ہمارے سنگ رہنے کی تیری حسرت بجا لیکن
تیرے یہ خوبصورت ہاتھ تو کچھ اور کہتے ہیں

میں کیوں اخبار کی خبروں کو اب سچ مان لوں صاحب
میرے شہروں کے جب حالات تو کچھ اور کہتے ہیں

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اب بات کر ظالم
تیرے گزرے ہوئے لمحات تو کچھ اور کہتے ہیں

جو دن میں فلسفہ ہوتا ہے یارو شیخ صاحب کا
مگر پھر رات کو وہ بات تو کچھ اور کہتے ہیں

تیرے وعدوں کو میں اب کس طرح سچ مان لوں جاناں!
تیری باتیں، تیرے جذبات تو کچھ اور کہتے ہیں

بظاہر خوش نظر آتے ہیں یہ سب لوگ جو حسینؔ
سبھی پھر غمزدہ نغمات تو کچھ اور کہتے ہیں

حسنین اقبال منہاس، سبی، بلوچستان)

پریشانیاں ہی ختم ہو جائیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم منصوبہ ''۲۰۴۵ انشی ایٹو'' (2045 Initiative) ہے۔ اسے کھرب پتی روسی، دیمتری اسکوف کی مالی مدد حاصل ہے۔

۲۰۴۵ انشیٹو کی بنیاد چار سال قبل رکھی گئی اور اس منصوبے سے ماہرین کی متاثر کن تعداد منسلک ہو چکی۔ یہ ماہرین روبوٹکس اور دیگر جدید ترین سائنسی شعبوں سے

www.pdfbooksfree.pk

تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی منزل یہ ہے...... ۲۰۴۵ء تک انسانی دماغ کو گوشت پوست والے ڈھانچے سے نکال کر روبوٹ یا ہولوگرافک ہیولے میں مقید کر دیا جائے۔

درج بالا منصوبہ بظاہر کسی دیوانے کی بڑ لگتی ہے، مگر یہ اتنا بھی مضحکہ خیز نہیں۔ منصوبے کے پہلے مرحلے میں ماہرین ''مشین نما انسانی ڈھانچا'' (Artificial humanoid body) بنانا چاہتے ہیں جسے ''اوتار'' کہا جائے گا۔ ساتھ ہی ''ایڈوانسڈ برین کمپیوٹر انٹرفیس سسٹم'' بھی ایجاد کیا جائے گا۔ مدعا یہ ہے کہ انسانی دماغ اس انسانی ڈھانچے میں نصب ہو کر اس سے روزمرہ کے سارے کام کرائے۔

منصوبے کے دوسرے مرحلے میں ماہرین مصنوعی دماغ بنانا چاہتے ہیں۔ اس میں انسان کا شعور منتقل ہو گا۔ گویا مصنوعی دماغ کی ایجاد کے بعد انسان حقیقی طور پر ہمیشہ زندہ رہ سکے گا۔ اور یہ حیرت انگیز منزل زیادہ دور بھی نہیں۔

دنیائے کمپیوٹر کی دیوہیکل امریکی کمپنی، انٹل ۲۰۱۸ء تک ''ایکسا سکیل'' (Exascale) کمپیوٹر تیار کرنا چاہتی ہے...... ایسی غیر معمولی مشین جو انسانی دماغ جتنی رفتار سے کام کرے گی۔ یاد رہے، ہمارا دماغ ''فی سیکنڈ دو کروڑ ارب پیمائش'' کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے، اتنی زیادہ پیمائشیں کرنے کے لیے انتہائی ترقی یافتہ اور جدید ترین کمپیوٹر تخلیق کرنا پڑے گا۔

ایک اہم سوال

سائنس کی بے پناہ ترقی دیکھتے ہوئے یقینی لگتا ہے کہ پچاس، سو، دو سو سال بعد انسان کسی نہ کسی ذریعے سے زندہ جاوید صورت اختیار کر لے۔ تاہم یہ پریشان کن سوال اپنی جگہ رہے گا: ''کیا ہم واقعی لافانی ہونا چاہتے ہیں؟ اگر ہاں، تو کیوں؟''

اس سوال کا جواب دیمتری اتسکوف کچھ یوں دیتا ہے: ''میں جوڈو کھیلتا، ویٹ لفٹنگ کرتا، نشانے بازی آزماتا اور پیراکی سے دل بہلاتا ہوں۔ لیکن میں ہر مشغلہ آزمانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے مجھے کم از کم دس ہزار سال کی زندگی درکار ہے۔ یوں میں اپنی ساری ناآسودہ تمنائیں پوری کر سکوں گا۔''

لیری ایلیسن کا نقطہ نظر جدا ہے۔ وہ بڑھاپے سے وابستہ اذیت و بے چارگی سے خوف کھاتا ہے جو بالآخر موت پر منتج ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے: ''میری ماں سرطان کے باعث چل بسی تھی۔ میں نے رفتہ رفتہ ان کا جسم گھلتے اور موت کی نذر ہوتے دیکھا۔ یہ ایک ہولناک تجربہ تھا جس سے میں دوبارہ نہیں گزرنا چاہتا۔''

اخلاقیات اور مذاہب کے عالم سائنس دانوں کی کوششوں کو مختلف نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے، جدید انسان اس لیے اپنی عمر بڑھانا چاہتا ہے تاکہ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لیے اسے مزید وقت مل جائے۔ حالانکہ انسان کو جتنی بھی عمر ملے، اس کا مقصد زندگی یہ ہونا چاہیے کہ وہ اسے باتقویٰ اور نیکیاں کر کے گزارے۔

انسان نے عمر خضر پا لی، تو مستقبل کے انسانوں کو ایک اور گمبھیر مسئلے سے پالا پڑے گا۔ وہ یہ کہ جب کسی کو موت نہیں آئی، تو رفتہ رفتہ کرہ ارض پہ اربوں انسان آباد ہو جائیں گے۔ تب ان کی خوراک، رہائش، لباس وغیرہ کا بندوبست کیسے ہو گا؟ کیا ارضی وسائل ان اربوں انسانوں کی ضروریات پوری کر سکیں گے؟ یہ شاید تب انسان کے لیے سب سے اہم سوال بن جائے۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک انہونے واقعے نے جنم دیا

من کا بوجھ

اپنی مدد آپ کے سنہرے اصول کی سچائی عیاں کرتی چشم کشا داستان

جاوید بسام

انسان کا ذہن بسا اوقات نمایاں اور انوکھی باتیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کا اثر اس طرح لیتا ہے کہ بے سکون آ جھپٹتی ہے۔ اس دن میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ رات آٹھ بجے میں کام سے واپس آ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں کچھ سامان بھی تھا۔

ایک گلی سے گزرتے ہوئے میں نے دو نوعمر لڑکوں کو دیکھا۔ وہ ایک گھر سے بڑی بڑی پلاسٹک بوتلوں میں پانی بھر کر بتھ گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک لڑکا بولا ''انکل! یہ بوتل ذرا گاڑی میں رکھ دیں۔''

کسی کے کام آ کر جو خوشی ملتی ہے، اس کا الگ ہی مزا ہے۔ میں نے فوراً بوتل اٹھا کر گاڑی میں رکھ دی۔

لڑکا بولا ''ایک اور سر!''

میں نے دوسری بوتل بھی اٹھالی۔ میرا خیال تھا، اب وہ مزید اٹھانے کا نہیں کہیں گے۔ لیکن وہ بولا ''ایک بوتل اور رکھ دیں۔''

میری کمر میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا ''بھئی کیا یہ سب مجھ سے ہی اٹھواؤ گے؟''

''اچھا رہنے دیں۔'' وہ بولا۔

میں آگے بڑھا، تو میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں منہ چھپا کر ہنس رہے ہیں۔ میں نے اس حرکت کی کوئی خاص پروا نہ کی۔ کچھ قدم چل کر کانوں میں پھر آواز آئی، تو بے اختیار مڑ کر دیکھا۔ وہ کسی اور راہ گیر کو روک کر اسے بوتلیں

www.pdfbooksfree.pk

اٹھانے کا کہہ رہے تھے۔ میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر ٹی وی دیکھتا رہا پھر سونے لیٹ گیا۔ عموماً لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے۔ لیکن اس دن میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ میری طبیعت بے چین تھی اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور۔ دماغ میں خیالات گھوم رہے تھے، خاص طور پر وہ لڑکے مجھے بار بار یاد آنے لگتے۔ ان کا طرز عمل کچھ ایسا تھا جس نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا۔

اپنا کام دوسروں سے دھڑلے سے کرانا اور پھر اس پر فخریہ ہنسی، کچھ عجیب سی بات تھی۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا، لیکن ایسا ہوا تھا۔ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا، یہ حقیقت تھی۔ ان کی اس حرکت سے میرا ذہن منتشر ہو گیا۔ پھر مجھے لگا کہ ایسا ایک واقعہ میرے ساتھ پہلے بھی پیش آچکا۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آخر میں نے اپنے دماغ سے تمام خیالات نکالے اور دعائیں پڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا پھر بھی کامیابی نہ ہوئی۔

میرا ذہن گھوم پھر کر دوبارہ اسی طرف چلا جاتا۔ نیند میری آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ آخر میں خود کو دلیلیں دینے لگا کہ وہ ابھی نوعمر ہیں۔ بچے شرارتی بھی ہوتے ہیں، جب سمجھ آئی، تو یہ روش تبدیل ہو جائے گی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ بچپن کی منفی باتیں بڑے ہونے پر مثبت میں بدل جاتی ہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ایسا پہلے بھی ہو چکا۔ کوئی مبہم سی یاد تھی جو ماضی کے اندھیرے میں کہیں چھپی تھی۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اچانک ذہن میں کھڑکی سی کھلی اور مجھے تیس سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

میں تب بھی اسی علاقے میں رہتا تھا۔ جب یہاں کی آبادی بہت کم تھی۔ خالی میدان دور تک نظر آتے۔ بس اسٹاپ بھی گھر سے دور تھا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آیا، تو آنکھوں کے سامنے گویا فلم سی چلنے لگی۔ شام کا وقت تھا۔ میں کہیں سے آرہا تھا۔ اسٹاپ پر بس رکی، تو بہت سے لوگ اترے۔ میں نے ان لوگوں میں آگے جاتے ہوئے دو لڑکوں کو دیکھا۔ انھوں نے اپنے کندھوں پر ایک ایک آٹے کا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔

ان دنوں آٹے کی قلت تھی۔ لوگوں کو آٹا دور دراز راشن ڈپو سے لانا پڑتا۔ میں ان لڑکوں کو جانتا تھا۔ وہ میرے گھر کے قریب ہی رہتے اور میرے دوست، صادق کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کی عمریں یہی کوئی دس گیارہ سال ہوں گی۔ وہ کندھوں پر بوجھ اٹھائے میدان میں تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور جلد ان تک پہنچ گیا۔ قدموں کی چاپ سن کر انھوں نے گھوم کر دیکھا اور ایک ساتھ مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا ''وعلیکم السلام، لاؤ ایک تھیلا مجھے دے دو۔''

میں نے چھوٹے والے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خیال تھا کہ وہ بے چون و چرا میری بات مان لیں گے۔ لیکن اس وقت میں حیران رہ گیا جب بڑا لڑکا سلیم بولا ''نہیں بھائی جان! ہم لے جائیں گے۔''

''ارے بھئی میں کوئی غیر تو نہیں اور جا بھی اسی طرف رہا ہوں۔ آدھے آدھے راستے تم دونوں مجھے اپنا اپنا تھیلا اٹھانے دینا۔ اس طرح تمھیں سہولت ہو گی اور راستہ آرام سے کٹ جائے گا۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا ''نہیں، ہم تو ہر مہینے اسی طرح آٹا لاتے ہیں۔ ہماری امی کہتی ہیں کہ انسان کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا چاہیے۔''

میرے بڑھتے ہاتھ واپس لوٹ آئے۔ میں نے کہا ''ہاں دوست! تمھاری امی ٹھیک کہتی ہیں۔''

خیر میں ان کے ساتھ چلنے لگا۔ لیکن ان کے قدم مجھ سے تیز اٹھ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں وہ مجھ سے آگے نکل گئے۔ میری نظریں ان پر جمی تھیں۔ دونوں بھائی بہت

www.pdfbooksfree.pk

ذہین اور فرمانبردار تھے۔ میرے اسکول ہی میں نچلی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ (صادق اور میں نے اسی سال میٹرک کا امتحان دیا تھا) ان کے والد فوت ہو چکے تھے۔ والدہ پرورش کر رہی تھیں۔ صدر میں ان کے شوہر کی ایک دکان تھی جس کے کرائے سے اب ان کی گزر بسر ہوتی۔

پھر مجھے یاد آیا کہ وہ لوگ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد یہ علاقہ چھوڑ کر کسی اور جگہ چلے گئے۔ میں نے پھر انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ میرے دماغ کو سکون مل گیا، جیسے کوئی گتھی سلجھ گئی۔ پھر حیرت انگیز طور پر مجھے فوراً نیند بھی آ گئی۔

اگلے دن چھٹی تھی۔ میں نے کچھ کام نمٹائے۔ پھر خیال آیا کہ صادق سے ملے بہت دن ہو گئے، کیوں نہ آج اس سے ملاقات کی جائے۔ وہ ساتھ والی گلی ہی میں رہتا تھا۔ ہم دونوں کسب معاش میں اس طرح مصروف تھے کہ صرف آتے جاتے حال چال پوچھ لیتے، ورنہ شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کی خبر ہوتی۔ میں اس کے گھر چلا گیا۔ وہ گرم جوشی سے ملا، لیکن چپ چپ سا تھا۔ اس نے فوراً میرے لیے چائے بنوائی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں نے اداسی کی وجہ پوچھی۔

وہ بولا ''بس یار اپنی ملازمت کے باعث پریشان ہوں۔ جہاں پچھلے دس سال سے کام کر رہا تھا، وہ کمپنی دبئی منتقل ہو گئی۔ دوسری ملازمت ملی، تو ہے لیکن تنخواہ کم ہے۔ بس گزارہ کر رہا ہوں۔ ہم لوگ پڑھ لکھ کر کچھ زیادہ نہ پا سکے۔''

میں نے کہا ''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ہم وہ کچھ حاصل نہ کر سکے جو کرنا چاہتے تھے۔''

وہ اثبات میں گردن ہلانے لگا۔ آخر میرے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ میں نے پوچھا ''صادق! تمھارے ماموں کے لڑکے آج کل کہاں ہیں؟''

وہ چونک کر بولا ''نعیم اور کلیم کی بات کر رہے ہو؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وہ پُرجوش لہجے میں بولا ''وہ لوگ گلشن اقبال میں رہتے ہیں۔ وہاں انھوں نے اپنا بنگلہ بنا لیا ہے۔''

''اچھا، بہت خوشی ہوئی۔ وہ کیا کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نعیم نے سی اے کیا تھا۔ وہ ایک فرم میں کام کرتا ہے۔ کلیم نے سائنس پڑھی اور مکینیکل انجینئر بن گیا۔ دونوں بہت محنتی تھے اور قسمت بھی ان کے ساتھ تھی۔ بھائی! ہمارے خاندان میں، تو ان کی کامیابی اور خوشحالی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ کسی غیر کو بتاؤ تو وہ یقین نہیں کرتا۔ تمھیں بھی یقین نہیں آ رہا ہوگا؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''نہیں، مجھے یقین آ گیا بلکہ میرے ذہن میں ان کی کچھ اسی قسم کی تصویر تھی۔''

پھر میں نے اسے تیس سال پہلے پیش آنے والا واقعہ سنایا اور ساتھ ہی گزشتہ روز ہوئی ان لڑکوں کی حرکت بھی بتائی۔ وہ حیرت سے میری باتیں سن رہا تھا۔ پھر بولا ''ہاں ہاں، ہمارے بچپن میں کسی سے اپنا کام کہنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ والدین اپنے بچوں کو اپنی مدد آپ کی تلقین کیا کرتے تھے۔ لیکن آج کل رویے بدل چکے۔''

''ہاں، اب اسے ذہانت اور ہوشیاری میں شمار کیا جاتا ہے۔ خیر چھوڑو، کیا خیال ہے، کسی دن ان دونوں سے ملنے چلیں؟''

وہ بلاتامل بولا ''ہاں ضرور، اگلی اتوار ہی کو چلتے ہیں۔''

میں کچھ دیر اور بیٹھا رہا پھر اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ باہر نکل کر میں نے ایسی خوشی اپنے اندر اُمڈتی محسوس کی جو پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ رات جو بوجھ ان دو بوتلوں نے مجھ پر ڈالا تھا، اسے تیس سال پہلے دو آنے کے تھیلوں نے ہٹا دیا جو مجھے اٹھانے نہیں دیے گئے تھے۔

◆●●

www.pdfbooksfree.pk

ہمارے بازاروں میں کھلے عام

گدھے کا گوشت کیوں بک رہا ہے؟

کھال کی مانگ نے راتوں رات
پاکستانی گدھوں کو بیش قیمت بنا ڈالا

بادی خان

پچاس سال قبل مشہور سائنس داں، آئن سٹائن نے پیش گوئی کی تھی "تین قوتیں یہ دنیا تباہ کر سکتی ہیں.... ہوس، بے وقوفی اور خوف۔" یہ سو فیصد درست قول ہے۔ خاص طور پر ہوس کا شکار انسان، تو شیطان بن جاتا ہے اور پیسا کمانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار! اسی لیے نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"جب تم بے حیا ہو جاؤ، تو پھر جو جی میں آئے، کرو۔" (روایت حضرت ابن مسعودؓ، البخاری)

اب یہی دیکھیے کہ پچھلے چند برس سے بے حیا پاکستانی دکانوں میں کتوں، بلیوں اور گدھوں کا گوشت بیچنے لگے ہیں۔ اس گھناؤنے فعل کے پیچھے یہی مقصد کارفرما ہے کہ جیسے تیسے پیسا کمایا جائے۔ خاص طور پر پچھلے ایک دو برس سے گدھوں اور گھوڑوں کا گوشت خاصی مقدار میں فروخت ہونے لگا ہے۔ آئے دن یہ خبر آتی ہے کہ فلاں مقام پر قصائی گدھے کا گوشت بیچتے پکڑا گیا۔ یاد رہے، بخاری اور مسلم کی روایت کے مطابق جنگلی گدھے (Onager) کا گوشت حلال ہے۔ تاہم پالتو گدھے کا گوشت کھانا نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ اسی طرح حنفی گھوڑے کے گوشت کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ شوافع، حنابلہ اور مالکی کے نزدیک یہ حلال ہے۔

سوال یہ ہے کہ پچھلے چند برس سے یکایک گدھے کا گوشت اتنی زیادہ مقدار میں کیوں بکنے لگا؟ اس کی وجہ یہ ہے، پاکستانیوں کو معلوم ہو چکا کہ پڑوسی ملک، چین میں گدھے کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں وہ ایک بیش قیمت شے کی حیثیت اختیار کر چکا۔

چین میں لوگ گدھے کا گوشت شوق سے کھاتے ہیں اور اسی لیے وہ مہنگی غذا بن گیا ہے۔ چین میں گدھے کے ڈیڑھ کلو گوشت کی قیمت "۱۶۰۰ روپے" ہے۔ کئی چینی صوبوں میں اس گوشت سے بنے برگر، کباب اور سموسے

www.pdfbooksfree.pk

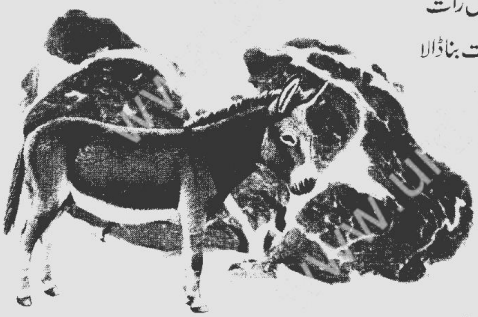

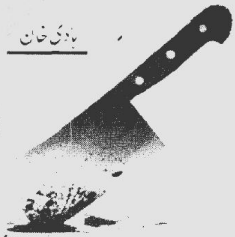

رغبت سے کھائے جاتے ہیں۔

مزید برآں چین میں گدھے کے کھال کی چربی مختلف دیسی ادویہ اور سامان بارسنگھار میں ڈالی جاتی ہے۔ چین میں گدھے کی کھال سے بنی ایک کلو خالص چربی کی قیمت ''دس ہزار روپے'' ہے۔ درحقیقت اسے روایتی چینی طب میں استعمال ہونے والے تین اہم ترین اجزا میں شامل کیا جاتا ہے۔

چند سال پہلے کچھ چینی تاجر گدھے کی کھال تلاش کرتے کرتے پاکستان کے شہر قصور آن پہنچے۔ وہاں چمڑے کی بڑی منڈی واقع ہے۔ یہ چینی تاجر جانتے تھے کہ پاکستان میں گدھے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں گدھوں کی تعداد پچاس لاکھ سے زائد ہے۔ (جبکہ چین اور بھارت میں بالترتیب ایک کروڑ اور پچھتر لاکھ گدھے پائے جاتے ہیں)

جب چینی تاجر قصور شہر کی منڈی پہنچے، تو وہاں گدھے کی کھال تین چار سو روپے میں دستیاب تھی۔ وطن عزیز میں بھیڑ، بکری کی کھال کے برعکس گدھے کی کھال سے خاص اشیا نہیں بنتیں۔ اسی لیے چمڑا مارکیٹ میں اس کی مانگ نہیں تھی۔ گدھے کی کھال کے چمڑے سے جوتوں کے تلوے بنتے ہیں یا ڈھول کی تانت۔

چینی تاجروں کو محض چند سو روپے میں گدھے کی کھالیں مل گئیں، تو خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھل اٹھیں۔ کیونکہ چین میں اس کھال کی قیمت کئی گنا زیادہ تھی۔ انھوں نے فوراً مارکیٹ میں موجود ساری کھالیں خرید لیں اور وطن واپس لوٹ گئے۔

چین جا کر انھوں نے دیگر تاجروں کو بتایا کہ پاکستان میں تو گدھے کی کھال بہت سستی ہے۔ چناں چہ مزید چینی خریدار پاکستانی منڈیوں میں آ پہنچے۔ انھیں صرف گدھے کی کھال درکار تھی۔ ادھر پاکستانی تاجروں نے چینیوں کی بڑھتی آمد دیکھی اور یہ بھی جانا کہ وہ ''کھوتے'' کی کھال مانگتے ہیں، تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔

تعلیم یافتہ پاکستانی تاجروں نے پھر مہمان چینی تاجروں سے پوچھ گچھ کی، کچھ انٹرنیٹ سے مدد لی۔ یوں ان پر انکشاف ہوا کہ چین میں تو گدھے کی کھال بہ حساب پاکستانی کرنسی کئی ہزار روپے میں بکتی ہے۔ اس حقیقت نے پاکستانی تاجروں کے کان کھڑے کر دیے۔

اب قصور اور لاہور کی چمڑا منڈیوں میں راتوں رات گدھے کی کھال کی قیمت بڑھنے لگی۔ یہ کھالیں عموماً چینی تاجر ہی خریدتے ہیں۔

چینی تاجروں کو دس ہزار روپے میں بھی گدھے کی کھال سستی پڑتی ہے۔ وجہ یہی کہ ایک کھال سے دو تین کلو چربی نکل آتی ہے۔ اسی لیے پاکستانی گدھے کی کھال مہنگی ہونے کے باوجود چین میں اس کی مانگ بدستور موجود ہے۔

چین میں گدھے کی کھال سے بنی چربی یا (جیلاٹن) ''اجیاؤ'' (Ejiao) کہلاتی ہے۔ چین میں مشہور ہے کہ اس کے استعمال سے چہرے اور جسم کی جھریاں دور ہوتی ہیں۔ خون کی روانی بڑھتی ہے۔ چہرہ چمک دار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے گدھے کی کھال سے حاصل کی گئی یہ چربی کریمیں بنانے میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی ہے۔

پاکستان میں مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ جب لٹیروں اور چوروں کو پتا چلا کہ گدھے کی کھال دس ہزار روپے میں بکنے لگی ہے، تو وہ چوکنا ہو گئے۔ تب خصوصاً پنجاب کے دیہی علاقوں میں وہ سرگرم ہوئے اور غریب دیہاتیوں کے گدھے چرانے لگے۔

ان چوروں کو صرف کھال درکار ہوتی ہے، لہٰذا وہ گدھے کا گوشت اونے پونے داموں قصائیوں کو بیچنے

www.pdfbooksfree.pk

لگے۔ یہ ہے وہ وجہ جس کے باعث پاکستانی بازاروں میں اچانک بڑی تعداد میں گدھے کا گوشت فروخت ہونے لگا۔ چور ہوں، قصائی یا گدھے کا گوشت خریدنے والے حرام خور ہوٹل والے، انھیں بس اپنی کمائی سے غرض ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ گوشت کھلا کر ہم وطن پاکستانیوں کا ایمان وصحت خراب کر رہے ہیں۔

یہ ہوس پرست چور غریب دیہاتیوں کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ ہمارے دیہی گھرانوں میں گدھا چھوٹے موٹے کارخانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسان ہو یا مزدور، وہ اس جانور سے دن بھر کئی کام لیتا ہے حتیٰ کہ بہت سے دیہاتی گدھے کی مدد ہی سے روزی روٹی کماتے ہیں۔ لیکن بے حس اور ظالم چور ان کے گدھے چرا انھیں زندہ درگور کر دیتے ہیں۔

پچھلے دو برس میں فیصل آباد، گجرات، لالہ موسیٰ اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں آباد سیکڑوں دیہاتی اپنے گدھوں سے محروم ہو چکے۔ اسی لیے وہ اکثر شاہراہوں پر ٹریفک روک کر اپنے غم وغصے کا اظہار کرتے ہیں۔

حکومت پنجاب کو چاہیے، وہ پولیس کو سختی سے ہدایت دے کہ گدھا چوروں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ ویسے دیہات میں آباد لوگ اب اپنے جانوروں کی زیادہ نگرانی کرنے لگے ہیں۔ اسی طرح گدھا چوروں کے عزائم کے آگے بند باندھنا ممکن ہے۔

یہ چور گدھا چرا کر اسے مار ڈالتے ہیں۔ پھر کھال اتار کر چمڑا منڈی میں فروخت کرتے ہیں۔ یوں وہ اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔ اب گوشت بیچنے سے بھی انھیں آمدنی ہونے لگی ہے۔ اسی لیے وہ گدھوں کی چوری سے باز نہیں آ رہے۔

یاد رہے کہ گدھے کا گوشت دیکھنے میں گائے یا بھینس کے گوشت سے ملتا جلتا ہے۔ تاہم اس سے زیادہ تیز بو اٹھتی ہے۔ یہ اس حرام گوشت کی ایک بڑی نشانی ہے۔

◆●●

ادلے کا بدلہ

ایک دفعہ امام ابوحنیفہؒ کسی صحرا میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے پاس پانی ختم ہو گیا۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی، تو ریت کے بگولے اڑ رہے تھے۔ امام صاحب کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ اتفاق سے انھیں ایک بدو مل گیا جس کے پاس پانی کا ایک مشکیزہ تھا۔ آپ نے اس سے پانی مانگا۔ بدو نے پہلے تو پانی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا ''اگر پانچ درہم دو تو یہ مشکیزہ تمھیں مل سکتا ہے۔''

امام صاحب نے پانچ درہم دے کر مشکیزہ لے لیا اور سیر ہو کر پانی پیا۔ پھر بدو سے پوچھا ''بھائی میرے پاس کچھ ستو ہیں۔ کیا تم انھیں کھانا پسند کرو گے؟''

اس نے کہا ''کیوں نہیں۔''

آپ نے اس کو ستو دے دیے جن میں خوب روغن زیتون ڈالا گیا تھا۔ بدو نے ستو خوب پیٹ بھر کر کھائے۔ پھر اسے بھی پیاس لگی۔ اس نے آپ سے پانی کا ایک پیالہ مانگا۔ امام صاحب نے فرمایا ''پانچ درہم میں ملے گا، اس سے کم میں نہیں۔''

یوں بدو نے پانی کے بدلے میں جو پانچ درہم لیے تھے، اس کو واپس دینے پڑے۔

اس طرح امام ابوحنیفہؒ نے اس بدو کو سبق دیا کہ کسی ضرورت مند کے ساتھ نیکی خدا کو خوش کرنے کے لیے کرنی چاہیے نہ کہ پیسے کی خاطر۔ اگر وہ بدو خوشی سے پانی آپ کو دے دیتا، تو شاید آپ اسے پانچ درہم سے بھی زیادہ رقم انعام میں عطا فرماتے۔

(امیر حمزہ بن مشتاق، وار برٹن)

www.pdfbooksfree.pk

قدیم زمانے کا ذکر ہے کہ ایک نیم وحشی دراوڑ راجا بندھیا چل سے اُس پار کی زمینوں پر حکومت کرتا تھا۔ وہ آریہ نسل نہیں تھا۔ اس کی رگوں میں ہندوستان کے قدیم دراوڑوں کا خون موجزن تھا جس سے تاحال وحشت کی بو نہ گئی تھی۔ تاہم وہ بنگال، اودھ اور وسط ہند کے کھشتری راجاؤں کا ہم نبرد اور مہذب آریہ ورت کا ہمسایہ تھا۔ اس مقدس پڑوس نے خیالات کو متاثر ضرور کر دیا۔ اس لیے وہ فیاض تھا، تُند مزاج بھی۔ آزاد خیال تھا، پرانی وحشیانہ رسموں کا پابند بھی۔ اس کی طبیعت تلوّن سے معمور تھی، مگر حکم اٹل ہوا کرتا۔

وہ راجا تھا، مطلق العنان، اس لیے اپنے خیالات کو جب اور جس طریق سے چاہتا، عملی جامہ پہنانے میں تامل نہ کرتا۔ اسے اپنی رائے پر پورا اعتماد تھا لہٰذا ہر کام اپنی رضا مندی کے مطابق انجام دیتا۔ اُیودھیا اور کپل وستو کے عظیم الشان درباروں کی طرح اس کا بھی ایک دربار تھا جس میں اپنی نیم وحشی رعایا میں سے اچھے اچھے رتن جمع کر رکھے تھے۔ ان سے مشورہ طلب بھی ہوتا مگر اپنی رائے کی مخالفت اسے پسند نہ تھی۔ تائید کلام سے بے حد خوش ہوتا لیکن اختلافِ رائے برداشت نہ کرتا۔ مخالفت کا خیال بھی اسے اپنے درباریوں کی تمنائیں کو تباہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

بند دروازے میں سے کیا نکلا

شیر یا دوشیزہ.....

نسوانی فطرت کی بھول بھلیاں اور پیچیدگیاں اجاگر کرتا معنی خیز فسانہ

فرینک سٹوکٹن / ابوالاثر حفیظ جالندھری

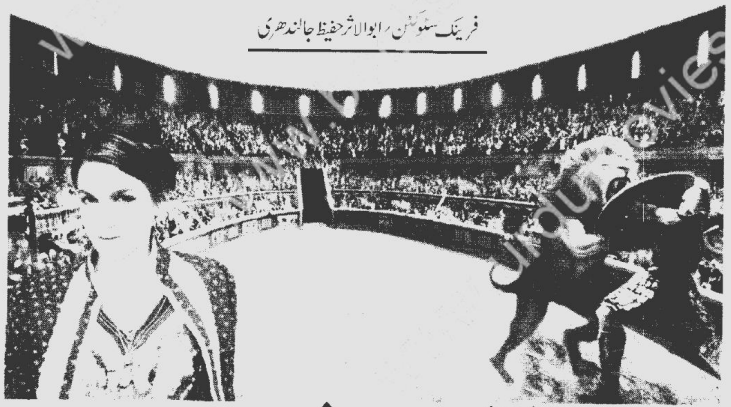

www.pdfbooksfree.pk

ہمسایہ قوم کے پرتو نے اس کی جہالت کو کسی قدر زائل کر دیا۔ اپنے ہم عصر سورماؤں کے بہادرانہ اشغال کے مقابلے میں اس نے بھی اپنی راجدھانی میں ایک تماشا گاہ قائم کی تھی۔ وہاں وہ انسانی اور حیوانی درندگی کے نظارے دکھا کر نیم وحشی رعایا کو اپنے وقت کی تہذیب سے آراستہ کرنے میں بے حد دلچسپی لیتا۔

لیکن تماشا گاہ میں بھی اس کی بے باک وحشت اور ستم ظریفی نے مل کر نئی جدت پیدا کر دی۔ یہ تماشا گاہ اس لیے نہیں بنائی گئی تھی کہ لوگ وہاں آئیں، جمع ہو کر دو تلواریوں کو لڑتے اور پھر ایک کو زخموں سے نڈھال ہو کر دم توڑتے دیکھیں یا اس کی بے ربط گفتگو سنیں۔ نہ اس لیے کہ ایک خونخوار ہیبت ناک درندے کے مقابل کسی بے دین، راکھشس کا حشر دیکھ کر عبرت پکڑیں بلکہ تماشا گاہ کی بنیاد کا مقصد ان باتوں سے بلند تر تھا۔ وہ یہ کہ لوگوں کے ذہنی قویٰ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع کیا جائے۔

تماشا گاہ کا منڈپ اپنے پیچیدہ برآمدوں، پراسرار اور پوشیدہ تہ خانوں اور بھول بھلیوں سے بھی زیادہ بعید الفہم گزرگاہوں کے سبب شاعرانہ عدل و انصاف کا ایک دلچسپ ذریعہ تھا۔ جب رعایا کا کوئی فرد ایسا مجرم ٹھہرایا جاتا جس سے خود راجا کو دلچسپی ہو، تو اعلان کر دیا جاتا کہ فلاں روز اس کی قسمت کا آخری فیصلہ شاہی اکھاڑے میں ہوگا۔

اکھاڑا تماشا گاہ کے وسیع منڈپ کا مناسب نام تھا۔ گرچہ اس کی ساخت کسی دور دراز تہذیب کا چربہ تھی مگر راجا نے اس کے استعمال میں بھی جدت پیدا کر دی۔ وہ پرانے زمانے کے کارناموں کو دقیانوسی خیالات سے زیادہ وقعت نہ دیتا۔ وہ اپنی اختراعات کو مناسب اور ہر شخص کے لیے قابل عمل خیال کرتا۔

مقررہ دن جب لوگ اکھاڑے کے وسیع برآمدوں میں جمع ہو جاتے، تو راجا بھی اپنے گراں ڈیل اور نیم عریاں درباریوں کے جھرمٹ میں برآمد ہوتا اور سب سے بڑی عدالت کے سنگھاسن پر بیٹھ جاتا۔ ہر طرف خاموشی چھاتی اور وحشیانہ نعروں کی گونج مہیب چپ چاپ سے بدل جاتی۔ اس وقت راجا اشارہ کرتا۔ اشارے پر سنگھاسن کی نچلی دیوار میں ایک دروازہ کھول دیا جاتا اور مجرم اکھاڑے میں داخل ہوتا۔

راجا کے عین مقابل دیوار میں ایک ہی طرح کے دو بند دروازے بنائے گئے تھے۔ مجرم کا فرض تھا کہ عدالت عدلیہ کے سامنے پس و پیش کیے بغیر ان کی طرف بڑھے اور دونوں میں سے ایک دروازہ کھول دے۔

صاحب تحریر

امریکا کے ممتاز قلم کار، فرینک سٹوکٹن ۵ر اپریل ۱۸۳۴ء کو ڈی وڈلینڈ نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ والد پادری تھے۔ فرینک بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کی طرف مائل تھے، مگر باپ نے انھیں منع کر دیا۔ چناں چہ انھوں نے چوبی کندہ کاری کا پیشہ سیکھا اور اس کی مدد سے گزر اوقات کرنے لگے۔ ۱۸۶۰ء میں جب والد دنیا سے رخصت ہوئے، تب فرینک بے شمار کہانیاں لکھنے لگے۔ انھوں نے بچوں اور بڑوں کے لیے کہانیاں لکھیں اور اخلاقی برائیوں مثلاً لالچ، تشدد، حسد وغیرہ کو موضوع بنایا۔ ان کی نمائندہ کہانی ''دی لیڈی اور دی ٹائیگر'' آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ فرینک سٹوکٹن نے ۲۰ر اپریل ۱۹۰۲ء کو وفات پائی۔

www.pdfbooksfree.pk

دروازے کا انتخاب مجرم کی اپنی خوشی اور پسند پر تھا۔ اس پر نہ تو کسی قسم کا جبر و تشدد روا رکھا جاتا نہ رہبری کی جاتی، بلکہ فیصلہ نہایت عادلانہ طور پر مجرم کی قسمت پر چھوڑ دیا جاتا۔ ایک دروازہ کھلنے پر خوفناک، ظالم اور بھوکا شیر برآمد ہوتا۔ وہ دروازے سے گرجتا ہوا نکلتا اور نہتے بدنصیب مجرم پر جھپٹا مار چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا۔ یہی اس مجرم کی سزا سمجھی جاتی۔

جب مجرم کی قسمت یہ فیصلہ کرتی، تو لوہے کے گھڑیال ماتمی انداز سے شور مچاتے۔ اکھاڑے کے باہر چاروں طرف اُجرت پر بلائے ماتمی اپنی دردناک چیخوں اور سنکھ دھوتو دھوتو کی پکار سے افسوس کا اظہار کرتے۔ عام تماشائی گردن جھکائے افسردہ صورت بنائے آہستہ آہستہ اپنے گھر لوٹ جاتے۔ ان کے دلوں میں مقتول کے حسن و شباب یا بزرگی و عزت کا احساس لہریں مارتا نظر آتا۔

لیکن جب مجرم دوسرا دروازہ کھول لیتا، تو اس میں سے ایک کم سن دوشیزہ نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ اس دوشیزہ کا بے حد حسین ہونا لازمی تھا۔ راجا اپنی سلطنت میں سے خود انتخاب کرتا۔ دوشیزہ کی شادی اس مجرم کے ساتھ کر دی جاتی۔ اس امر کو مجرم کی معصومیت کا انعام خیال کیا جاتا۔

اس حالت میں یہ پروا نہیں کی جاتی کہ مجرم کی پہلے بھی کوئی بیوی ہے یا نہیں۔ خواہ وہ کسی عورت کو دل و جان سے ہی کیوں نہ چاہتا ہو۔ راجا اپنے عطیے کے مقابلے میں کسی بات کا خیال نہ کرتا تھا۔

شادی کی رسمیں اسی وقت اکھاڑے کے اندر راجا کے سامنے ادا کی جاتیں۔ راجا کے اشارے سے فوراً ایک اور دروازہ کھلتا۔ لمبے لمبے بالوں والے پجاری گویوں اور ناچنے والی کنواری لڑکیوں کو لیے باجے گاجے کے ساتھ اس جوڑے کے قریب پہنچتے۔ شادی کا اہتمام نہایت دھوم دھام سے کیا جاتا۔

رسوم کے خاتمے پر گھڑیال بجتے۔ تمام لوگ اپنی وحشیانہ اچھل کود سے خوشی کا اظہار کرتے اور معصوم مجرم اپنی نئی دلہن کے ساتھ گھر روانہ ہو جاتا۔ راستے میں لڑکے لڑکیاں ان پر پھولوں کی برکھا کرتے جاتے۔

راجا کی عدالت کا یہی نیم مہذب فیصلہ تھا۔ اس طریق عمل کی خوبی ظاہر ہے۔ مجرم کسی طرح یہ سمجھ نہ پاتا کہ عورت کس دروازے سے برآمد ہوگی۔ وہ اپنی خوشی سے ایک دروازہ کھول دیتا۔ اسے اس بات کی مطلقاً خبر نہ ہوتی کہ اب شادی سے ہمکنار ہوں گا یا موت سے!

اب تک جتنے واقعات گزرے تھے، ان میں شیر کبھی ایک دروازے سے برآمد ہوتا اور کبھی دوسرے سے۔ اگر آدمی اپنے آپ کو واقعی مجرم پاتا تو چشم زدن میں اسے سزا مل جاتی۔ اگر وہ معصوم ظاہر ہوتا، تو دوشیزہ کو پسند کرے یا ناپسند، اسے راجا کے فیصلے سے رہائی مل ہی نہیں سکتی تھی۔

اکھاڑہ مشہور مقام تھا۔ جب لوگ اہم فیصلے کے دن وہاں جمع ہوتے، تو انھیں اس امر کا بالکل علم نہ ہوتا کہ وہ ایک مجرم کا قتل دیکھیں گے یا شادی! یہ لاعلمی ان کی آتش شوق کو اور بھی بھڑکا دیتی۔ تماشائی پرجوش اور بے تاب نظر آتے۔ اکثر اپنے ذہن سے کام لیتے اور اُوٹ پٹانگ قیاس دوڑاتے۔ لیکن فیصلے پر الزام نہ دھرتے کیونکہ ان کے خیال میں فیصلہ مجرم کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔

اس دھن کے پکے نیم مہذب راجا کی ایک بیٹی بھی تھی۔ وہ حسین و جمیل تھی اور آرام و آسائش سے رہتی۔ راجہ قدرتی طور پر اس لڑکی کو سارے جہان بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

اس کے درباریوں میں ایک نوجوان معزز قبیلے سے

www.pdfbooksfree.pk

تعلق رکھتا تھا۔اور یہ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے کہ اکثر درباری نوجوان شہزادیوں کے دامِ محبت میں پھنس کر صدمے اٹھاتے رہے ہیں۔ چناں اس نوجوان پر بھی راجا کی بیٹی فریفتہ تھی۔ اسے اپنے محبوب کی جاں نثاری پر پورا بھروسا تھا کیونکہ وہ ساری مملکت میں بہادری، خوب صورتی اور مردانگی میں بے نظیر تھا۔ وہ اسے انتہائی گرمی وشوق کے ساتھ چاہتی تھی، اس حد تک کہ چاہت میں تشدد کا جذبہ بھی موجود تھا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ دل سوز اور پُر جوش بنانا چاہتی تھی۔ اس آتشیں عشق کا سلسلہ مدت تک جاری رہا، لیکن ایک وقت آیا کہ راجا پر یہ راز افشا ہو گیا۔

اس نے اپنے فرائض ادا کرنے میں زیادہ تامل نہیں کیا۔ کسی تذبذب یا سوچ بچار کے بغیر نوجوان کو حراست میں لیا اور مقدمے کی تحقیقات کے لیے آخری دن مقرر کر دیا۔ یہ دن واقعی یادگار تھا۔ رعایا اور خود راجا اس مقدمے کی تحقیق میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ اس سے پیشتر کبھی ایسا واقعہ رونما نہ ہوا تھا کہ ایک غلام خاص راجا کی بیٹی سے محبت کرنے کی جرأت کا مرتکب ہو۔ شاید دنیا کے آغاز میں یہ بات معمولی خیال کی جاتی ہو مگر ان قوموں کے لیے معاملہ نہایت اہم تھا۔

خونخوار جلادوں نے تمام سلطنت کے پنجرے دیکھے بھالے تاکہ سب سے زیادہ، تند خالم اور ہیبت ناک شیر منتخب کیا جا سکے۔

ادھر نسوانی فن کے بڑے بڑے مصوروں نے ملک کی دوشیزاؤں میں سے ایک بہترین حسین دوشیزہ تلاش کی تاکہ نوجوان کی قسمت کا ستارا اسے معصوم ثابت کر دے، تو اس الزام کی نسبت سے اتنا ہی بڑا انعام بھی دیا جائے۔

البتہ ایک بات سب پر ظاہر تھی۔ یہ کہ ہر شخص جانتا تھا، الزام قطعاً درست اور سچا ہے۔ مجرم نے راج کماری سے محبت کی۔ اس سے نہ وہ جوان انکار کرتا تھا نہ راج کماری۔ لیکن راجا اس ظاہر ثبوت کی رو سے فیصلہ کر کے اپنی عدالت کے دستور کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

مقررہ دن آن پہنچا۔ قرب و جوار کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ تماشا گاہ ہجوم سے بھر گئی۔ یک کثیر التعداد انبوہ جسے اندر جگہ نہ مل سکی، اکھاڑے کے باہر جمع ہو گیا۔

راجا اور اس کے درباری ہم صورت دروازوں کے بالمقابل متمکن ہوئے۔ سب کچھ تیار تھا۔ لوگوں کی سرگوشیاں ایک گہرے سکوت میں چھپ گئی تھیں کہ راجا نے اشارہ کیا۔ شاہی نشستوں کے نیچے بنا دروازہ کھلا اور راج کماری کا جاں نثار اکھاڑے میں داخل ہوا۔

سرو قد، وجیہہ، جمیل، خوش وضع، خوش اطوار بانکے نوجوان کے لیے تماشائیوں کے دلوں میں خوشی اور رنج، دونوں قسم کے جذبات اُبھر آئے۔

آدھی سے زیادہ خلقت کو یہ معلوم نہ تھا کہ ایسا شاندار انسان بھی ان کے درمیان رہتا ہے۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ ایسے نوجوان سے کسی شہزادی کا محبت کرنا اچنبھے کی بات نہیں، لیکن اس کا امتحان کی جگہ موجود ہونا خطرناک ہے۔

جب نوجوان نے اکھاڑے میں قدم رکھا، تو دستور کے مطابق وہ راجا کی تعظیم کے لیے جھکا۔ لیکن اس نے راجا کی موجودگی کا مطلق احساس نہ کیا۔ اس کی آنکھیں خوبصورت راج کماری پر جمی ہوئی تھیں جو راجا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھی تھی۔

اُف اس عورت کی فطرت کتنی بے باک تھی ورنہ شاید وہ ایسے وقت یہاں موجود نہ ہوتی۔ مگر اس کی روح میں ایک تڑپ تھی اور محبت کی آگ نے اسے یہ نظارہ دیکھنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

جب یہ اعلان ہوا کہ اس کا محبوب امتحان کے اکھاڑے میں اپنی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھوں سے کرے گا، تو اس کے لیے دن رات برابر ہو گئے۔ شہزادی نے سوائے اس خاص امر کے اور کسی بات سے سروکار نہ رکھا۔ اس کے پاس طاقت اور حکومت تھی۔ اس انوکھی عدالت میں حصہ لے چکی تھی۔ اسے دروازوں کے راز معلوم تھے۔ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ دونوں دروازوں کے پیچھے کس طرف کس کمرے میں بھوکا شیر خوفناک دانت نکالے کھڑا ہے اور کس کمرے میں حسین دوشیزہ بیٹھی انتظار کر رہی ہے۔

راج کے پُراسرار محل کے دروازے جن میں کھال کے پردے لٹک رہے تھے، کسی قسم کا شور یا آواز سنائی دینے کے لیے ہر طرح ناقابل تھے۔ لیکن زور، زر اور عورت کے جذبۂ محبت نے ساری حقیقت آشکار کر لی۔ اسے نہ صرف یہ معلوم تھا کہ دوشیزہ کس دروازے کے پیچھے اس کے عاشق کی منتظر ہے بلکہ یہ بھی خبر تھی کہ وہ دوشیزہ کون ہے؟

وہ دوشیزہ جو نوجوان مجرم کی بے گناہی کے صلے میں منتخب ہوئی تھی، دربار کی تمام لڑکیوں سے بدرجہا خوبصورت اور دل ربا تھی۔ خود راج کماری اسے خوبصورت سمجھتی تھی لیکن اس سے نفرت بھی کرتی۔ اس نے بارہا دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ نازک اندام حسینہ محبت بھری نظروں سے اس کے محبوب کو دیکھا کرتی ہے۔ بعض اوقات راج کماری کو محسوس ہوتا کہ اس کی نگاہیں کامیاب لوٹ رہی ہیں۔ اس کا محبوب بھی پیغامِ محبت کا جواب دے رہا ہے۔ کبھی کبھی اس نے انھیں گفتگو کرتے بھی دیکھا۔ یہ گفتگو جو سرراہے اور بہت مختصر ہوتی تھی، ممکن ہے کہ ناموافق پہلوؤں پر ہو لیکن راج کماری کس طرح جان سکتی تھی؟

راج کماری کے محبوب پر نگاہیں ڈالنے والی لڑکی محبت کی دیوی تھی لیکن راج کماری اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی انتہائی وحشت کے ساتھ اس لڑکی سے نفرت کرتی۔ اب وہی لڑکی اس وقت سامنے کے دروازوں میں سے ایک کے پیچھے پوشیدہ تھی۔

جب محبوب نے مڑ کر اس طرف دیکھا، تو دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس وقت راج کماری سب سے زیادہ سفید اور زرد رو نظر آتی تھی۔ اردگرد بے نقاب چہروں میں کوئی بھی اس سے زیادہ بے حس و حرکت نہ تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو ایسے تیز جذب سے دیکھا جو انہی لوگوں کو عطا ہوتا ہے جن کی روحیں ایک دوسرے سے پیوست ہوں۔ راج کماری جانتی تھی کہ کون سے دروازے کے پیچھے شیر ہے۔ نوجوان کو بھی یقین تھا کہ وہ ضرور جانتی ہے۔ نوجوان عاشق اپنی محبوبہ کی محبت بھری فطرت کو سمجھتا تھا۔ اسے پکا یقین تھا کہ میری نگاہیں دروازوں کا سربستہ راز معلوم کیے بغیر راج کماری کے چہرے سے نہیں الجھیں گی...... وہ راز جو تمام تماشائیوں کی نظروں سے پنہاں تھا۔ نوجوان کو پوری امید تھی کہ شہزادی یہ معمہ حل کرنے میں کامیاب ہو چکی۔

نوجوان کی متجسس، آرزومند اور پُرشوق نگاہ نے پوچھا: ''کدھر؟''

راج کماری پر یہ استفسار اس طرح واضح ہوا گویا نوجوان نے پورے زور سے پکارا ہو۔ ایک بھی ساعت ضائع نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ سوال بغیر آنکھ جھپکائے صرف نگاہ کی لطیف جنبش کے ذریعے پوچھا گیا اور جنبشِ نگاہ ہی اس کا جواب ہو سکتی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

راج کماری نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا۔ اس کی روشن آنکھوں میں سے نگاہ نے داہنی جانب جنبش کی۔ اس لطیف اشارے کو راج کماری کے محبوب کے سوا کوئی نہ دیکھ سکا۔ نوجوان کی آنکھوں کے سوا ہر فرد و بشر کی آنکھیں سامنے کے دروازوں پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ مزا اور مضبوط قدموں کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازوں کا درمیانی فاصلہ طے کرنے لگا۔ دلوں کی حرکت بند ہوگئی۔ سانس رک گئے۔ آنکھیں آئینہ کی طرح اس پر جم گئیں۔ وہ بنا پس وپیش داہنی دروازے کی سمت بڑھا اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اسے کھول دیا۔

اب کہانی کا آخری معمہ یہ ہے کہ اس دروازے میں سے شیر نکلا یا دوشیزہ؟ ہم سوال پر جتنا غور کریں اسی قدر اس کا حل مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اس سوال کا حل انسانی قلب کے مطالعے میں ہے اور اسی نے ہمیں جذبات کے پُراسرار گورکھ دھندے میں پھنسا دیا۔

کہانی پڑھنے والو! اس سوال کے جواب پر غور نہ کرو بلکہ اس پُرجوش اور نیم وحشی راج کماری کے دل کا مطالعہ کرو جس کی روح مایوسی کی سفید آگ میں بھسم ہو رہی تھی۔ وہ بار بار سوچتی ”میں نے اسے کھو دیا لیکن اس کو کون حاصل کرے گا؟“

آج سے پیشتر اپنی سرگرم تفتیش کے آغاز پر وہ بارہا وحشت ناک خوابوں سے چونک اٹھی ہوگی۔ اس نے کئی بار یہ خیال آتے ہی دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا ہوگا کہ اس کا محبوب وہ دروازہ کھول رہا ہے جس کے دوسری جانب بپھرا ہوا شیر اس کا منتظر ہے۔

کئی مرتبہ اس کے تصور نے اپنے محبوب کو دوسرے دروازے پر دیکھا اور درد و کرب سے دانت پیس لیے ہوں گے۔ اپنے بالوں کو نوچا ہوگا، اس خیال سے کہ میرا محبوب اپنی خوشی سے ایسا دروازہ کھول رہا ہے جس کے پیچھے ایک بے انتہا حسین دوشیزہ ہے۔

تصور ہی تصور میں اپنے عاشق کو پُراشتیاق نگاہوں سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دیکھ کر راج کماری کا دل رقابت کی آگ سے جل اٹھا ہوگا۔ اس نے تصور کی آنکھوں سے اپنے کھوئے ہوئے معشوق کے افسردہ جسم کو نئی روح سے جگمگاتے دیکھا اور عوام الناس کو خوشی کے نعرے لگاتے سنا ہوگا۔ کبھی خیال کیا ہوگا کہ شیر اس کا جسم چیر پھاڑ رہا ہے۔ تب اس کی چیخیں سنی ہوں گی۔ کبھی بیچاری نے اپنے روبرو اسے ایک دوسری لڑکی کا خاوند بنتے دیکھا ہوگا۔ کبھی اس کی ہڈی کڑکتی اور ٹوٹتی دکھائی دی ہوں گی اور کبھی اس پر پھولوں کی برکھا ہوتی نظر آئی ہوگی۔

ان تصورات کے ہنگاموں میں اس کی روح مایوسانہ آہ میں غرق ہوئی ہوگی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ میں اسی وقت مر جاؤں اور اگلی دنیا میں اپنے محبوب کا انتظار کروں جہاں اسے مجھ سے چھینا نہیں جا سکتا۔

اس نے نگاہ کی ایک ہی جنبش سے اپنا فیصلہ سنا دیا مگر یہ فیصلہ کرنے کے لیے اس نے کئی اندوہناک دن اور راتیں بسر کیں۔

وہ جانتی تھی کہ مجھ سے سوال کیا جائے گا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ میں کیا جواب دوں گی۔

اس نے کسی پس وپیش کے بغیر اپنا نازک ہاتھ داہنی جانب پھیر دیا مگر اس فیصلے کا نتیجہ جاننا آسان نہیں۔ دروازے میں سے کیا نکلا..... دوشیزہ یا شیر؟ آپ خود اس سوال پر غور کریں، میں اس معمے کو حل کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتا۔

www.pdfbooksfree.pk

ورلڈ کپ کی وبا

جو چار سال بعد آئے، تو پاکستان میں زندگی کا پہیہ جام کر ڈالے

عائشہ ظاہر

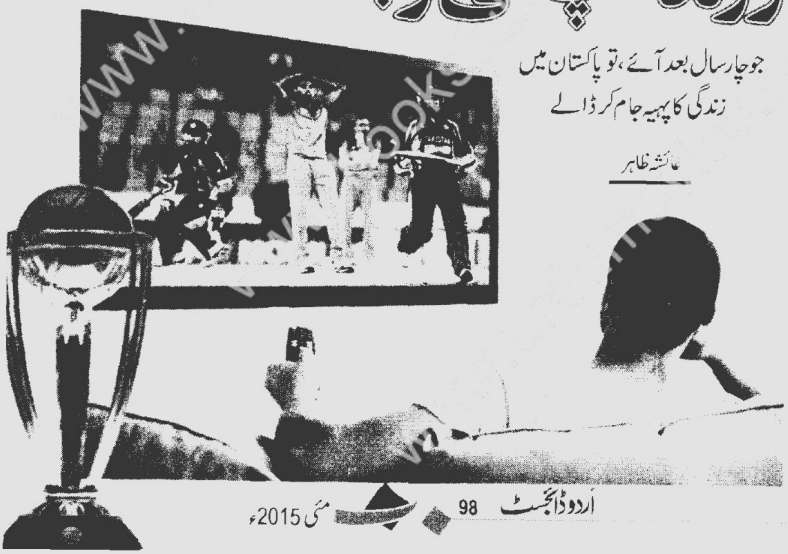

"بیگم! لو۔" ندیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔

گھر کا تمام ضروری سامان اور راشن منگوا

"یا اللہ خیر! کیا پڑوسی ملک نے حملہ کر دیا؟ ہائے ربا، ہمیں یہی خطرہ تھا۔ آئے دن سرحدوں پر چھیڑ خانی کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ اب کیا ہوگا؟" بیگم سہم گئیں۔ وہ بچپن ہی سے جنگ کے نام پر خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔ ہمیشہ دعا کرتی کہ ان کی زندگی میں کبھی جنگ نہ ہو۔

"ارے نہیں بھئی ایسا کچھ نہیں۔" ندیم بولے۔

"تو پھر کیا دہشت گردی کا خطرہ ہے؟" بیگم نے یوں سرگوشی کے انداز میں پوچھا گویا کوئی دہشت گرد آس پاس ہی موجود ہے۔

"او خدایا ایک تو تم عورتوں کو واویلا کرنے کا بہت شوق ہے۔ ارے بھئی بات تو پوری سن لیا کرو۔" ندیم جھنجھلا کر بولے۔

"تو پھر آپ ہی بتائیے کہ یہ ذخیرہ اندوزی کرنے کا حکم نامہ کیوں جاری کر رہے ہیں؟" بیگم نے پوچھا۔

"بھئی کرکٹ ورلڈ کپ شروع ہو رہا ہے۔ مجھے وقت بے وقت بازار سے سودا سلف لانے کا مت کہنا۔ جو منگوانا ہے، ابھی منگوا لو۔ پھر میں ذمے دار نہ ہوں گا۔" ندیم نے 'میں' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو یہ کہیے نا کہ ورلڈ کپ کی وبا حملہ آور ہوگئی۔ اس بیماری میں مبتلا کوئی مریض کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔" بیگم نے چڑ کر کہا۔

یوں تو کرکٹ کے شوق میں مبتلا مریضوں کی تعداد کم نہیں۔ لیکن جب چار سال بعد ورلڈ کپ شروع ہو، تو اس بیماری سے شاید ہی کوئی بچ پاتا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور جوان ہر کسی پر یہ بیماری پوری شدت سے حملہ آور ہوتی ہے۔ رہ جاتے ہیں، تو مجھے جیسے معدودے چند لوگ جن کی بدولت کاروبارِ حیات چلتا ہے۔ ورنہ ایسا لگتا ہے، یہ وبا زندگی کا پہیہ ہی جام کر دے گی۔

کئی لوگ پہلے سے گھر میں راشن اکٹھا کرنے لگتے ہیں کہ دوران میچ کون باہر نکلے گا۔ والدین بچوں کو تمام اسباق پیشگی یاد کراتے ہیں کہ ورلڈ کپ کے دوران پڑھانے کا وقت نہیں ہوتا۔ خواتین کئی طرح کے کھانے بنا کر منجمد کر دیتی ہیں۔ غرض تمام لوگ ذوق وشوق سے ورلڈ کپ کی تیاریوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

ورلڈ کپ کا شیڈول آتے ہی پہلے تو ان تمام تاریخوں پر نشان لگایا جاتا ہے، جن میں پاکستان کا مقابلہ کانٹے دار ٹیم سے ہو، خاص طور پر بھارت کے ساتھ! جس دن بھارت کے ساتھ پاکستان کا میچ ہو، پورے ملک میں کاروبارِ زندگی معطّل ہو جاتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ملک بھر میں ہڑتال ہے۔ بہت سے دیوانے اسے پاک بھارت جنگ ہی شمار کرتے ہیں۔

وہ دوران میچ لوگ کسی قسم کا کام کرنا کبیرہ گناہ سمجھتے ہیں۔ اس دوران مریض (یعنی کرکٹ کے شائقین) کی کیفیت قابلِ دید ہوتی ہے۔ ریموٹ ہاتھ میں پکڑے، آنکھیں پھاڑے اور سانس روکے نظریں ٹی وی پر جمی ہوتی ہیں۔ گویا کھلاڑی کے آؤٹ ہونے کا تعلق ان کے پلک جھپکنے یا سانس لینے سے ہے۔

رت جگے منانے کا رواج عام ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی بہت شوق سے تمام رات جاگتے ہیں جو شاید ہی کبھی رمضان میں عبادت کی غرض سے جاگے ہوں۔ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ خواتین سر پر دوپٹہ لپیٹے، مصلّا بچھائے، ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں ریموٹ پکڑے خشوع و خضوع سے دعا میں مصروف ہیں۔ ان پر رقت طاری ہے۔ چہرے پر ایسی التجا اور درد ہوتا ہے کہ لگتا ہے آج مصلّے سے اپنے تمام گناہ بخشوا کر ہی اٹھیں گی۔ لیکن درحقیقت وہ پاکستانی ٹیم کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوتی ہیں۔

ان دنوں ہر کوئی دوسرے سے اسکور پوچھتا نظر آتا ہے..... گاہک دکاندار، باس ملازمین، مریض ڈاکٹر اور خواتین رشتے داروں سے بات کریں، تو حال احوال سے پہلے میچ کی صورت حال ضرور پوچھتی ہیں۔ دوران میچ اگر لوڈشیڈنگ ہو جائے، تو واپڈا کی شان میں قصیدہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ تمام رشتے دار بھی یاد آنے لگتے ہیں جنھیں کئی سال سے فون نہیں کیا گیا۔ پھر انھیں فون یا میسج بھیج کر اسکور معلوم کیا جاتا ہے۔

دوران میچ جب کوئی کھلاڑی آؤٹ ہو یا ٹیم ہار جائے، تو ایسا ردِعمل سامنے آتا ہے کہ بچے سہم کر ماؤں کی گود میں دبک جاتے ہیں۔ پرندے گھبرا کر اپنے گھونسلوں سے اڑتے اور کمزور دل حضرات دل پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

کمزور دل کے وہ افراد جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ پاکستانی ٹیم ناقابلِ شکست ہے، عموماً یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتے اور دل کا دورہ پڑنے سے اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ ان افراد کو ڈاکٹر فائنل میچ تک اسپتال ہی میں رکھتے ہیں۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ ہر میچ کے دوران ان کے بلڈ پریشر اور دل کی رفتار کے اتار چڑھاؤ کی مکمل پڑتال ہو سکے۔

یوں تو پاکستانی ٹیم ہماری امیدوں کے برخلاف ایک مرتبہ ورلڈ کپ جیت کر لا چکی۔ ورنہ عموماً ہماری توقعات کے عین مطابق سیمی فائنل سے پہلے ہی منہ لٹکا واپس آ جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر مجھ جیسے دل جلے کہتے ہیں ''شکر ہے، اب کم از کم زندگی معمول پر تو آئے گی۔'' لیکن راز کی بات یہ ہے، ہمارا یہ جملہ انگور کھٹے ہیں کہ مترادف ہے۔ ورنہ کون کافر ہے جو اپنی ٹیم کی ہار پر خوش ہو؟

www.pdfbooksfree.pk

مشورہ حاضر ہے

رخسانہ فضل

گنج کا خاتمہ

مجھے گنج کے خاتمے کا تیر بہدف نسخہ درکار ہے۔ مزید برآں سفید بال سیاہ کرنے کا طریقہ بھی بتائیے؟
(علی احمد نور، اسلام آباد)

عمر کے ساتھ ساتھ اکثر مرد گنجے ہوجاتے ہیں۔ گنج جنم لینے کی کئی وجوہ ہیں۔ مثلاً اجداد میں گنج پایا جانا، ناقص غذا، تھائیرائڈ غدہ کی خرابی اور خون کی کمی (انیمیا)۔ حقیقت یہ ہے کہ گنج پن کا کوئی شافی علاج نہیں، البتہ غذائیت سے پُر غذا کھا کر بال جھڑنے کا عمل روکا جاسکتا ہے۔

بالوں کی نشوونما کے لیے پروٹین ضروری ہے۔ لہٰذا دن میں گوشت کی دو تین بوٹیاں کھائیے۔ دودھ بھی لیجیے۔ نیز انڈے، پھل اور سبزیاں غذا میں شامل رکھیے۔ مزید برآں جسم میں فولاد، زنک اور بائیوٹن کی کمی نہ ہونے دیجیے۔ یہ معدنیات بھی بالوں کی افزائش کرتی ہیں۔ نہاتے ہوئے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیریے۔ ذہنی دباؤ سے بچیے بال اگانے کی ادویہ بازار میں دستیاب ہیں لیکن ان کے استعمال سے عموماً فائدہ نہیں ہوتا۔

خضاب کے بغیر سفید بال سیاہ کرنے کے مختلف دیسی ٹوٹکے موجود ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ مہندی کا آمیزہ بنائیے۔ اس میں تین چمچ کروندے کا سفوف اور ایک چمچ کافی پاؤڈر ملائیے۔ اب آمیزے میں تھوڑا سا پانی ڈال کر اچھی طرح چمچ چلائیے تاکہ تینوں اشیا حل ہوجائیں۔

یہ آمیزہ ٹوتھ پیسٹ والے برش کی مدد سے بالوں میں لگائیے اور کم از کم دو گھنٹے لگا رہنے دیجیے۔ اس کے بعد اچھی قسم کے صابن یا شیمپو سے سر دھو لیجیے۔ یہ نسخہ نہ صرف بال سیاہ کرتا بلکہ انھیں چمک دار اور نرم و ملائم بھی بناتا ہے۔

بال اگر زیادہ سفید نہ ہوں، تو چائے کی پتیوں کا ٹوٹکا بھی قابل عمل ہے۔ دو چمچ چائے کی پتی پانی میں ابال لیں۔ جب پانی کچھ ٹھنڈا ہوجائے، تو بالوں پر لگائیے۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک گھنٹے بعد صابن یا شیمپو استعمال کیے بغیر سر دھو لیجیے۔

ایک اور ٹوٹکا یہ ہے کہ سکاکائی، آملہ اور ریٹھا ہم وزن لیں۔ انھیں اچھی طرح دھو کر پیس لیں۔ یہ آمیزہ یا پیسٹ ایک چمچ کھولتے پانی میں ڈال دیں اور اسے اچھی طرح ملا لیں۔ یہ آمیزہ جب پانی نیم گرم ہو جائے، تو اس سے سر دھوئیے۔ یہ آمیزہ بال سیاہ اور لمبے کرتا ہے۔ خیال رہے، یہ پانی چہرے پہ لگا، تو اسے کالا کر دے گا۔ لہٰذا چہرہ بچا کر رکھیے۔

کالا جادو

میں ایم اے سیاسیات ہوں۔ شکل وصورت اور اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی نہیں ہو رہی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارے خاندان پر جادو کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی مشورہ دیجیے۔

(شاہین، راولپنڈی)

آیت ۱۰۲ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جادوگر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، یہ قدرت صرف اللہ پاک رکھتے ہیں۔

آپ نماز اور قرآن پاک باقاعدگی سے پڑھیے اور امید رکھیے کہ رب کائنات آپ کی مدد فرمائیں گے۔ رشتوں کی تلاش جاری رکھیے کہ ہاتھ پاؤں مارنے ہی سے منزل ملتی ہے۔ ان شاء اللہ ہم سب کا پالن ہار آپ پہ کرم فرمائے گا۔

بال گرتے ہیں

میرے بال بہت گرتے ہیں۔ اس خرابی کا علاج بتائیے۔

(راحیلہ، لاہور)

خواتین گھنے بال رکھتی ہیں۔ لہٰذا روزانہ ان کے ۵۰ تا ۱۰۰ بال گرنا معمول کی بات ہے۔ اگر اس تعداد سے زیادہ بال گرنے لگیں، تو یہ درست نہیں۔ خوش قسمتی سے بال گرنے و ٹوٹنے سے بچانے والے عمدہ ٹوٹکے موجود ہیں۔

قدرتی علاج یہ ہے کہ ایک درمیانہ پیاز لیجیے اور اسے اتنا کاٹیے کہ اس کا رس نکل سکے۔ یہ رس بالوں پہ لگائیے اور انھیں ۱۵ منٹ تک کھلا چھوڑ دیں۔ پھر عمدہ شیمپو سے بال دھوئیے اور انھیں ہوا میں خشک ہونے دیں۔ یہ ٹوٹکا ہفتے میں دو بار استعمال کیجیے۔ امید ہے، بال گرنے کی تعداد کم ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ خواتین کے بال مختلف وجوہ کی بنا پر گرتے ہیں مثلاً حمل، ذہنی دباؤ، پریشانی، بلیچنگ، بیماری اور سر کی چھوت۔ اگر بال گرنا وراثت میں ملا ہے، تو ڈاکٹر کے مشورے سے مائنوکسیڈل (Minoxidil) دوا استعمال کیجیے۔

مزید قدرتی علاج یہ ہے کہ ورزش کیجیے جو سر سمیت پورے جسم میں خون کی روانی بڑھاتی ہے۔ سر پہ ناریل یا آملے کا تیل لگائیے، یوں بالوں کو غذائیت ملتی ہے۔

انڈا بھی گرتے بالوں کی خرابی دور کرتا ہے۔ ایک انڈے کی سفیدی لیجیے اور اس میں زیتون کے تیل کی ایک چمچی ڈالیے۔ آمیزہ اچھی طرح ملائیے اور پھر سر پہ لگائیے۔ پندرہ منٹ بعد سر ٹھنڈے پانی اور عمدہ شیمپو سے دھو لیجیے۔ امید ہے یہ ٹوٹکا کارگر ثابت ہوگا۔

توجہ فرمائیے

قارئین اپنا مسئلہ ڈاک سے بھجوانے کے علاوہ موبائل نمبر ۰۳۰۳-۴۴۸۰۸۱۴ پر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ اپنا نام اور شہر کا نام ضرور لکھیے۔ درج بالا نمبر پر میسج صرف وصول کیے جاتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

دستوں میں خون

میرا بیٹا ۱۰ ماہ کا ہے۔ وہ ہر دو ہفتے بعد ایسے دست کرتا ہے جن میں خون آتا ہے۔ یہ خرابی کیسے دور ہوگی؟

(جاوید اکبر، لالہ موسیٰ)

دست میں خون آنا خطرے کی نشانی ہے اور اس خلل کی اصل وجہ طبی معائنے سے ڈاکٹر ہی دریافت کر سکتا ہے۔ عموماً قبض یا سخت پاخانہ آنے سے مقعد میں زخم ہو جاتا ہے۔ وہاں سے نکلتا خون پھر پاخانے یا دست میں شامل ہوتا ہے۔

بچے کا نظام ہضم خراب ہو، تبھی وہ ہر پندرہ دن بعد دست کرتا ہے۔ تب بعض ناپسندیدہ غذاؤں کے ردعمل سے بھی آنتوں سے نکلا خون دست میں شامل ہو سکتا ہے۔ بہرحال مشورہ یہی ہے کہ آپ پہلی فرصت میں بچے کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیے۔ وہ بہتر مشورہ دے گا۔

کبوتر کی بیٹ

ہمارے گھر میں کافی چھجے بنے ہیں جہاں کبوتر بسیرا کر چکے۔ ان کی بیٹیں سارے صحن کو گندا کر دیتی ہیں۔ کبوتر بھگانے کا ٹوٹکا بتائیے۔ (علیم خان، کوئٹہ)

کبوتروں سے انسانوں کو بعض بیماریاں منتقل ہوتی ہیں۔ ان میں پھیپھڑوں کو نشانہ بنانے والی ہیسٹولازموسیس (Histoplasmosis)، شدید بخار پیدا کرنے والا مرض پسیٹا کوسس (Psittacosis) اور ایڈز جیسی خصوصیات رکھنے والی بیماری کرپٹوکوکوسیس (Crptococcsis) شامل ہیں۔

غذا اور پناہ گاہ..... کبوتر عموماً ان دونوں چیزوں کی مدد سے پلتے بڑھتے ہیں۔ لہٰذا گھر کے چھجوں میں بستے کبوتروں کو دانہ نہیں ڈالیے اور نہ ہی کوئی اور غذا دیجیے۔ دوسرا قدم یہ اٹھائیے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجیے، کبوتر چھجوں میں بسیرا نہ کر سکیں۔

مثال کے طور پر تاریں لگا کر چھجے بند کریں یا وہاں اینٹیں رکھ دیں۔ غرض ایسی تدبیر کیجیے کہ کبوتر چھجوں پر نہ بیٹھ سکیں۔ غذا اور پناہ گاہ سے محروم ہونے کے بعد کبوتر خود بخود چلے جائیں گے۔ یوں آپ کو بدبودار بیٹوں سے بھی نجات مل جائے گی۔

شدید قبض

میں شدید قبض کا شکار ہوں۔ قسم قسم کے علاج کر لیے، مگر کم ہی فائدہ ہوا۔ آپ ہی کوئی مشورہ دیجیے۔

(مسرت بیگم، راولپنڈی)

انسان کو جسے ہفتے میں صرف ایک بار پاخانہ آئے، تو وہ شدید قبض کا نشانہ بنتا ہے۔ تقریباً ہر بیماری کی طرح قبض ہونے کی مختلف وجوہ ہیں۔ آپ ڈاکٹروں سے طبی علاج کرا چکیں، لہٰذا اب قدرتی نسخے آزما کر دیکھیے۔ قبض دور کرنے والے قدرتی ٹوٹکے درج ذیل ہیں۔

ڈیڑھ چمچ اسپغول ایک گلاس پانی میں ملائیے۔ پانی دو گھنٹے کے لیے محفوظ مقام پر رکھ دیں۔ پھر پانی میں آدھ چمچ شہد اور ایک لیموں کا عرق ملائیے اور نوش کیجیے۔

ایسی غذائیں کھائیے جن میں فائبر یا ریشہ ہو۔ مثلاً مٹر، چھلکوں والی دالیں، بند گوبھی، ناشپاتی اور سیب بنا چھیلے کھائیں۔

صبح سویرے ایک چمچ زیتون کے تیل میں ایک چمچ لیموں کا عرق ملائیے اور پی جائیے۔ یہ آمیزہ خالی پیٹ لینا ضروری ہے۔ چند دن استعمال سے افاقہ ہوگا۔ یہ نسخہ نظام ہاضم کو متحرک رکھتا ہے۔ یوں قبض سے چھٹکارا ملتا ہے۔

ایک تازہ لیموں کا عرق نیم گرم پانی کے گلاس میں

www.pdfbooksfree.pk

ڈالیے اور نوش کیجیے۔ یہ پانی جسم کے زائد مادے نکال پھینکتا ہے۔

اپنے آپ کو متحرک رکھیے۔ دن کا بیشتر حصہ بیٹھ کر گزارنے سے عموماً قبض چمٹ جاتی ہے۔

کھانے کا (بیکنگ) پاؤڈر میٹھا سوڈا قبض سے عارضی نجات پانے کا عمدہ نسخہ ہے۔ ایک چوتھائی پانی (۴/۱) کے گلاس میں ایک چمچی میٹھا سوڈا ملائیے اور فوراً پی جائیے۔ یہ معدے میں دباؤ ختم کر کے طبیعت ہلکی کر دیتا ہے۔

سوکھے آلو بخارے کا رس لیجیے۔ ایک گلاس صبح اور ایک گلاس رات کو نوش کریں۔ چند دن بعد دیکھیے افاقہ ہو گا۔ آپ سوکھے آلو بخارے کے چھے سات دانے کھا بھی سکتی ہیں۔

سکروندے کے پتوں سے بنی چائے پیجیے۔ دو چمچ پتے لیجیے۔ انھیں ایک پیالی میں ڈالیے اور اوپر سے ابلتا پانی ڈال دیجیے۔ پیالی ڈھک کر دس منٹ انتظار کیجیے پھر یہ چائے پی لیجیے۔ اگر قبض شدید ہے، تو یہ چائے صبح، دوپہر اور شام پیجیے۔ ان شاء اللہ چند دن میں افاقہ ہو گا۔

بچی تنگ کرتی ہے

میں ایک دو سالہ بچی کی ماں ہوں۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت تنگ کرتی ہے۔ اکثر کھایا پیا اگل دیتی ہے۔ اس مسئلے کا کوئی حل بتائیے۔

(بیگم فریدہ مرزا، کوئٹہ)

دو سے پانچ سال کے بچے من موجی ہوتے اور اپنی مرضی چلاتے ہیں۔ خاص طور پر وہ چاہتے ہیں کہ اپنی مرضی سے کھائیں پئیں۔ اسی لیے اگر آپ کی پیاری بیٹی صحت مند ہے اور اس کی نشوونما معمول کے مطابق جاری ہے، تو پریشان نہ ہوں۔ یہ اعتماد رکھیے کہ بیٹی کو جب بھی بھوک لگی، وہ خود کھانا مانگے گی۔ لہٰذا اسے زبردستی کوئی غذا نہ کھلائیے۔ مزید برآں بعد میں بھی یہ سوچ کر اسے زائد غذا نہ دیں کہ اس نے ایک وقت کا کھانا نہیں کھایا۔

اس کے علاوہ بیٹی جو اشیا کھانا پسند کرتی ہے، اسے وہ کھلائیے۔ ذرا سوچیے، آپ کو جو غذائیں پسند نہیں، اگر کوئی زبردستی وہی آپ کو کھلانا چاہے، تو یقیناً آپ ناگواری محسوس کریں گی۔ لہٰذا بیٹی کو کھانے پینے کے معاملے میں کچھ اختیار دیجیے، صورت حال بہتر ہو جائے گی۔

آپ ردی (Junk) غذا کھا کر وزن نہ بڑھائیے بلکہ صحت بخش خوراک کھائیے..... ایسی غذا جو آپ کو غذائیت اور حرارے فراہم کرے۔

بیٹی کچھ نہیں کھاتی پیتی

میں ۱۰ ماہ کی بیٹی کا باپ ہوں۔ میری بیٹی دودھ پینے کے علاوہ کچھ نہیں کھاتی پیتی۔ کیا یہ تشویش ناک بات ہے؟ (سجاد احمد، خان گڑھ)

چھے سے بارہ ماہ کی عمر کے کئی بچے بچیاں دودھ کو ٹھوس غذا پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ چوسنی سے دودھ پینا آسان ہے۔ جبکہ غذا کو چبا کر نگلنا مشکل لگتا ہے۔ اگر آپ کی بچی مطلوبہ مقدار میں ماں یا ڈبے کا دودھ پی رہی ہے، تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

دس ماہ کی بچی کو روزانہ فی پونڈ وزن کے لحاظ سے ۲ راونس دودھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیشتر بچے بچیاں ۳۲ تا ۳۶ راونس پیتی ہیں۔ یہ دودھ وٹامن اور معدنیات کی مطلوبہ ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ چناں چہ بچوں کی ٹھوس غذا نہ کھانے والی ''ہڑتال'' سے انھیں کوئی طبی نقصان نہیں پہنچتا۔

www.pdfbooksfree.pk

زندگی کے پہلے سال نشوونما کے لیے درکار بیشتر حرارے بچے کو چکنائی (Fat) سے ملتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ماں کے دودھ کا ۵۰ فیصد حصہ چکنائی پر مشتمل تخلیق کیا ہے۔ اگر والدین یہ دیکھیں کہ بچے یا بچی کی نشوونما سست ہو چکی، تو اسے دودھ کے ساتھ کوئی چکنائی والی شے بھی دیں۔ مثال کے طور پر دودھ کی ہر بوتل میں آدھی چمچی السی کا تیل شامل کردیں۔ یہ تیل بچے کو روزانہ ۸۰ زائد حرارے دے گا۔

ٹھوس غذا پسند نہ کرنے والے بچے بچیوں کو ایسا کھانا دیجیے جو غذائیت سے پُر ہو، مثلاً دہی، انڈا (ایک سال کا ہونے پر)، گاجر اور السی کا تیل۔

بعض اوقات بچے بازار سے دستیاب بچوں کے لیے مخصوص کھانے نہیں کھاتے۔ ایسی صورت میں والدین یہ کریں کہ ان بچوں کو وہی کھلائیں جو خود کھاتے ہیں۔ یعنی تازہ پھل، پکی ہوئی سبزیاں، چربی سے پاک گوشت اور مچھلی۔ اس غذا کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بچہ شروع سے گھر کا پکا کھانا بہ رغبت کھانے لگتا ہے۔ اسے پھر بازاری کھانے پسند نہیں آتے جو عموماً بچوں کو فربہ کر انھیں ذیابیطس میں مبتلا کردیتے ہیں۔

پیٹ میں کیڑے

میرے بھانجے بھانجیوں کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ اس وجہ سے وہ بیمار رہتے ہیں۔ ان کے خاتمے کا کوئی طریقہ بتائیے۔ (صدف انصاری، کراچی)

پیٹ کے کیڑوں کی پانچ چھے اقسام ہیں۔ یہ سبھی کیڑے جانوروں میں پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا گوشت کھانے سے انسانی معدے میں بھی آپہنچتے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان پیٹ درد، دست، بخار، جسمانی کمزوری، تھکن وغیرہ کا شکار رہتا ہے۔

آپ نے بچوں کی عمریں نہیں لکھیں اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ ان کے پیٹ میں کیڑوں کی کون سی قسم تنگ کررہی ہے۔ بہرحال ذیل میں کیڑے مارنے کے قدرتی نسخے پیش ہیں:

☆ بچوں کو صبح ناشتے میں ایک چمچ باریک کٹا ناریل کھلائیے۔ ڈھائی تین گھنٹے بعد ایک گلاس نیم گرم دودھ میں دو چمچ ارنڈ کا تیل (کیسٹر آئل) ملائیے اور بچوں کو پلائیے۔ لیکن بچوں کی عمر ۵ سال سے کم ہے، تو ارنڈ کا تیل نہ دیجیے۔

☆ ایک چمچ پپیتے کے گودے میں ایک چمچی خالص شہد ملائیے۔ یہ آمیزہ صبح سویرے خالی پیٹ بچوں کو کھلائیے۔ کچھ دیر بعد انھیں گرم دودھ پلائیے اس میں ایک چمچی ارنڈ کا تیل ملا دیں۔ یہ عمل دو تین دن کیجیے۔

پیٹ کے کیڑے مارنے والی ایلوپیتھک ادویہ بھی دستیاب ہیں تاہم وہ زہریلی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کا زہر ہی کیڑے مارتا ہے۔ مزید برآں خصوصاً بچوں میں ان کے ضمنی اثرات بہ شدت ظاہر ہوتے ہیں۔

موٹا ہونا چاہتا ہوں

میں کمزور بدن کا مالک ہوں۔ فربہ ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے مشورہ دیجیے۔ (یاسر، بہاولپور)

لوگوں کی اکثریت یہ خواہش رکھتی ہے کہ وہ دبلے ہو جائیں، مگر آپ کی تمنا برعکس ہے۔ بہرحال آپ ردی (Junk) غذا کھا کر وزن نہ بڑھائیے بلکہ صحت بخش خوراک کھائیے..... ایسی غذا جو آپ کو غذائیت اور حرارے فراہم کرے۔

مثال کے طور پر صبح ناشتے میں روٹی، انڈا اور کیلا کھائیے۔ دوپہر کو معتدل مقدار میں گوشت لیں۔ رات کے وقت سبزی لیجیے۔ ساتھ ساتھ دودھ اور مغزیات کا

www.pdfbooksfree.pk

استعمال بھی جاری رکھیے۔ سبزیوں میں آلو، شلجم، پالک اور گوبھی غذائیت کا خزانہ ہیں۔

مزید برآں دن میں پانچ چھے بار غذا کھائیے تاکہ اپنا وزن بڑھا سکیں۔ عضلات کی موٹائی بڑھانے کے لیے مرغ اور مچھلی کا گوشت کھائیے۔ امید ہے کہ درج بالا تجاویز پر عمل کرنے سے دو تین ماہ میں آپ کا وزن خاطر خواہ بڑھ جائے گا۔

حساس بہن

میری بڑی بہن ۳۸ سال کی ہیں۔ ان کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ وہ بہت حساس ہوچکیں۔ معمولی بات پہ رو پڑتی ہیں۔ غصہ آئے، تو چیزیں اٹھا کر مارتی ہیں۔ ان کا کچھ علاج بتائیے۔ (مریم، جہلم)

آپ کی بہن ڈپریشن کا شکار ہیں۔ اس صورت حال میں ضروری ہے کہ اہل خانہ ان کی دلجوئی کریں اور ایسی کوئی حرکت نہ ہونے دیں جس سے بہن مشتعل ہو۔ بہتر ہے کہ بہن کی شادی کا بندوبست کیجیے۔ اگر اہل خانہ نے ان کی دیکھ بھال نہ کی، تو معاملہ بگڑ کر شیزوفرینیا تک پہنچ سکتا ہے۔

ایک حل یہ ہے کہ انھیں اچھے نفسیات دان کے پاس لے جائیے۔ بعض اوقات ادویہ کھانے سے ڈپریشن دور ہو جاتا ہے۔ آپ بہن سے بول چال رکھیے، اس کے ساتھ مختلف اندرون خانہ کھیل مثلاً لڈو کھیلیں اور انھیں زندگی سے پیار کرنا سکھائیے۔ اگر ڈپریشن کی مریضہ کو اہل خانہ کی مدد نہ ملے، تو حالت بگڑتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا بہن پر توجہ دے کر آپ ایک قیمتی زندگی محفوظ کرسکتی ہیں۔ اگر بہن کے ناز نخرے بھی اٹھانے پڑیں، تو اٹھائیے۔

کمر میں درد

چھے ماہ قبل میرا بیٹا تولد ہوا۔ تب سے میری کمر میں درد چلا آرہا ہے۔ یہ کیسے دور ہوگا؟ (بیگم علی اختر، سیالکوٹ)

حمل کے دوران اور بعد میں کمر درد ہونا معمول ہے۔ تحقیق کے مطابق ۵۰ فیصد حاملہ خواتین کمر درد کا نشانہ بنتی ہیں۔ آپ اپنی تکلیف سے نجات کے لیے درج ذیل اقدامات کیجیے:

☆ ورزش کیجیے۔ اس ضمن میں معتدل رفتار میں پیدل چلنا سودمند ہے۔ تاہم درد بڑھ جائے، تو زبردستی نہ چلیے ورنہ کمر کے پٹھوں میں مزید اکڑن ہوگی۔ شروع میں آہستہ چلیے، پھر رفتار بڑھاتی جائیے۔ کمر کی ورزشیں بھی کرسکتی ہیں۔

☆ نرمی سے کمر کی مالش کیجیے۔ اس ضمن میں زیتون یا سرسوں کا تیل استعمال کرسکتی ہیں۔ تاہم مالش کا دورانیہ زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

☆ کمر پر گرم پانی کی ٹکور کیجیے۔ لیکن پانی زیادہ گرم نہ ہو۔

☆ کمر کے پٹھوں میں زیادہ کھچاؤ ہو، تو ان پر ہومیوپیتھک آرنیکا (Arnica) کریم لگائیے۔

اگر درج بالا تراکیب آزمانے کے باوجود کمر درد برقرار رہے، تو ڈاکٹر سے رجوع کیجیے۔

سانس اور جلد کے امراض

ایلوویرا کے فوائد بتائیے۔ کیا یہ سانس اور جلد کے امراض میں مفید ثابت ہوتی ہے؟ (عالیہ علی، تربت)

اردو میں ایلوویرا کو کوارگندل کہتے ہیں۔ یہ ایسا پودا ہے جس کے پتوں میں گودا ہوتا ہے۔ جدید طبی تحقیق کے مطابق یہ گودا دمہ، سی، ای اور فولک ایسڈ کا حامل ہے۔ اس میں انسانی صحت کے لیے مفید امائنو تیزاب بھی ملتے ہیں۔ اسی لیے اب یورپ میں اس کا گودا بطور سلاد

www.pdfbooksfree.pk

کھایا جارہا ہے۔ یہ نظامِ ہضم کو تقویت پہنچاتا اور قبض دور کرتا ہے۔ نیز بدن کے فاسد مادے نکال پھینکتا ہے۔

گودے سے جیلی جیسا مادہ نکلتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایلوویرا کے پتے کا بالائی حصہ چھیل لیں۔ نیچے سے جیلی نما مادہ نکل آئے گا۔ یہ مادہ جلد کے لیے مفید ہے۔ چہرے پہ دانے یا داغ دھبے ہوں، تو ایک ہفتے تک مادہ معتدل مقدار میں لگائیے۔ چہرہ پہلے سے زیادہ صاف اور نکھرا نظر آئے گا۔

ایلوویرا سانس کی بیماریوں خصوصاً دمے میں بھی مفید ہے۔ استعمال کا طریق کار یہ ہے کہ ایک چھوٹی پتیلی میں پانی ابالیے۔ جب پانی اُبلنے لگے، تو اس میں ایک چمچ ایلوویرا کی جیلی ملا دیجیے۔ اب اس پانی کی بھاپ لیجیے۔ ایلوویرا کے مفید طبی اجزا سانس کی نالیاں کھول دیں گے۔ یوں سانس لینے میں دشواری نہیں رہے گی۔

اگر گلا خراب ہے، تب بھی ایلوویرا کام دیتا ہے۔ گرم پانی میں ایک چمچ جیلی ملائیے۔ پھر اس سے ہر کھانے کے بعد غرارے کیجیے۔ چند بار یہ عمل کرنے سے گلا ٹھیک ہو جائے گا۔

بھولنے کی بیماری

مجھے بھولنے کا مرض لاحق ہے۔ کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ کیا میری یادداشت درست ہوسکتی ہے؟

(عاقل عمر، سکھر)

سر پر چوٹ لگنے یا کسی صدمے کے باعث یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس ضمن کا کوئی ادویاتی علاج نہیں کیونکہ اب تک یادداشت قوی کرنے والی دوا ایجاد نہیں ہوسکی۔ البتہ بعض غذائیں مثلاً ثابت اناج، مچھلی، ٹماٹر، بادام، اخروٹ وغیرہ دماغی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہیں۔

آپ کسی ڈاکٹر سے اپنا طبی معائنہ کرائیے۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ بھولنے کا مرض کسی جسمانی چوٹ کا نتیجہ ہے یا جذباتی صدمے سے پیدا ہوا۔ تشخیص کے مطابق وہ پھر علاج بھی تجویز کرے گا۔

گلا خراب رہتا ہے

میرا گلا ہر ایک دو ہفتے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کے متعلق کچھ بتائیے۔

(سلیم ماہر، ڈیرہ غازی خان)

گلے کا عام درد چھوت کے باعث جنم لیتا اور عموماً ایک دو ہفتے میں کافور ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ کا مرض کسی سنگین مسئلے کی سمت اشارہ کررہا ہے۔ یاد رہے، مسلسل گلا خراب رہنا سرطان چمٹنے کی نشانی بھی ہے۔ لہٰذا پہلی فرصت میں ڈاکٹر سے اپنے گلے کا معائنہ کرائیے۔

بال سفید ہو چکے

میری عمر ۱۷ سال ہے۔ میرے بال سفید ہو رہے ہیں۔ جبکہ نظر بھی کمزور ہو چکی۔ تندرستی کے لیے مشورہ دیجیے۔

(ذیشان حسن، قصور)

بال عمر کے کسی بھی دور میں سفید ہو سکتے ہیں۔ وجہ یہ کہ بالوں کی تھیلیوں (Follicles) میں موجود خلیے انھیں رنگ بخشتے ہیں۔ جب یہ خلیے کسی وجہ سے اپنا کام کرنا چھوڑ دیں، تو بال بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر ہمیں سفید نظر آتے ہیں۔ عموماً ذہنی دباؤ اور ناقص غذا کے سبب تھیلیوں کے خلیوں میں خرابی جنم لیتی ہے۔ لہٰذا پرسکون ہونے، پریشانیوں سے بچنے اور غذائیت سے بھرپور کھانے کے ذریعے مزید سیاہ بالوں کو بے رنگ ہونے سے روکنا ممکن ہے۔

نوجوانی میں نظر کمزور ہونے کی مختلف وجوہ ہیں۔ مثال کے طور پر رات دیر تک جاگنا، طویل دورانیہ ٹی وی

www.pdfbooksfree.pk

دیکھنا، وٹامن اے کی کمی، ناقص غذا کھانا، ہر وقت پریشان رہنا وغیرہ۔ کمزوری نظر کے سلسلے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ خلل کیوں پیدا ہوا۔ بہرحال بینائی بہتر کرنے کے لیے درج ذیل نسخے آزمائیے۔

☆ بادام، سونف اور مصری ہم وزن لیں اور تینوں کو کوٹ لیں۔ سفوف پھر کسی بوتل میں رکھیے۔ ہر رات کو ایک چمچ یہ سفوف ایک گلاس دودھ میں ملائیے اور پی جائیے۔ یہ عمل چالیس دن تک انجام دیجیے۔ امید ہے، نظر بہتر ہو جائے گی۔

رات کو ۱۰ تا ۱۵ بادام ایک گلاس پانی میں بھگوئیے۔ صبح سویرے باداموں کا چھلکا اتاریئے اور اچھی طرح چبا کر کھالیجیے۔ بعدازاں دودھ کا گلاس بھی پی سکتے ہیں۔

ذیابیطس سے چھٹکارا

ذیابیطس کا مریض ہوں۔ پیروں کی انگلیوں میں اکثر درد رہتا ہے۔ اس کا علاج بتائیے

(خالدہ قریشی، لاہور)

ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں میں درد اور سنسناہٹ ہونا ذیابیطس کی واضح علامت ہے۔ گو یہ درد کیوں جنم لیتا ہے، ماہرین اس کی وجہ دریافت نہیں کر سکے۔ تاہم انھیں یہ ضرور معلوم ہے کہ انگلیوں میں واصلی بافتوں (Connective tissues) کے سخت ہونے اور اکڑنے سے درد جنم لیتا ہے۔

ہمارے جسم میں واصلی بافتیں رباط (ligamints) اور نسوں (Tenddons) پر مشتمل ہیں۔ انہی کے ذریعے ہمارا ڈھانچہ قائم و دائم رہتا ہے۔ یہ بافتیں لچک دار پروٹینی مادے، کولاجن سے بنتی ہیں۔ جب کولاجن مادہ سخت ہو جائے، تو ہمارے جسمانی جوڑ صحیح طرح اپنا کام نہیں کر پاتے اور تکلیف دینے لگتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جب ذیابیطس انسان کو چمٹے، تو خون میں شکر کی بلند سطح پروٹینی مادوں کا قدرتی توازن بگاڑ دیتی ہے۔ یا پھر سوزش پیدا کرنے والا کوئی عمل یہ توازن خراب کرتا ہے۔ بہرحال ذیابیطس میں کولاجن سخت ہونے سے ہاتھ پیروں کی انگلیوں میں سنسناہٹ اور تکلیف ہوتی ہے۔

اس تکلیف کا علاج یہی ہے کہ صبح سویرے انگلیوں کی ورزش کیجیے اور انھیں ہلائیے۔ شروع میں شاید کچھ تکلیف ہو، مگر ورزش عادی ہونے پر جاتی رہے گی۔ اگر انگلیوں کو ہلایا جلایا نہ جائے، تو جوڑوں کی سختی بڑھتی جاتی ہے۔

گرمائش بافتوں کی اینٹھن دور کرتی ہے۔ جبکہ ٹھنڈک ان کا درد اور سوزش بھگاتی ہے۔ لہٰذا انگلیوں کو گرمائش اور ٹھنڈک، دونوں دے کر دیکھیے، کسی ایک عمل سے افاقہ ہوگا۔

گرمائش بافتوں کی اینٹھن دور کرتی ہے۔ جبکہ ٹھنڈک ان کا درد اور سوزش بھگاتی ہے۔

دیگر مشورے یہ ہیں: انگلیوں کی مالش کیجیے۔ (تاہم زیادہ درد ہو، تو نہ کریں)۔ مالش سے عضلات تک تازہ آکسیجن اور غذائیت پہنچتی ہے۔ بھاری وزن اٹھانے سے بچیے اور خون میں شکر کی سطح متوازن کیجیے۔

کمزوریِ نظر کا علاج

میری نظر کمزور ہے۔ بادام، سونف اور مصری کا مرکب کھایا، مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ نظر تیز کرنے کے لیے تجاویز دیجیے۔

(بیگم ذوالفقار شاہ، پشاور)

جب ایک دفعہ نظر خراب ہو جائے، تو اُسے صرف آپریشن کے ذریعے ہی تقریباً ۱۰۰ فیصد درست کرنا ممکن ہے۔ اگر آپریشن نہیں کروانا، تو پھر طرز زندگی میں

www.pdfbooksfree.pk

تبدیلیاں لا کر نظر تیز کی جا سکتی ہے۔ لیکن بادام کھانا محض ایک عمل ہے، طرز زندگی مکمل طور پر بدلے بغیر اس نسخے سے فائدہ نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر ردی (Junk) غذا کھانا، مسلسل ٹی وی یا کمپیوٹر پر بیٹھنا، آنکھوں کی ورزش نہ کرنا، فکر مند رہنا...... یہ تمام اعمال ہماری بینائی پر منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ ایسی صورت میں محض بادام و سونف کھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

لہٰذا میری بہن، ایسی غذائیں کھائیے جن سے جسم کو وٹامن اے، سی اور ای، اومیگا تھری فیٹی تیزابیت، اور لیوٹن میسر آئیں۔ یہ تمام غذائی عنصر بینائی کی حفاظت کرتے ہیں۔

دوسرے ٹی وی اور کمپیوٹر دیکھنا ہی ہے، تو مسلسل نظریں نہ جمایئے۔ ہر ۲۰ منٹ بعد ۲۰ سیکنڈ کے لیے ۲۰ فٹ دور موجود کسی شے کو دیکھیے۔ یہ چھوٹی سی ورزش بینائی طاقتور رکھتی ہے۔ آپ ماہر امراضِ چشم سے پوچھ کر آنکھوں کی دیگر ورزشیں بھی کر سکتی ہیں۔ یہ بینائی کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

اچھی غذا کھانے، سات آٹھ گھنٹے نیند لینے، فکرو پریشانی سے دور رہنے اور آنکھوں کی ورزشیں کرنے سے آپ اپنی بینائی ٹھیک کر سکتی ہیں۔

اعضا سن رہتے ہیں

میرے جسم کے تمام اعضا عموماً سن رہتے ہیں۔ کئی ادویہ کھا چکا، مگر آرام نہیں آیا۔ آپ کوئی مشورہ دیجیے۔

(جاوید صدیقی، مانسہرہ)

اعضا میں سنسناہٹ اور درد ہونا کئی وجوہ سے جنم لیتا ہے۔ مثلاً ذیابیطس، جسم میں غذائیت (وٹامن معدنیات) کی کمی، نسوں کو ضرب پہنچنا، شریانوں (Arteries) کا تخت ہونا وغیرہ۔ لہٰذا آپ سب سے پہلے کسی اچھے ڈاکٹر سے ملیے تاکہ وہ اعضا سن ہونے کی وجہ جان سکے۔ تب ہی اس کا شافی علاج ہو سکے گا۔

عام طور پر یہ سنسناہٹ بدن میں وٹامن بی ۱۲ کی کمی سے ہوتی ہے۔ لہٰذا طبی معائنے سے یہ وجہ دریافت ہوگی۔ فولاد کی کمی بھی یہی اثرات پیدا کرتی ہے۔

قبض کا مرض

مجھے اکثر قبض رہتی ہے۔ اس سے چھٹکارے کا طریقہ بتایئے۔ (مجتبیٰ احمد، ہری پور)

قبض ایک موذی بیماری ہے جو شدید ہونے پر انسان کو کسی کام کے قابل نہیں چھوڑتی، بہرحال اس مرض سے چھٹکارے کے لیے کچھ مشورے شروع میں بتائے جا چکے، مزید تجاویز درج ہیں:

سب سے پہلے تو خوراک میں ریشے والی (Fiber) غذائیں زیادہ رکھیے مثلاً خوبانی، پھلیاں، آلو (چپس نہیں) ثابت اناج اور گوبھی۔ ریشہ آنتوں میں غذاؤں کو جمنے نہیں دیتا اور یوں پاخانہ کھل کر آتا ہے۔

قبض سے نجات پانے کا ایک اور قدرتی طریقہ یہ ہے: کنو کا ایک گلاس رس لیجیے، اس میں کنوؤں کا گودا بھی ڈال دیجیے، اس رس میں ایک چمچ السی کا تیل ملایئے اور پی جایئے۔ پانچ چھے گھنٹے بعد آپ افاقہ محسوس کریں گے۔

طرز زندگی میں یہ تبدیلی لایئے یعنی حرکت کیجیے اور زیادہ دیر نہ بیٹھیے۔ صبح سویرے ورزش کیجیے، یہ قبض کا موثر قدرتی علاج ہے۔ نیز پانی خوب نوش کیجیے۔ جسم میں پانی کی فراوانی آنتوں میں فضلہ نہیں جمنے دیتی۔ موسم ہو، تو آلو بخارا کھایئے، یہ بھی قبض دور کرتا ہے۔ یہ تجاویز اختیار کر کے آپ قبض سے نجات پا سکتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

خوشی اور غم زندگی کا حصہ ہیں۔ انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، وہ کسی نہ کسی خاندان، قبیلے، گاؤں، شہر اور ملک سے منسلک ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے بہت ساری خوشیاں اور غم بھی اجتماعی ہوتے ہیں۔ خوشی کے کچھ تہواروں کی نوعیت ہے مثلاً عید یا کرسمس۔ لیکن یہاں ایسے تہواروں کے بارے میں آپ کو آگاہ کیا جا رہا ہے جو خاصی حد تک غیر مذہبی

معلومات

ہیں اور ان کی ثقافتی روایت بہت قدیم ہے۔

سعودی عرب

عام تاثر یہ ہے کہ سعودی عرب میں زندگی مذہب کے گرد گھومتی ہے۔ یہ تاثر ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن عرب اسلام سے پہلے بھی توانا ثقافتی روایات رکھتے تھے۔ وہ ان کا آج بھی فخر سے ذکر کرتے ہیں۔ آپ نے سوق

ہنسی، قہقہوں اور کھیلوں سے سجے

دنیا کے رنگ برنگے تہوار

روزمرہ معمول سے اکتائے لوگوں کو مسرت و خوشی کی انمول گھڑیاں عطا کرنے والے تحفے

محمد خلیل چودھری

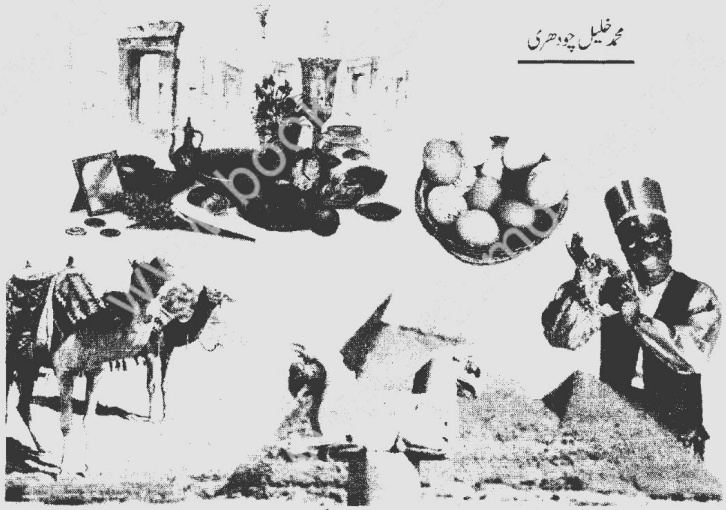

www.pdfbooksfree.pk

عکاظ کا نام سنا ہوگا۔ یہ ایک سالانہ میلا نما بازار تھا جو طائف میں لگتا۔ بہت قدیم وہاں دو چیزیں بہت اہم تھیں: ایک تجارت اور دوسری شاعری۔

جب یہ بازار لگتا، تو وہاں نامی گرامی شعرا اپنے اپنے قصیدے سناتے۔ اس شاعرانہ مقابلے کے باقاعدہ جج ہوتے۔ اوّل آنے والے قصیدے کو خانہ کعبہ کی دیوار پر ایک سال کے لیے لٹکا دیا جاتا۔ وہ تمام شاندار قصیدے جنھیں یہ شرف حاصل ہوا، انھیں شوق سے ''معلقات'' کہا جاتا ہے۔ عربی شاعری سے شغف رکھنے والے آج بھی معلقات شوق سے پڑھتے ہیں۔ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے، اخباروں میں آیا کہ مکہ المکرمہ کے گورنر، شہزادہ خالد الفیصل سوق عکاظ کا احیا چاہتے ہیں۔ وہ خود بھی نامور شاعر ہیں۔ عرب معاشرے میں شروع سے شعرا کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

حال ہی میں مرحوم ہونے والے شاہ عبداللہ جب ولی عہد تھے، تو انھوں نے ریاض کے قریب واقع علاقہ جنادریہ میں لوک میلے کا آغاز کیا۔ یہ ثقافتی میلا دو ہفتے چلتا۔ اس میلے کا سب سے دلچسپ آئٹم اونٹوں کی دوڑ تھی۔ اس کے علاوہ لوک موسیقی اور ناچ بھی میلے کا حصہ تھے۔ گاجر اور میدے سے بنا روایتی کیک مہمانوں میں تقسیم ہوتا۔ سعودی لوک ناچ ''عرضہ'' فتح کا رقص ہے۔ نوجوان لڑکے یہ رقص ہاتھ میں تلوار پکڑ کر کرتے اور ساتھ ساتھ فتح کی خوشی کے گانے گاتے۔

مصر میں شم النسیم کا تہوار بہت اہم ہے۔ اس تہوار کی تاریخ چار ہزار سال پرانی ہے۔ یہ جشن ماہ اپریل میں ایسٹر کے فوراً بعد منایا جاتا ہے۔ یہ بہار کی آمد کا جشن ہے۔ مسلمان اور مسیحی، سب یہ تہوار مناتے ہیں۔ شم النسیم کے لفظی معنی تازہ ہوا میں سانس لینا ہے۔

اس دن دریائے نیل میں بے شمار کشتیاں نظر آتی ہیں۔ لوگ خاص طرز کی مچھلی پکاتے ہیں۔ انڈے ابال کر ان کے اوپر رنگ کیا جاتا ہے۔ وہ پھر مہمانوں کو پیش کیے جاتے ہیں۔ قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ کرۂ ارض پر آفرینش حیات اسی روز ہوئی تھی۔ تب مصر میں لوگ انڈے ابال ان کے اوپر دعائیں اور نیک خواہشات لکھ درختوں پر باندھ دیتے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اس طرح یہ دعائیں شرف قبولیت پاتی ہیں۔ اب یہ اعتقاد تو بدل چکا البتہ روایت کے طور پر رنگین انڈے اب بھی شم النسیم کا حصہ ہیں۔

جشن نوروز

یہ تہوار ۲۱ مارچ کو منایا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نوروز آمد بہار کی علامت ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ ۲۱ مارچ کو روز و شب کا دورانیہ بالکل برابر رہتا ہے۔ تب سورج برج حوت سے نکل کر برج حمل میں داخل ہوتا ہے۔ نوروز دراصل ایرانی جشن بہاراں ہے۔

صاحبِ تحریر

دینہ کے پُرفضا مقام پر جنم لینے والے محمد خلیل چودھری پچھلے ۲۲ برس سے طلبہ کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بھی ہے۔ اسی لیے کتب و رسائل شوق سے خریدتے اور قلم کاری بھی کرتے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ سمیت وطنِ عزیز کے مختلف علمی و ادبی رسائل میں آپ کی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحریریں معلومات افروز ہوتی ہیں اور دلچسپ بھی۔

www.pdfbooksfree.pk

لیکن اب یہ افغانستان، پورے وسطی ایشیا اور ترکی کے مشرقی حصے میں بھی منایا جاتا ہے۔

زمانہ قدیم میں مختلف علاقوں کے والی نوروز کے دن شہنشاہ آریہ مہر کے پاس بیش بہا تحفے تحائف لے کر حاضر ہوتے۔ پورے ملک میں جشن کا سماں ہوتا۔ ان علاقوں میں برف باری خوب ہوتی ہے۔ لیکن اکیس مارچ تک برف پگھل جاتی اور سبز رنگ ہر طرف نمایاں ہو جاتا۔ اب تہران، تاشقند اور دوشنبے جیسے شہروں میں اکثریت فلیٹوں میں رہتی ہے۔ لہٰذا لوگ گملوں میں گندم کے بیج ڈال دیتے ہیں۔ نوروز پر یہ گملے بہار کی علامت بن جاتے ہیں۔

تاجکستان کے باشندے خصوصاً رقص و سرور کے دلدادہ ہیں۔ وہاں جشن نوروز کے موقع پر ہر طرف موسیقی کے سر بکھیرے ہوتے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں شوخ رنگوں والی ریشمی قمیصیں پہنتی ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں تاجکستان نیا نیا خانہ جنگی سے نکلا تھا۔ تاجک عمومی طور پر افسردہ تھے۔ کیونکہ دوشنبے میں پچاس ہزار لوگ ہلاک ہو چکے تھے۔ لیکن نوروز جیسے تہوار اور جشن غم بھلانے کا ذریعہ بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگ جشن نوروز دوبارہ منانے لگے۔ ۲۰۱۰ء میں یونیسکو نے اس تہوار کو انسانی ثقافتی ورثہ قرار دیا۔ یہ جشن اب بہت بڑے خطے میں منایا جاتا ہے۔

پانی کا میلا

رنگون میں آبی میلا (واٹر فیسٹیول) بڑے اہتمام سے برما کے دارالحکومت، منایا جاتا ہے۔ یہ برما کے علاوہ تھائی لینڈ، لاؤس اور کمبوڈیا میں بھی منعقد ہوتا ہے۔ یہ موسمی تہوار ہے۔ اپریل کے وسط میں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اپریل اس علاقے کا گرم ترین مہینا ہے۔ آبی میلے کے بعد موسم برسات شروع ہو جاتا ہے۔ وہ چھے ماہ جاری رہتا ہے۔ گویا یہ میلا برسات کا استقبالی ہے۔

اسی دن لوگ سڑکوں پر نکل کر ایک دوسرے پر پانی پھینکتے ہیں۔ بنکاک میں دریا میں ڈریگن ریس ہوتی ہے۔ یہ ایسی کشتیوں کی دوڑ ہے جو اژدہے کی شکل میں بنائی جاتی ہیں۔ گھر کی پرانی اشیا باہر پھینک یا غریبوں کو دی جاتی ہیں۔ آبی میلے کے تیسرے روز گوتم بدھ کے مجسمے دھوئے جاتے ہیں۔ تازہ ناریل، کیلے کے پتوں پر رکھ کر بدھ بھکشوؤں کو تحفتہ دیتے ہیں۔

برف کے میلے

کینیڈا میں عجیب و غریب "کیوبک وِنٹر کارنیوال" منعقد ہوتا اور حلوں کی شکل میں چلتا ہے۔ سخت سردی کے موسم میں یہ پریڈ رات کو ہوتی ہے۔ کینیڈا میں پانچ ماہ سخت سردی پڑتی اور ہر طرف برف ہی برف دکھائی دیتی ہے۔ یہ کارنیوال کیوبک شہر میں ہوتا ہے۔ لوگ برف سے مجسمے بناتے ہیں۔ مختلف فوٹ کارنیوال میں آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ لوگ رقص و سرور میں مشغول ہوتے ہیں۔

دراصل کینیڈین طویل موسم سرما کے دوران گھروں میں بیٹھ بیٹھ کر اکتا جاتے ہیں۔ لہٰذا موسم کی بوریت ختم کرنے کے لیے سردیوں میں بھی ایک روزہ میلے لگتے ہیں۔ اگر ویک اینڈ ہو اور دھوپ نکلی ہو، تو برف سے بھی لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ برف کے مجسمے بناتے اور چھوٹی چھوٹی دکانیں لگا کر دستکاریاں بیچتے ہیں۔ اس مارکیٹ کو فی (Flea) مارکیٹ کہا جاتا ہے۔ انہی برف کے میلوں کے تناظر میں ایک شعر آپ بھی سنیے۔

کل دھوپ کے میلے میں خریدے تھے کھلونے
جو موسم کا پتلا تھا، وہ گھر تک نہیں پہنچا

خوشی اور غم زندگی کا حصہ ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں میلے لگتے ہیں تاکہ لوگ خوشیاں منا سکیں اور مزے سے وقت گزاریں۔ دیگر میلوں کا احوال پھر کبھی سہی!

www.pdfbooksfree.pk

معاشرتی کہانی

اچھی خاصی معقول لگنے والی

وہ لڑکی تو ٹھگ نکلی

دوست کے بھیس میں لٹیرن بنی
ایک دوشیزہ کا عبرت اثر ماجرا

راحت عائشہ

"اوہ آج بھی مجھے دیر ہو گئی۔ کیا سر آ گئے؟" ثوبیہ نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ مہینے میں بیس دن اس کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا۔

"نہیں، سر تو نہیں آئے لیکن آپ پانچ منٹ ضرور دیر سے آئی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے ایک نظر حمیدی صاحب والے کمرے کے بند دروازے پر ڈالی اور بے وجہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ شاید بے وجہ نہیں پریشانی سے آزادی پر! اسے یونہی اکثر بات بے بات کھلکھلا کر ہنسنے کی عادت تھی اور شاید اسے معلوم بھی تھا کہ وہ ہنستی ہوئی بہت پیاری لگتی ہے۔

"تمھیں تو معلوم ہے، پہلے صبح صبح امی کو ناشتہ کرواں، پھر دوائیں کھلانا، تیاری کرنا اور دو دو بسیں بدل کے یہاں تک پہنچنا کوئی آسان کام تو نہیں نا؟" اس نے حسب عادت لمبی بات کر کے میری طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

ہاں بھائی...... "ورکنگ وومن" کے ساتھ یہ مسئلے، تو نتھی ہی ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"معاف کرنا بھئی، میں عورت نہیں لڑکی ہوں۔" اس نے ادا سے کہا اور پھر ہم دونوں ہی ہنس دیے۔

"اچھا جی لڑکی صاحبہ، یہ فائل دیکھیے، یہ خط ابھی ٹائپ کر کے سر ظفر کو بھجوا دو۔ یہ کل کا کام ہے جو رہ گیا تھا۔ ورنہ حمیدی صاحب نے صبح صبح ہی گردن پکڑ لینی ہے۔"

☆☆

ثوبیہ اور میں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ مجھے اس دفتر میں آئے دو سال ہو چکے تھے۔ پہلے میرے ساتھ ایک اور لڑکی لیلیٰ ہوا کرتی تھی، لیکن چھ سات ماہ

www.pdfbooksfree.pk

قبل اس کی شادی ہوئی، تو وہ ملازمت چھوڑ گئی۔ کمپنی نے اس کی جگہ ثوبیہ کو ملازمت دے دی۔

ہر دم ہنستی مسکراتی، کام کرتی ثوبیہ دفتر میں سب سے زیادہ میرے قریب تھی۔ ہماری میزیں بھی ساتھ تھیں۔ ہم کھانا بھی اکٹھے کھاتے۔ کچھ میری بھی لیے دیے رہنے کی عادت تھی۔ دفتر میں مرد ملازمین زیادہ تھے، میں بس کام کی حد تک ہی ان سے بات کرتی یا صبح آتے ہوئے سلام دعا ہو جاتی۔

ثوبیہ تو مجھ سے دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ کبھی کسی مرد سے بلاضرورت بات نہ کرتی نہ ہی اسے عام لڑکیوں کی طرح ٹوہ لینے کی عادت تھی کہ کون کیا کر رہا ہے۔ وہ بس اپنی دنیا میں مگن ایسی لڑکی تھی جسے شاید اپنے حسن کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے بات چیت کرنا چاہی، تو آگے سے اس کا رویہ بڑا روکھا ہوتا۔ چناں چہ بات آگے نہ بڑھتی۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ اگرچہ گھر کے حالات بقول اس کے کچھ اچھے نہ تھے۔ صرف ایک بیمار والدہ تھیں اور ایک بھائی جو بیرون ملک جا کر ماں بہن کو ایسا بھولا کہ اب اس کی کچھ خبر نہیں۔ اسی بنا پر ماں بیٹی نے بھی اسے بھلا دیا۔

''واہ ثوبیہ... اتنا خوبصورت جوڑا کہاں سے لیا؟''

آج وہ جو لباس پہن کر آئی تھی، اسے دیکھ کر میں بے ساختہ اش اش کر اٹھی۔ وہ سوتی لان اور شیفون جارجٹ کا حسین جوڑا تھا جس پر کچھ کام کے ساتھ چھوٹے بڑے مختلف قسم کے بٹن لگا کر مزید دیدہ زیب بنایا گیا تھا۔

''طارق روڈ سے لیا ہے۔ واقعی بہت اچھا لگ رہا ہے؟'' اس نے دوپٹے کا کونا ناز سے پکڑ مجھے گھوم کر دکھایا۔

میرے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''اچھا بس سکون سے بیٹھو ماڈلنگ کا نہیں کہا میں نے..... سامنے سے صدیقی صاحب بھی دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسٹول پہ بٹھایا۔

''اوہ..... اُف.....'' وہ جھٹ اسٹول پہ بیٹھ گئی۔

''ایک تو یہ آدمی بھی نا!'' اب بندہ ان سے پوچھے کہ تمہارے گھر میں ماں بہن نہیں ہے کیا؟'' آواز آہستہ کیے اس نے منہ ٹیڑھا کرتے ڈائیلاگ بولا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

> وہ کبھی کسی مرد سے بلاضرورت بات نہ کرتی نہ ہی اسے عام لڑکیوں کی طرح ٹوہ لینے کی عادت تھی کہ کون کیا کر رہا ہے۔

''اچھا بتاؤ کتنے کا لیا؟'' میں نے حسرت اور رشک سے پھر جوڑے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ساڑھے تین ہزار روپے کا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہم رنگ کیوٹکس سے سجے ناخنوں والے ہاتھ میں قلم تھام لیا۔

''کیا؟؟ ساڑھے تین ہزار؟؟ ایک جوڑے کے لیے اتنے روپے خرچ کر دیے؟ پھر اور اخراجات، گھر اور امی کی دوائیں وغیرہ؟؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''ارے بھئی، میرا ایک ہی تو شوق ہے، اچھے کپڑے پہننے کا! اب اتنی محنت کرتی ہوں، تو کیا اتنا بھی اپنے لیے نہ کروں؟'' اس نے سنجیدہ سی شکل بنائی۔

''ہاں یہ بھی ہے۔ لیکن تمھیں کچھ بچت بھی کرنی چاہیے۔'' میں نے صاف گوئی سے اسے مشورہ دیا۔ ہماری دوستی اتنی پکی ہو چکی تھی کہ وہ میری اور میں اس کی کسی نصیحت کا برا نہ مانتی۔ کبھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر حیرت

www.pdfbooksfree.pk

بھی ہوتی کہ گھریلو حالات کے برعکس اس کے کپڑے بہت شاندار ہیں۔ کچھ اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی تھا، اس لیے وہ خوبصورت نظر آتی۔ لیکن اتنے مہنگے ملبوسات!''خیر شوق کا کوئی مول نہیں'' یہ سوچ کر میں اپنی حیرت کو تھپکیاں دے دیتی۔

تقریباً ایک مہینے سے وہ ہر دوسرے تیسرے دن دس پندرہ منٹ دیر سے آرہی تھی۔ آخر اس نے دیر سے آنے کے لیے دفتر سے اجازت لے لی۔ دراصل اس کی والدہ بہت بیمار تھیں۔ حمیدی صاحب اچھے باس ہونے کے ساتھ اچھے انسان بھی تھے جنھیں دوسروں کی مجبوریوں سے سمجھوتا کرنا آتا تھا۔

☆☆☆

''نور! آج میں نے امی کو خالہ کے گھر چھوڑ دیا۔ ان کی بیٹی کی شادی ہے نا۔ وہ اصرار کر رہی تھیں کہ تم لوگ کچھ دن پہلے آجاؤ۔''

ثوبیہ نے ٹائپ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔

''چلو اچھی بات ہے، ان کا بھی دل بہل جائے گا اور تمھیں بھی سکون رہے گا کہ انھیں کوئی دیکھنے والا ملا۔'' میں نے لیپ ٹاپ کا رخ ہلکا سا اپنی طرف کرکے جائزہ لیا کہ اس کا مزید کتنا کام رہ گیا ہے۔

''ہاں..... یہ تو ہے..... ویسے یار، مجھے تم سے بھی کچھ چاہیے۔'' اس نے لیپ ٹاپ کا رخ میری طرف کر فائل بھی مجھے تھمادی۔ مدعا یہ تھا کہ آگے سے میں ٹائپ کرنے لگوں۔

''ہاں..... بولو.....'' میں نے مصنوعی غصے سے اسے گھور کر دیکھا۔

وہ حسب عادت کھلکھلا کے ہنس دی اور بولی ''ایسے گھور گھور کے غصے سے دیکھو گی، تو میں کیسے مانگوں؟''

''فی الحال میں آپ کے مانگنے نہیں جچنے پر گھور رہی ہوں۔'' میں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ٹائپنگ شروع کر دی۔ ''اچھا خیر اب بولو بھی کیا چاہیے؟''

''یار کزن کی شادی کے لیے کچھ جوڑے اور زیور چاہیے۔ مجھے علم ہے تم یہاں پہن کر نہیں آتیں لیکن تمہارے پاس کافی اچھا مال موجود ہے۔'' دراصل میں اسے اپنے گھر میں ہونے والی تقاریب کی تصویریں دکھا چکی تھی۔ اسے میرے کپڑے اور جیولری بہت پسند آئی تھی۔

اس نے بات کرتے کرتے سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں کہا ''تم صحیح کہتی تھیں کچھ بچت ہونی چاہیے۔ دیکھ لو اب میرے پاس کچھ رقم نہیں۔ اور شادی جیسی تقریب میں پہننے والے کپڑے بہت دقیانوسی ہیں، عجیب وغریب.....

اب وہ تو نہیں پہن سکتی۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمھاری چیزیں ویسے ہی واپس کردوں گی۔'' اس کا جھکا سر کچھ اور بھی جھک گیا۔

''اوہو..... بس اتنی سی بات تھی۔ ہاں لے لینا ویسے بھی اتنے زرق برق کپڑے قریبی لوگوں کی شادی میں ہی پہنے جاتے ہیں۔ یوں ہی تو رکھے ہیں، اچھا ہے تمہارے کام آجائیں، کچھ تو قیمت وصول ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اوہ..... میری نور..... دل کا سرور..... ہزاروں سال جیو تم ضرور..... بہت بہت شکریہ۔ تمھیں نہیں پتا تم نے میری بہت بڑی پریشانی دور کر دی۔ وہ جیسے کھل اٹھی۔''

''اچھا بس ایسی بڑی کوئی قربانی بھی نہیں دے رہی۔ میں نے اسے شکریہ ادا کرنے سے روکتے

www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کہا۔

"اور ویسے ہم رشتے داروں میں تو اکثر ایسا لین دین چلتا ہے۔ تم بھی میری بہن کی طرح ہو۔"

ثمین پھر بھی اس کی زبان آخر تک میری تعریف میں رطب اللسان رہی یہاں تک کہ مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

اس رات میں نے مجھے قیمتی جوڑے جو چند ماہ قبل ہی اپنے بھائی کی شادی پر بنائے تھے، وہ پلاسٹک کے غلافوں میں رکھ لیے۔ جیولری کے ساتھ ہی اپنا طلائی کڑا بھی رکھا جو میرے بھائی نے اپنی شادی پر مجھے تحفہ دیا تھا۔ ثوبیہ نے یاد دلا کر کہا تھا "بس صرف ایک دن کے لیے اگر ہو سکے، تو وہ بھی دے دینا۔ میری بہن جیسی کزن کی شادی ہے اور میں سب سے منفرد نظر آنا چاہتی ہوں۔" ثوبیہ کی باتیں سوچتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

صبح اٹھ کر نماز کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کپڑوں اور جیولری کی دونوں غلافے تیار کر لیے تاکہ جاتے وقت لے جاؤں۔ ورنہ اکرامی کے سامنے تیاری کرتی، تو انھوں نے وہیں کسٹم آفیسر کی طرح روک لینا تھا۔ لڑکی (ثوبیہ) کے "بائیو ڈیٹا" کے ساتھ انھیں یہ رسید بھی چاہیے ہوتی کہ وہ کب واپس لائے گی۔ پھر ہمارا گھر بہت بڑا تو تھا ہی نہیں، بھابیوں تک یہ خبر نشر ہو جاتی کہ میں اپنے قیمتی جوڑے کسی انجانی لڑکی کو دے آئی ہوں۔ لہٰذا میں نے پہلے مرحلے ہی پر اپنا بچاؤ کر لیا۔

یوں بھی وہ بڑی بہنوں اور بھائیوں کی شادی کے بعد فی الحال میں گھر میں اکلوتی ہی تھی اور مجھے اکثر ایسے کام اکیلے ہی کرنے پڑتے۔

☆☆☆

"اوہ... شکر ہے کہ تم جوڑے لے آئیں ورنہ... میں تو پوری رات دعا ہی کرتی رہی کہ تم بھول نہ جاؤ۔" سلام دعا کے بعد حسب عادت وہ شروع ہو چکی تھی.....

دونوں لفافے میں نے اپنی الماری میں رکھ دیے۔ جلد ہی دفتر میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

"نور! تم میرے ساتھ کلفٹن اقبال تک چل سکتی ہو؟" ثوبیہ نے کھانا کھاتے ہوئے اچانک سوال کیا۔

"میں؟ نہیں بھئی، گھر میں نہیں بتایا، میری امی پریشان ہو جاتی ہیں میں نے انکار کر دیا۔

"بس یار زیادہ دیر کا کام نہیں۔ دراصل ہمارے ایک جاننے والے ہیں۔ انھوں نے کچھ رقم قرض دینے کا وعدہ کیا ہے۔ کچھ قریبی رشتے دار بھی لگتے ہیں۔ تمھیں پتا ہے نا آج کل امی کی ادویہ کا خرچہ اور پھر شادی کے اخراجات....." وہ میری منتیں کرنے لگی "ویسے بھی تمہارے راستے ہی میں آئے گا۔ صرف پندرہ منٹ کی بات ہے، کیا فرق پڑے گا۔"

وقتہ طعام تک میری نہ ہاں میں نہیں بدلی۔ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا کہ میں اپنی کسی دوست کے رشتے دار کے گھر منہ اٹھا کر چلی جاؤں۔ لیکن وہ مسلسل مجھ سے مطالبہ کرتی رہی، وہی جذباتی بلیک میلنگ۔

میں نے کہا "یار اتنے بڑے بڑے گھر ہیں وہاں..... پھر سنسان راستہ..... کوئی ڈاکو قیمتی ملبوسات و زیورات چھین کے بھی بھاگ سکتا ہے۔" لیکن اس نے یہ خطرہ ہنسی میں اڑا دیا۔ آخر اس نے مجھے قائل کر ہی لیا کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں رہتے ہوئے دس پندرہ منٹ دیر ہونا اتنی بڑی بات نہیں۔ اور یہ کہ میں اپنی امی کو واپس جا کر بھی بتا سکتی ہوں۔ کہ آج دیر سے کیوں آئی۔

www.pdfbooksfree.pk

شام ۵ بجے جب ہم دفتر سے نکلے، تو ایک ایک لفافہ سنبھال لیا۔ کچھ لوگوں نے لفافے حیرت سے دیکھے۔ لیکن ہم دونوں ہی کسی سے زیادہ ''فری'' نہیں تھیں لہٰذا کسی نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔

اسٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑے کھڑے نجانے کیوں پھر میرے دل میں عجیب وسوسے آنے لگے۔ ویسے تو کسی کی زندگی کا بھروسا نہیں..... اور کراچی میں رہتے ہوئے یہ خطرہ اور بڑھ جاتا ہے۔ یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نجانے کس وقت کیا ہوجائے۔ اپنے گھر سلامت پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں! اس لیے کم از کم گھر والوں کو یہ پتا ہونا چاہیے کہ میں کہاں ہوں۔ اگر خدانخواستہ وہاں بم پھٹ جائے، تو میرے گھر والے کم از کم ڈھونڈ تو سکیں.....

''لاحول ولا.....'' میں نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو ڈپٹا ''کیا فضول باتیں سوچ رہی ہو؟'' اس وقت ثوبیہ بھی خاموش کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن خوشی اس کے چہرے سے چھلکتی نظر آرہی تھی۔ میں اپنے آپ کو چہرے پڑھنے میں بڑا ماہر سمجھتی تھی۔ مجھے اس کے چہرے پر بہت کچھ پانے کی مسرت دکھائی دی۔

''خیر یہ تو مجھ معلوم ہی ہے کہ میں نے اس کی ایک بڑی پریشانی دور کردی۔ اس لیے یہ خوش ہے۔ اس میں چہرہ پڑھنے کی کیا مہارت ہوئی.....؟'' کچھ دیر بعد ہی بس آگئی۔ ہم دونوں اپنے خیالوں میں مگن گلشن چورنگی تک پہنچ گئے۔

''آؤ نور.....'' اس نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔

میرا دل چاہا کہ اترنے سے انکار کردوں۔ میرے گھر کا آدھا راستہ ابھی باقی تھا۔ لیکن پھر احساس ہوا کہ ثوبیہ مجھے وعدہ خلاف سمجھے گی۔ پھر پتا نہیں بچاری کے ساتھ کیا بیتے، پانچ دس منٹ کی تو بات ہے۔ میں نے قدم بڑھا دیے۔

''شکر ہے..... میں تو سوچ رہی تھی، ایسا نہ ہو تم اترنے سے انکار کر دو۔'' ثوبیہ نے شکر کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اتنی وعدہ خلاف بھی نہیں۔'' میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر برہمی کا اظہار کیا۔ وہ حسب عادت کھلکھلا کر ہنس دی۔

''آؤ نور..... یہاں سے رکشا لے لیتے ہیں۔ کافی دور جانا ہے۔''

''ہیں؟'' کافی دور؟ تم نے تو کہا تھا کہ یہاں سے قریب ہی ہے'' میں نے اسے گھور کے دیکھا۔

''یار رکشے میں جاتے ہوئے قریب ہی ہے۔'' اس نے قریب کھڑے رکشے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا، تو مجھے اس کی تقلید کرنی پڑی۔

جلد ہی رکشے میں بیٹھے ہم ثوبیہ کی بتائی منزل کی طرف گامزن تھے۔ اندرونی گلیاں دیکھتے ہی مجھے یاد آیا یہاں کبھی ہماری نانی کا گھر ہوا کرتا تھا۔ بچپن میں یہ علاقہ بہت دیکھا تھا۔ جب نانی کے گھر آتے، تو خالہ کے ساتھ باغ جاتے۔ کبھی نانا اور ماموں کے ساتھ دکان سے چیز لینے پہنچتے۔ کچھ دھندلی سی یادیں اس علاقے کے ساتھ اب بھی وابستہ تھیں۔ پھر انھوں نے گھر تبدیل کرلیا۔ اب تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ شاپنگ سینٹر، بڑے بڑے اسکول، بلند و بالا عمارتیں..... مجھے محسوس ہوا، ثوبیہ شاید اپنی منزل کا راستہ بھول چکی، کیونکہ اب وہ آگے پیچھے کی مختلف گلیوں میں رکشے والے کو گھما رہی تھی۔

''نور! تم پریشان نہیں ہونا، میں اپنی امی کے ساتھ یہاں آچکی ہوں۔ مجھے گھر معلوم ہے۔'' مجھے ہنسی آئی۔ یہ پریشانی میں مجھے دلاسا دینے کے ساتھ خود کو بھی تسلی

www.pdfbooksfree.pk

دے رہی ہے۔ چار پانچ گلیوں بعد ایک بڑے گھر کے آگے رکشا رکوا اس نے ادائیگی کی اور میرا ہاتھ پکڑ اندر داخل ہوگئی۔

اس بڑے سے گھر کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں مجھے بیٹھنے کی ہدایت کر ثوبیہ نجانے کہاں غائب ہوگئی۔ دونوں لفافے بھی اس کے پاس تھے۔

''چلو خیر وہ تو تاوان کو دینے تھے'' میں نے دل کو تسلی دی۔

پانچ ..... چھے ..... سات ..... آٹھ منٹ مجھے یونہی انتظار کرتے گزر گئے۔ آخر گئی کہاں یہ؟ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

میں اٹھی اور ٹہلنے لگی۔ ڈرائنگ روم کے آگے لاؤنج اور اس سے آگے کمروں کے دروازے بند نظر آرہے تھے۔ ''کسی کے گھر میں میں ایسے چلتا پھرنا نہایت نامعقول بات ہے۔'' میں نے خود کو ٹوکا۔

جب میں گھر کے صحن میں پہنچی، تو اسی وقت مجھے بالائی منزل سے ایک آدمی کی جھلک نظر آئی۔ وہ اپنی آستینوں کے کف بند کرتا سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ میرے ذہن میں یکایک سائرن سا بجنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے ادھر ادھر دیکھے بغیر باہر والے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہ آدمی بھی مجھے دیکھ چکا تھا۔ اپنے بھاری وجود کے ساتھ میرے پیچھے دوڑ پڑا۔ جب تک وہ پیچھا کرتے میرے قریب پہنچا، میں اگلی گلی تک آچکی تھی جہاں برائے نام سہی لیکن اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

''میرے ساتھ واپس چلو۔'' قریب پہنچ کر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں نے اپنی ہمت مجتمع کی اور چیخ کر اسے کہا ''یہاں سے چلے جاؤ۔''

''میں کہتا ہوں میرے ساتھ چلو۔ میں نے تمہارے پیسے دیے ہیں۔''

ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ مجھے لگا، شاید اب میں اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکوں۔ لیکن میں پھر پوری طاقت سے چیخی ''اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا نہ ..... میں چیخ چیخ کے لوگوں کو جمع کرلوں گی۔ میرے ساتھ جو ہوسو ہو لیکن تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔''

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ اسی وقت مجھے ایک رکشا آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے غیبی مدد سمجھتے ہوئے ہاتھ دیا۔ رکشے کو آتا دیکھ کر وہ آدمی پیچھے ہٹ گیا۔ قریب آنے پر میں دھڑکتا دل لیے اس میں بیٹھ گئی۔ بیس پچیس منٹ کا راستہ مجھے صدیوں پر محیط لگا۔ گھر پہنچنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیروں میں جان نہیں۔ لیکن پھر اچانک احساس ہوا کہ مجھے گھر میں اس طرح داخل نہیں ہونا چاہیے کہ سب دیکھ کر پریشان ہو جائیں اور سوالات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے۔ تب مجھے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی گنہگار بننا پڑے۔

بیس پچیس منٹ کا راستہ مجھے صدیوں پر محیط لگا۔ گھر پہنچنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیروں میں جان نہیں۔

اندر داخل ہوتے ہوئے میں نے پوری کوشش کی کہ بدحواس نہ نظر آؤں۔ لیکن امی کا سامنا ہوتے ہی انھوں نے پہلا سوال یہی کیا ''کیا ہوا تمھیں؟''

اس سہ حرفی جملے کے بعد مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ امی یہ دیکھ کر مزید گھبرا

www.pdfbooksfree.pk

گئیں۔ ”ارے کیا ہوا، کچھ بتاؤ تو سہی۔“

”امی! آپ کی بیٹی آج بچ گئی......“ مجھ سے روتے ہوئے بس یہی کہا گیا۔

”ارے...... کیا کہہ رہی ہو بیٹا...... انسان کی جتنی زندگی ہوتی ہے، اسے پوری ملتی ہے۔ چلو ہاتھ منہ دھولو، فضیلہ بھی آرہی ہوگی بس۔“ انھوں نے بھابی کا ذکر کیا۔ ان کا خیال تھا، شاید میں سڑک پر کوئی حادثہ دیکھ کر ڈر گئی ہوں۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

لیکن رات کو میرے پاس بیٹھ کر اطمینان سے سارا واقعہ سنتے ہوئے جتنی بار انھوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے مجھے محفوظ و مامون رکھنے پر دعائیں کیں، انھیں سنتے ہوئے اپنے اندر سکون سا اترتا محسوس ہوا۔

دو دن کی چھٹی کے بعد جب دفتر گئی، تو سب سے پہلے حمیدی صاحب کے پاس جا کر ثوبیہ سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ میرا سنجیدہ چہرا دیکھ کر حمیدی صاحب بھی کھٹک گئے۔ ”خیریت نورالہدیٰ؟ کیا ہوا؟“ انھوں نے استفسار کیا۔

میں نے سارا واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔ ساری بات سن کر وہ اپنا سر پکڑ کے رہ گئے۔ پھر بولے۔ ”اچھا آپ رکیے، میں اس کی معلومات کرواتا ہوں۔“

انٹرکام اٹھاتے ہوئے انھوں نے مجھے تسلی دی ساتھ نائب قاصد کو گھنٹی بجا کر کمرے میں آنے کی ہدایت دی۔

اکثر بیرونی دفتری کام زوہیب کے سپرد تھے۔ حمیدی صاحب نے ایک فارم پر سے ثوبیہ کے گھر کا پتا نکالا اور اسے زوہیب کو دیتے ہوئے ہدایت دی کہ لڑکی کے بارے میں ساری معلومات حاصل کی جائیں۔

میں واپس اپنی جگہ پر آگئی لیکن کام میں میرا دل نہیں لگا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد زوہیب واپس آیا۔ وہ سیدھا حمیدی صاحب کے کمرے ہی میں چلا گیا۔ دل چاہا کہ اس کے پیچھے جاؤں لیکن یوں جانا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ دیر بعد حمیدی صاحب نے مجھے بلوا بھیجا۔

”جی سر آپ نے مجھے بلایا تھا؟“ میں نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

”جی آئیے نور“ انھوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کرسی پر براجمان ہوئی، تو وہ بولے:

”نورالہدیٰ، زوہیب کی رپورٹ کے مطابق ثوبیہ نے جو پتا دیا تھا، وہاں اس نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی۔ اس کے سارے کاغذات جعلی ہیں۔ میں نے اپنے ایک پولیس افسر کو کہہ دیا ہے کہ وہ اس دھوکے باز لڑکی کا پتا چلائے۔ تم بھی ہوشیار ہوجاؤ اور آئندہ ایسی چال باز لڑکیوں کے جال میں نہ پھنسنا۔“

اس نصیحت کے ساتھ انھوں نے مجھے اپنی نشست پر واپس بھیج دیا۔ اس دن سے میرا دوستی جیسے رشتے سے اعتبار اٹھ گیا۔ آج بھی جب اس قسم کی خبر سنتی ہوں کہ کوئی لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی، تو نجانے کیوں شک سا ہوتا ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے، کچھ ایسا ہی ہو جیسا میرے ساتھ ہوا۔

میں سوچتی ہوں، اگر خدانخواستہ اس دن ثوبیہ کا گروہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب ہوجاتا، تو میرے پیچھے سارے اچھے جوڑے اور جیولری غائب دیکھ کر سب کا ذہن اسی طرف جاتا کہ یقیناً میں اپنی مرضی سے گھر چھوڑ گئی ہوں۔ ایسی صورت حال میں گھر کی عزت روندنے والی لڑکی کو تو تلاش کیا جاتا لیکن یہ کھوج ڈھونڈنے کی سعی بالکل نہیں ہوتی کہ غائب کیسے ہوئی؟

www.pdfbooksfree.pk

تازہ افسانہ

ایک باپ نے کیا فیصلہ

میں نے قربانی کا بکرا نہیں بننا

پیار و محبت پر جب دولت کی ہوس غالب آ جائے، تو طمع پسندوں کو سبق سکھانا پڑتا ہے

سلمیٰ اعوان

ظہیر احمد برا خوبصورت اور قد آور نوجوان تھا۔ پڑھنے لکھنے میں تیز، کھیلوں میں بھی برا نامور۔ میٹرک میں وظیفہ لے کر زرعی یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ ایم ایس سی تک اس نے کھیلوں میں ٹرافیاں جیتیں اور امتحانوں میں میڈل لیے۔

اقبالاں اس کی خالہ زاد بہن تھی۔ پونے چھے فٹ مردانہ ڈیل ڈول کی مالک۔ ذہانت اور انسانیت سے عاری۔ اقبالاں کے بھائیوں کی ایک عرصے سے ظہیر پر نظر تھی۔ بی ایس سی کرنے کے بعد جب اس نے ایم ایس سی میں داخلہ لینا چاہا، تو ماں نے روک دیا:

''پڑھتے پڑھتے کیا بوڑھا ہونے کا ارادہ ہے۔ بس بہت پڑھ لیا، اب شادی کرو اور گھر بساؤ۔ پڑھائی میں تو وہ مغز کھپائے جسے نوکری کرنی ہو۔ اللہ رکھے اتنی لمبی چوڑی جائداد کس نے سنبھالنی ہے؟''

ظہیر احمد کوئی بچہ تھوڑی تھا جو ماں کی گفتگو کے رموز نہ سمجھتا۔ بے نیازی سے بولا ''ماں جی میں پڑھوں گا، پڑھتے پڑھتے بوڑھا ہو جاؤں گا، کتابوں سے شادی کر لوں گا اور انہی کے درمیان مروں گا۔''

''کیا اول جلول بکتے ہو۔ سیانے اسی لیے کہتے ہیں کہ پڑھائی دماغ خراب کر دیتی ہے۔''

وہ یہ سوچ کر اُٹھ گیا، کون ان پتھروں سے سر پھوڑے؟ اس نے اپنی من مانی کی۔ ایم ایس سی سے فارغ ہوا، تو اچھی ملازمت مل گئی۔ پندرہ دن کی چھٹیوں میں گھر گیا، تو ماں نے اقبالاں سے شادی کی بات شروع کی۔ پہلی بار وہ گنگ سا ماں کی صورت دیکھتا رہا۔ ''کیسی

www.pdfbooksfree.pk

ماں سے بڑے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔" اس نے سوچا۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا اور پھر دفعتاً بولا:

"ماں! میں تمھیں کیسا لگتا ہوں؟"

"چاند کا ٹکڑا ہو۔" ماں کی نگاہیں محبت پاش تھیں۔

"تو تم چاند کو گرہن لگانے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟" وہ تلخی سے بولا۔

ماں کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ "لو اپنے خون کو سہارا دیں، اپنے سگے پیاروں کا دکھ بانٹنا یہی تو انسان کی بڑائی ہے اور اعلیٰ ظرفی بھی۔"

"ماں! خدا کے لیے ان خاندانی عظمتوں کا مجھے سبق نہ دو۔ میں نے قربانی کا بکرا نہیں بننا۔" وہ پیر پٹختا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

مگر یہ اس کے سان و گمان میں نہ تھا کہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ ماں کے ساتھ گفتگو کا ایک ایک لفظ سارے خاندان میں گردش کرتا پھرے گا۔ بہنیں آنسو برساتی آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے آ کھڑی ہوں گی۔ بھائی منتیں کرے گا کہ اقبالاں خاندان کی عزت ہے، وہ اتنے برس سے اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

اس کے دل سے جیسے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ پڑیں۔ "خود غرض ہو تم لوگ! اپنے اپنے مفاد نظر آتے ہیں تمھیں۔" وہ پوری قوت سے جیسے دھاڑا۔ "میرے لیے کوئی نہیں سوچتا کہ مجھے اپنے معیار کی ساتھی چاہیے۔ ذہنی ہم آہنگی کے بغیر زندگی کیسے گزرتی ہے؟ جسے آنکھیں دیکھنا گوارا نہیں کرتیں اسے دل کیسے قبول کرے؟"

مگر اس شوریدہ سر خاندان کے لیے اس کا دل کیا اہمیت رکھتا تھا؟ یلغار زبردست تھی۔ اس کا ذہن ماؤف اور اعصاب جواب دے گئے۔ سارے خواب چکنا چور ہو گئے اور زندگی کی بساط پر بازی الٹ گئی۔ جب دیگیں چڑھنے لگیں۔ رات کے کھانے کی دعوت گاؤں والوں کو بھیج دی گئی، تو وہ موقع پا کر بھاگ نکلا۔

وہ گاؤں ہی نہیں اس شہر سے بھی بھاگ گیا جس کی ایک ایک اینٹ سے اسے پیار تھا۔ اس ملک کو بھی چھوڑ گیا جس کے اس پر بہت سے احسان تھے۔ اپنوں سے دور، بیگانوں کے درمیان، نامانوس جگہوں سے کوسوں پرے، ان دیکھی اور ان جانی سرزمین پر اسے سکون کا احساس ہوا، شاید اس لیے کہ وہ اپنائیت کا زخم خوردہ تھا۔

ایک، دو سال، تین اور پھر پانچ سال گزر گئے۔ ماں جی کی آنکھوں سے آنسو نہیں خون ٹپکا تھا۔ تلاش میں کوئی جگہ نہ چھوڑی گئی۔ ایک دوست کی منت سماجت کی تو پتا چلا کہ وہ افریقہ چلا گیا ہے اور وہاں کون جاتا؟

ماں نے مصلیٰ بچھا لیا۔ رات جب گہری ہوتی، آسمان پر ستاروں کی محفل سج جاتی، تو وہ جیسے اپنے خالق سے باتیں شروع کر دیتیں۔

"مولا! میں نے کیا برا کیا؟ کن ماں باپ کی بچی کو کہاں دھکا دیتی؟ تو نے اسے بنایا، تو نصیب اچھا کیوں نہ بنایا؟ بیٹا چلا گیا۔ میں نے اسے جہنم میں جھونک دیا یا وہ مجھے دوزخ میں دھکا دے گیا.... اس کا فیصلہ تو کرنے والا ہے۔ میرے گناہ اور خطائیں معاف کر اور بیٹے کی شکل مجھے دکھلا۔"

آہ و زاریاں کب تک رنگ نہ لاتیں؟ پیدا کرنے والے نے اپنے بندے کے غلط فیصلوں کو معاف کر دیا۔ پورے آٹھ سال بعد وہ لوٹا۔ ماں نے سینے سے لگایا، بہنوں بھائیوں نے خوشی کے آنسو بہائے۔ وہ لاکھوں ڈالر کما کر لایا تھا۔ گاؤں میں ظہیر نے اراضی خریدی اور شہر میں کھاد کا پلانٹ لگایا۔ اقبالاں کو وہ اپنے ساتھ شہر لے آیا۔ زمین سونا اگلنے لگی اور پلانٹ نے پیسے

www.pdfbooksfree.pk

کی بارش کردی۔

پہلے سال بیٹی ہوئی اور دوسرے سال بھی۔ دونوں بچیاں صحت مند اور خوبصورت تھیں۔ بیوی کو تاکید تو تھی کہ نک سک سے آراستہ پیراستہ رہے پر پیندو پچے کی کھائیں کچھ اتنی گہری تھیں کہ تعلیم و تربیت کی گہری بھرائی کے بغیر بات نہ بنی۔ جھول اتنے پڑے رہتے کہ ظہیر کی نظروں کے سامنے آتے، تو ہوک سی دل میں اٹھتی۔

اُس کی کاروباری مصروفیت بہت بڑھ گئی تھیں۔ ایک شام وہ کسی دوسرے شہر سے لوٹا۔ تھکا ہوا تھا۔ کمرے میں آرام لیٹ گیا۔ اقبالاں کو اس کی آمد کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ ملحق کمرے میں کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ آوازیں اُونچی اور صاف تھیں۔ دوسری آواز بیگم قاسم کی تھی جس کے خاندان سے ان لوگوں کے اچھے مراسم تھے۔ اُس نے سُنا، بیگم قاسم کہہ رہی تھیں:

''بھابھی آپ ڈاکٹر کو بھائیں، چھوٹی تھینک بھی اب بڑی ہوگئی ہے۔''

''کہتے ہیں دولت عورت کا مقدر ہوتی ہے اور اولاد مرد کا۔ میرے بخت کا جہاں تک تعلق ہے وہ عروج پر ہے۔ مگر اولاد کے لیے اگر ظہیر کی قسمت یکی ہے، تو اس میں میرا کیا دوش؟ دو بیٹیوں میں سے ایک بیٹا بھی تو ہو سکتا تھا۔''

ظہیر جیسے دم بخود رہ گیا۔ اقبالاں کے لب و لہجے اور انداز میں کتنا تکبر اور نخوت تھی؟

''تو یہ چپ کھڑی اس سب کو اپنا بخت سمجھتی ہے۔ میری محنت، دن رات کے خون پسینے سے کمایا ہوا سرمایہ، میری دلچسپی لگن، کاروباری ذہانت و فراست اور خدا کی عنایت، اُس کی نظرِ کرم کسی کھاتے میں نہیں۔ بیٹا نہیں ہے، تو قصوروار میں ہو گیا۔ خوب! میں تو

مصنّفہ سے ملیے

وطن عزیز کی ممتاز قلم کار، سلمیٰ اعوان سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر افسانوی رنگ میں لکھتی اور سوچ کے نئے در وا کرتی چلی جاتی ہیں۔ آپ کے پانچ افسانوی مجموعے، سات ناول اور چھے سفرنامے شائع ہو چکے۔ تین سفرنامے زیرِ طبع ہیں۔ نت نئی تخلیقات رقم کرنے کا سفر پوری آب و تاب سے جاری ہے۔

اس پر سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔'' یہ سوچ کر بڑی زہر خند ہنسی اس کے ہونٹوں پر اُبھری۔

لاہور میں ایک کیمیکل فیکٹری کی خریداری میں تین چار دن تک وہ بڑا اُلجھا رہا۔ ذرا فارغ ہوا، تو سیدھا اسپتال چلا گیا جہاں اس کا جگری دوست ڈاکٹر منظور تعینات تھا۔ پہلی منزل کی سیڑھیوں پر ہی تھا کہ ادویہ کا بیگ ہاتھ میں پکڑے وہ اُسے نظر آیا۔ ظہیر رک گیا۔

''کہیں جا رہے ہو؟'' ظہیر نے پوچھا۔

''یار ایک مریضہ کو دیکھنے جانا ہے۔ تم بھی چلو گاڑی میں باتیں کریں گے۔''

تنگ سی ایک گلی کے قریب ڈاکٹر منظور نے گاڑی رکوائی۔ ظہیر نے اسے تالا لگایا۔ دوست نے دواؤں کا بیگ ہاتھ میں پکڑ اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دو گلیاں پار کرنے کے بعد تیسری گلی میں پہلے دروازے پر ڈاکٹر منظور نے دستک دی۔ غالباً کوئی انتظار میں تھا۔ بھاگ کر دروازہ کھولا گیا۔ ظہیر نے دیکھا، سامنے ایک لڑکی گھبرائی کھڑی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے اماں جی کی؟'' منظور نے پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

''بہت سخت دورہ پڑا ہے۔''

وہ چھوٹے سے صحن اور کمرے والا گھر تھا، مگر معلوم نہیں کشادہ اور ستھرا کیوں محسوس ہوا؟ ظہیر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر منظور مریضہ کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا، گھر میں سلیقہ اور صفائی تھی۔ نہایت معمولی سامان اس طریقے سے رکھا گیا تھا کہ نہ تو جگہ کی تنگی کا احساس ہوتا تھا اور نہ وہ نظروں کو بُرا لگتا۔ لڑکی اٹھنے قد اور دبلے پتلے جسم کی تھی۔ شکل اچھی تھی۔ گھر میں خوشحالی ہوتی، تو یقیناً بہت خوبصورت ہوتی۔ آنکھیں سیاہ چمکدار اور موٹی موٹی تھیں۔

ڈاکٹر منظور ٹیکا اور دوائی کے بعد ظہیر کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار محسوس کرتے ہوئے وہ بولا:

''دمے کی مریضہ ہے۔ موسم کا ذرا سا الٹ پھیر اس بیماری میں عذاب بن جاتا ہے۔ آج کل موسم بہت گرم ہے۔ کمرے کی نیچی چھت بہت جلد تپنے لگے، تو مریضہ کی بیماری بڑھ جاتی ہے۔ دو لڑکیاں ہیں۔ ایک شادی شُدہ ہے جس کے ڈھیر سارے بچے ہیں۔ دوسری یہ عذرا ہے۔ میٹرک جوں توں کر کے پاس کیا۔ ماں سلائی مشین چلاتی اور یہ اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ مسلسل محنت اور پریشانیوں نے اسے چارپائی پر ڈال دیا۔ عذرا ہمت والی لڑکی ہے۔ ایم اے تک پڑھ بیٹھی ہے۔ اب میرے بیٹے، احمد کی کلاس ٹیچر ہے۔ والدین کی میٹنگ میں بیگم سے ملاقات ہوئی۔ کچھ تعلقات بن گئے، تو ہم نے بھی تھوڑا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ اصل میں اس کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگنا چاہیے۔ اس کے بغیر مریضہ کی حالت سُدھرنی بہت مشکل ہے۔''

''یار تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا وگرنہ یہ کون سا مسئلہ ہے؟ کل ہی لگ جائے گا۔'' ظہیر بولا۔

اسی دوران عذرا شربت کا جگ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دونوں کے آگے تپائی رکھی۔ شربت کی ٹرے اور گلاس رکھے۔ بہت لذیذ شربت تھا۔ ظہیر نے پوچھا، تو ڈاکٹر منظور نے کہا: ''کیوں عذرا، شربت بازار کا ہے یا گھر میں بنایا؟''

''میں نے خود تیار کیا ہے۔''

جب وہ واپس آرہے تھے، تو ڈاکٹر منظور نے کہا: ''شریف لوگ ہیں۔ اور ہاں یار، اس لڑکی عذرا کا خیال رکھنا۔ اگر کوئی معقول برسرِ روزگار لڑکا ہو تو بتانا۔ ماں کی جان اس لڑکی کی شادی میں بھی اٹکی ہوئی ہے۔ لڑکی بھی بہت اچھی ہے۔''

> اس نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔ ''خدا کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ تم جیسے دریادل لوگوں کو بہت دے گا۔''

ظہیر نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتا رہا۔ جب اسپتال کے کمپاؤنڈ میں گاڑی رکی اور ڈاکٹر منظور نے ظہیر سے باہر آنے کا کہا، تو وہ بولا ''نہیں۔ اب چلتا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔''

جب وہ جا رہا تھا منظور نے آگے بڑھ کر کہا ''بھئی وہ اے سی لگوانا مت بھول جانا۔''

اگلے دن شام پانچ بجے اس نے ڈاکٹر منظور کو فون کر کے بتایا کہ اس کے آدمی اے سی لگا آئے ہیں۔ مگر ایک نظر وہ خود دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کے پاس آجائے تاکہ اکٹھے چلیں۔ مگر ڈاکٹر منظور نے جانے سے معذرت کی کہ وہ اس وقت فارغ نہیں اور کہا ''یار تم ہی ذرا ہمت کرو اور چکر لگا آؤ۔''

www.pdfbooksfree.pk

شام ڈھل گئی تھی۔ چراغ بس تھوڑی دیر میں جلا چاہتے تھے جب وہ عذرا کے گھر داخل ہوا۔ چارپائی پر نیم دراز ماں کی حالت بہتر تھی۔ اس نے سلام کیا۔ معمر عورت نے اسے قریب بٹھایا۔ شانوں پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ عذرا بہت پریشان ہے۔ خاتون نے اس سے گھر داری کے بارے میں سوالات کیے اور یہ جاننے پر کہ اس کے ہاں اولاد نرینہ نہیں، اس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ ''خدا کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ تم جیسے دریا دل لوگوں کو بہت دے گا۔''

اس نے شربت پیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ اُٹھنے سے پہلے اس نے ایک لفافہ تکیے کے نیچے رکھنا چاہا، مگر عذرا نے بڑھ کر اسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جس سرعت سے وہ گھر سے نکلنے لگا، اسی سرعت سے وہ اس کے پیچھے لپکی۔ برآمدے میں وہ رُک گیا۔ عذرا اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔ اس کی چمکتی آنکھوں میں گہرا اضطراب تھا۔ وہ بڑی مدھم اور شکستہ سی آواز میں بولی:

''میری عدم موجودگی میں آپ کے آدمی اسے سی لگا گئے وگرنہ میں لگنے نہ دیتی۔ آپ میری بات کا بُرا نہ منائیں۔ ہم جیسے لوگوں کے پاس عزتِ نفس کے سوا اور ہے ہی کیا؟''

وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ساٹھ کلو واٹ کے بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی زرد لگ رہا تھا۔ چمکتی خوبصورت آنکھوں میں اضطراب اور بے چینی موجزن تھی۔ ایک پل ظہیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر ٹھہری آواز میں بولا ''میرے پاس دولت خدا کی امانت ہے جسے کسی بھی غرض مند انسان پر صرف کرنا گویا اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ آپ لوگوں کا ذرا سا دکھ بانٹ کر مجھے جو خوشی اور سکون ملا ہے، کیا آپ مجھے اس سے محروم کرنا چاہیں گی؟''

وہ گم صم کھڑی سن رہی تھی۔ اس نے چلنے کے لیے قدم اٹھائے، تو وہ جیسے چونکی اور بولی ''مگر اس کی تو قطعی ضرورت نہیں۔ میری تنخواہ ہمارے لیے کافی ہے۔'' اس نے لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' ظہیر نے نرمی اور شفقت سے کہا۔ پھر غیر ارادی طور پر اس نے عذرا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر لفافہ ان میں بند کرتے ہوئے کہا:

''میں تم سے بہتر جانتا ہوں کہ تمھیں اس کی ضرورت ہے یا نہیں!''

وہ بوکھلا سی گئی۔ چپ چاپ لفافہ پکڑ لیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رکا اور بولا ''اگر میں تھوڑا سا شربت اپنے لیے بنوانے کی فرمائش کروں تو.....''

''ارے۔'' وہ جیسے کھل اٹھی۔ ''آپ کو اتنا پسند آیا ہے، میں ضرور بنا دوں گی۔'' ظہیر رخصت ہوا، تو وہ دروازے کی کُنڈی ہاتھوں میں پکڑے دیر تک کھڑی یہ سوچتی رہی کہ کیا کچھ لوگوں میں دولت کے باوجود دل زندہ رہتا ہے؟

اگلے دن وہ اپنی نئی فیکٹری کے دفتر میں مصروف تھا۔ پروجیکٹ منیجر نے فون پر اطلاع دی کہ یورپا پلانٹ کی کیس لیک کر گئی ہے اور وہ بند ہو چکا۔ وہ سارے معاملات چھوڑ کر ساہیوال چلا گیا۔ پلانٹ دوبارہ چالو کرنے میں کافی دن لگے۔ فارغ ہو کر آیا۔ کچھ ضروری کام نپٹائے۔ شام کو وہ ڈاکٹر منظور سے ملنے اس کے گھر گیا۔ عذرا اور باداموں کا شربت اسے کئی بار یاد آیا تھا۔

ڈاکٹر منظور اور اس کے بیوی بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جب وہ ان کے ہاں پہنچا، تو طاہرہ اور بچوں نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا۔ طاہرہ پھر چائے بنانے چلی گئی

www.pdfbooksfree.pk

اور بچے ٹافیاں کھانے میں جت گئے۔ تب ظہیر، ڈاکٹر منظور سے مخاطب ہوا۔ ''یار تم نے عذرا کے لیے کسی لڑکے کا کہا تھا۔''

''ہاں'' ڈاکٹر منظور! اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''لڑکا نہیں ایک مرد ہے میری نظر میں۔''

''کون ہے؟ کیسا ہے؟ کام وام کیا کرتا ہے؟ تعلیم کتنی ہے؟'' اس نے ڈھیر سارے سوال ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔

ظہیر نے سکون سے سگریٹ سلگایا۔ تیلی ایش ٹرے میں پھینکی۔ نشست سیدھی کی۔ لمبا کش لیا اور بولا ''بھئی وہ میں ہوں۔''

''ارے یار'' منظور نے زور سے ہنستے ہوئے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''داد دیتا ہوں تیرے فیصلے کی۔ بھابھی تو یوں بھی پچاس سے اوپر کی ہو چکی ہیں۔''

''منظور! یہ عمر والی بات نہیں، زندگی کا خوبصورت ترین حصہ اس کے ساتھ نتھی ہو کر جلتے اور اپنا خون پیتے میں گزار دیا۔ اب تو بڑھاپے کی آمد آمد ہے۔ ہاں ایک کسک اور محرومی سی ہے جو اکثر پریشان رکھتی ہے۔ سوچتا ہوں، غریبانہ مزاج کی یہ لڑکی شاید میرے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔''

''میں عذرا کی ماں سے بات کرتا ہوں۔ یوں بھی ظہیر، تمھیں اپنی لمبی چوڑی جائداد کے لیے ایک بیٹے کی ضرورت تو ہے۔''

''چھوڑو بھائی، اس موضوع پر میں نہیں سوچتا۔''

چند دن بعد ایک شام منظور کا فون آیا۔ اس نے کہا ''تم آج شام ذرا عذرا کے ہاں جانا۔''

ظہیر پوچھنا چاہتا تھا کہ بات چیت کا کیا نتیجہ نکلا، مگر فون منقطع ہو گیا۔ اس نے چند بار کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ ''بہرحال شام کو دیکھا جائے گا۔'' کہتے ہوئے وہ کام میں مصروف ہو گیا۔

چلنے لگا، تو بارش شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر انتظار میں بیٹھا کہ بارش تھم جائے، تو چلے مگر وہ اور تیز ہو گئی۔ برساتی پہن کر اس کے گھر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ذرا سا دھکا دیا، تو کھل گیا۔ ٹین کی چھت والا برآمدہ بارش کی بوندوں سے بے ہنگم شور مچا رہا تھا۔

باورچی خانے میں عذرا چولھے کے سامنے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ سیاہ کھلے بال یوں تھے جیسے شیش ناگ کی طرح زمین پر کنڈلیاں مارے بیٹھے ہوں۔ یہ حیرت انگیز منظر تھا۔ اتنے لمبے بال اُس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ دال اُبل کر ہنڈیا سے باہر گر رہی تھی۔ لکڑیاں شُوں شُوں کرتی بجھتے ہوئے کسیلا دھواں چھوڑ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے بڑھا اور باورچی خانے میں دھرے موڑھے پر بیٹھ گیا۔ عذرا نے چونک کر دیکھا اور سٹپٹاتے ہوئی بولی:

''ارے آپ کب آئے؟ اور یہاں کس لیے بیٹھ گئے۔ اندر بیٹھئے نا، یہاں حبس ہے۔''

''تم بھی تو حبس میں بیٹھی ہو۔'' وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں تو عادی ہوں۔'' عذرا نے لکڑیوں کو چولھے کی دیواروں سے پٹختے ہوئے کہا۔ سلگتے ہوئے حصے جھڑ گئے اور آنچ تیز ہو گئی۔ ہنڈیا اس نے اُتار لی۔

''میں اگر آپ کی محرومیوں کی تلافی کر سکوں، تو اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی بات اور کیا ہو گی۔ مگر...... ''وہ چُپ ہو گئی۔

www.pdfbooksfree.pk

''میں بھی منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پیدا نہیں ہوا۔''

دونوں خاموش ہو گئے۔ چھوٹے سے باورچی خانے میں ظہیر کے لباس پہ لگے عطر کی بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی تھی۔ باہر بارش ہو رہی اور بادل گرج رہے تھے۔

''ڈاکٹر منظور نے فون کیا تھا کہ عذرا کوئی بات کرنا چاہتی ہے...... کہو۔''

''میں اگر آپ کی محرومیوں کی تلافی کر سکوں، تو اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی بات اور کیا ہو گی۔ مگر......'' وہ چپ ہو گئی۔

''مگر کیا؟'' ظہیر نے بات کاٹ دی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عذرا کے چہرے پر جذبات کی کشمکش تھی۔ آنکھوں میں دکھ تھا۔ اس کے ہونٹ لرزے اور سر جھک گیا۔ وہ بہت دھیرے سے بولی۔ ''میں اگر آپ کو بیٹا نہ دے سکی تو؟''

ظہیر کے جسم میں خفیف ارتعاش ہوا۔ چہرے کا رنگ بدلا۔ اگلے ہی لمحے وہ کہہ رہا تھا: ''میرے پاس کون سا تخت طاؤس ہے جس کے لیے وارث کا ہونا لازم ہے؟ اصل میں، ہمارے معاشرے کا ڈھانچہ کچھ اس ڈھب کا بن گیا ہے کہ اس میں بیٹے کو اولیت دی گئی۔ یوں بھی انسانی فطرت ہے کہ جس چیز کی محرومی ہو، اس کی کسک زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میں تو کئی محرومیاں رکھتا ہوں۔ ایک اچھی، پیاری اور مخلص بیوی کی بھی شدید تمنا ہے۔''

☆☆☆

وہ شادی کی خبر چھپانے کا قائل نہ تھا مگر طاہرہ اور ڈاکٹر منظور کے اصرار پر خاموش ہو گیا۔

''چپ رہو۔ شور شرابے سے جب تک بچ سکتے ہو بچو۔ تمہارا تو خاندان ویسے بھی اوّل نمبر کا سازشی ہے۔''

عذرا اپنی ماں سمیت ایک خوبصورت گھر میں رہنے لگی۔ زندگی کی آسائشیں اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئیں۔ اچھی خوراک ملی، تو جلدی چہرے کی زردیاں سرخیوں میں بدل گئیں۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ دس ماہ بعد ایک خوبصورت بیٹا بھی آ گیا۔ ظہیر ساہیوال گیا ہوا تھا۔ واپس آیا، تو بیٹے کی پیدائش کا پتا چلا۔ عذرا سروسز اسپتال میں تھی۔ یہ ایسا پُرمسرت موقع تھا کہ ڈاکٹر منظور سے گلے ملتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

زندگی کی ہر خواہش پوری ہوئی، تو ظہیر کی صحت قابلِ رشک ہو گئی۔ ایسی دلآویز شخصیت تھی کہ ملنے جلنے والے حیرت سے کہتے: ''ظہیر تو روز بروز جوانی کی طرف قدم اُٹھا رہا ہے۔ تجھے تو پچھلا گیئر لگ گیا ہے۔''

تین سال میں تین بیٹے ہو گئے۔ عذرا ہر بیٹے پر پہلے سے زیادہ اسمارٹ اور دلکش ہو جاتی۔ وہ ساہیوال اور لاہور میں اپنے دن بانٹ کر رہتا۔ جب بھی ساہیوال سے آتا، عذرا کھلے دل اور ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ سے خوش آمدید کہتی۔ کبھی کبھی وہ بڑی جذباتی آواز میں کہتا: ''میرا جی چاہتا ہے عذرا کہ تمہارے ساتھ ہی بس جاؤں۔ لیکن بچیاں بڑی ہو گئی ہیں۔ انھیں مناسب نگرانی کی ضرورت ہے۔ اسی لیے مجھے ساہیوال بھاگنا پڑتا ہے۔''

بڑی بچی پندرہ سال کی ہو رہی تھی اور چھوٹی چودہ کی۔ چھوٹی کا رشتہ بڑی بہن اپنے بڑے بیٹے سے کرنا چاہتی تھی۔ وہ فضائیہ کی جی۔ ڈی پائلٹ برانچ کے لیے منتخب ہو گیا تھا۔ ادھر دوسری بہن آسیہ انجینئرنگ میں پڑھتے بیٹے کے لیے کئی بار رشتہ مانگ چکی تھی۔

اس بار ظہیر ساہیوال آیا، تو بڑی بہن اور بہنوئی دونوں نے فون پر بتایا کہ وہ آ رہے ہیں۔ بہن منگنی کی رسم

www.pdfbooksfree.pk

ادا کرنے کو بضد تھی۔ اگلے دن دونوں میاں بیوی منگنی کی تفصیلات طے کرنے آدھمکے۔ ظہیر نے ہنستے ہوئے کہا:

"گھر کی بات ہے، پہلے انھیں پڑھ، تو لینے دیجیے۔"

"بھئی میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ مجھے بہت سے ارمان نکالنے ہیں۔ ہاں آسیہ کو سمجھ دینا کہ وہ میرے مقابلے پر آنے کی کوشش نہ کرے۔"

"آپا جان! اگر وہ بھی دھوم دھام سے منگنی کرنا چاہیں گی، تو بھلا مجھے کیا انکار ہوسکتا ہے؟"

"ظہیر دیکھو، ان لوگوں نے ہمیں مصیبت میں ڈال دینا ہے۔"

"کیسی مصیبت؟" ظہیر نے حیرت سے پوچھا۔

ابھی ظہیر کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ آسیہ اور اُس کا شوہر بھی آدھمکے۔ وہ کھلکھلاتے ہوئے اُٹھا اور بولا۔

"اخو، بڑے موقع پر آئے ہیں۔ ابھی آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔"

"یہ اپنے پیچ تل رہے ہوں گے۔ نمبر نہ نکلنے کی تو انھیں سدا سے بیماری ہے۔ دیکھو ظہیر، میری بہن کا شوہر کہنے کو میرا بھائی ہے، مگر ہے اوّل نمبر کا حسدی اور لالچی۔"

طبلِ جنگ بجنے میں پل نہیں لگا اور گولہ باری شروع ہوگئی۔

"ظہیر! تمھارے لیے بہتر ہے کہ جائداد کا بٹوارہ کر دو۔ ہم ان کے منہ نہیں لگنا چاہتے۔" بڑے بہنوئی نے کہا۔

وہ گنگ بیٹھا رہ گیا۔ پل پل اسے بجلی کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اِن کی اندرونی خباثتوں سے وہ ناواقف تو نہ تھا، مگر وہ یوں کھلم کھلا سامنے آجائیں گے، اُسے اندازہ نہیں تھا۔

اب ایک اور منظر بھی کہیں پیچھے سے اُبھر کر نمایاں ہوا۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تینوں بیٹے اور دونوں بیٹیاں

اخلاص اور اطاعت

☆جو لوگ دل میں خلوص رکھتے ہیں، وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری پر بلند مرتبہ پائیں گے۔

☆دنیا میں جو لوگ دوسروں کے لیے خلوص رکھیں، وہ ان کی نگاہ میں عزیز ہو جاتے ہیں۔

☆خلوص سے کی گئی عبادت اور خدمت کبھی رائگاں نہیں جائے گی۔

☆بے ادب بے نصیب اور باادب بانصیب۔

☆کسی کا جائز حکم نہ ماننا دراصل بدنصیبی کی علامت ہے۔

☆راہِ راست پر گامزن اور مخلص لوگوں کی پیشانی ہمیشہ اطاعت و خدمت پر جھکی رہتی ہے۔

☆دنیاوی رزق و عزت میں کمی بیشی مشیت ایزدی سے ہوتی ہے نہ کہ محنت و عقل پر۔

(شیخ سعدیؒ شیرازی، انتخاب: اطیب جان، واہ کینٹ)

ایک دوسرے کے مقابلے پر صف آرا ہیں۔ اس نئے منظر نے اُسے دہلا کر رکھ دیا۔ بہرحال ظہیر نے بڑے تدبر اور بُردباری سے صورتِ حال سنبھالی اور سب کو دلاسے دے کر رخصت کیا۔

اگلے دن وہ اپنے وکیل کے پاس بیٹھا اپنی جائداد کا ۷۵ فیصد حصہ سماجی بہبود کی تنظیموں کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا:

"میرے بہنوئیوں میاں محمد بشیر اور میاں محمد نذیر کو جائداد کے تصفیے سے مطلع کر دو۔ انھیں بتا دینا کہ مجھے اپنے بچوں کو علم سے مزین کرنا اور انھیں دنیا کے صحرا میں دھکیل دینا ہے اور بس!"

www.pdfbooksfree.pk

کرۂ ارض کے طاقتور حکمران کا

اُڑنے والا محل

دُنیا بھر کی آسائشات و سہولیات رکھنے والے اڑن کھٹولے کا قصۂ عجب

فقیر اللہ خاں

ایک عظیم الجثہ بحری جہاز ساحل سمندر پر دیکھا جائے، تو اس قدر حیرانی نہیں ہوتی جتنی چھے منزلہ عمارت کو فضا میں اُڑتا دیکھ کر ہوگی۔ جی ہاں! یہ کسی طلسماتی محل یا تخت سلیمانی والے اڑن کھٹولے نہیں صدر امریکا کے اس طیارے کی بات ہو رہی ہے جو واقعی چھے منزلہ عمارت کی اونچائی کے برابر ہے۔ اس میں ایک سو آدمی بآسانی سفر کر سکتے ہیں۔ دو ہزار آدمیوں کا کھانا ہر وقت تیار اور محفوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ اتنا بڑا طیارہ ہے کہ اس کے آگے پیچھے کام کرنے والے چلتے پھرتے لوگ بونے معلوم ہوتے ہیں اور قرب و جوار میں کھڑے جہاز شہباز کے سامنے ممولے!

اس وقت ایک جیسی خصوصیات رکھنے والے دو طیارے، بوئنگ وی سی۔۲۵ امریکی صدر کے زیر استعمال ہیں۔ بوئنگ کمپنی نے اپنے صدر ہی کے لیے یہ دونوں طیارے خصوصی طور پر تیار کیے۔ یہ ۱۹۹۰ء سے امریکی صدور کے زیر استعمال ہیں۔

صدر امریکا کے اس فضائی محل میں وہ تمام ضروری سہولیات میسر ہیں جو واشنگٹن ڈی سی والے وہائٹ ہاؤس میں دستیاب ہیں۔ اسی لیے طیارے کو اس سے متعلقہ محکمے اور افراد عرف عام میں ''فلائنگ اوول آفس'' اور ''فلائنگ وہائٹ'' ہاؤس کہتے ہیں۔ طیارے کی بلندی ۶۳ فٹ ۵ انچ ہے۔ یہ بلندی ایک چھے منزلہ عمارت کے برابر ہے، لیکن طیارے کی تین منزلیں ہیں۔ نچلی اور پہلی منزل میں سامان اور خوراک رکھی جاتی ہے، دوسری منزل میں صدر اور اس کا عملہ بیٹھتے اور کام کرتے ہیں۔ اسی منزل پر صدر کا کانفرنس روم، خواب گاہ، نجی کمرے اور کئی غسل خانے واقع ہیں۔ یہ سب جہاز کے اگلے حصے میں ہیں۔

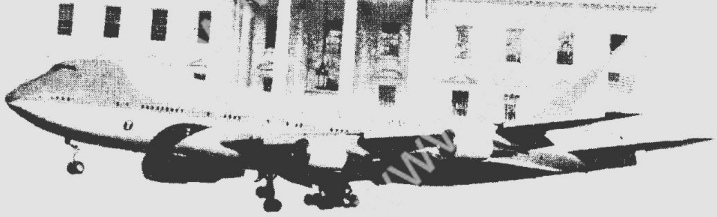

www.pdfbooksfree.pk

سب سے اوپر والی منزل میں جہاز کا عملہ جو تین ہوابازوں اور ۲۳ کیبن کریو پر مشتمل ہے، قیام کرتا ہے۔ اس جہاز میں کل ۱۰۲ نشستیں ہیں۔ ۷۶ صدر اور اس کے ہمراہیوں اور اوپر ۲۶ عملہ جہاز کے لیے۔ اس جہاز میں ۴۰۰۰ فٹ پہ پھیلا فرش جو صدر امریکا اور دوسرے مسافروں کے زیرِ استعمال رہتا ہے۔ جہاز کا کمیونیکیشن روم بھی اسی فرش پر ہے۔

یہ کوئی عام طیارہ نہیں، اس میں ایسی شاندار سہولیات میسر اور انتہائی حساس مواصلاتی آلات نصب ہیں جو کسی دوسرے طیارے میں موجود نہیں۔ پچاسی نشستوں پر ٹیلی فون سیٹ نصب ہیں۔ انیس ٹی وی سیٹ بھی مختلف جگہوں پر لگے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو، فیکس مشینوں اور کمپیوٹر (انٹرنیٹ) کی سہولت بھی موجود ہے۔ گویا صدر امریکا یا اس کا عملہ کسی بھی وقت دنیا کے کسی بھی خطے سے ریڈیائی رابطہ کرسکتا ہے۔ بوقتِ ضرورت صدر اپنی قوم سے براہ راست خطاب بھی کرلیتا ہے۔

اس خصوصی جہاز میں تجربہ کار ڈاکٹر اور نرسیں صدر کے ہمراہ سفر کرتی ہیں۔ ادویہ کے ایک اسٹور کے علاوہ ایک آپریشن روم بھی ہر طرح کے جدید آلات جراحی سے لیس ہے۔ جہاز میں ایسے آلات نصب ہیں جو بوقت ضرورت دشمن کا ریڈار سسٹم جام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

جہاز میں جنرل الیکٹرک کمپنی (GEC) کے تیار کردہ چار طاقتور انجن نصب ہیں۔ یہ طیارہ اڑتے اڑتے فضا میں کسی دوسرے جیٹ جہاز سے تیل حاصل کرسکتا ہے۔ یوں اس قابل ہوجاتا ہے کہ ایک ہی اڑان میں بغیر رکے ساری دنیا کے گرد چکر لگا سکے۔ گویا ساری دنیا اس طیارے کی دسترس میں ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، یہ جہاز امریکی طیارہ ساز ادارے ''بوئنگ کمپنی (Boeing) کا تیار کردہ ہے۔ یہ

ائیرفورس ون..............ایک نظر میں

ساخت	بوئنگ کمپنی	پروں کا پھیلاؤ	۱۹۵فٹ، ۸/۱ انچ
سال	۱۹۸۷ء	لمبائی	۲۳۱ فٹ، ۵/۱ انچ
قیمت	۳۲۵ملین ڈالر	اونچائی	۶۳ فٹ، ۵ انچ
انجنوں کی تعداد	چار (GEC)	رفتار فی گھنٹا	۷۰۰ میل (۱۱۰۰ کلومیٹر)
نشستوں کی تعداد	۷۶	دائرہ پرواز	۷۸۰۰ میل، ۱۳۰۰۰ کلومیٹر
تعداد عملہ	۲۶ (۳ پائلٹ)	بلندی پرواز	۴۵۱۰۰ فٹ

کمپنی دنیا میں بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ یہی کمپنی بوئنگ سیریز کے بوئنگ ۷۰۷، ۷۲۰، ۷۲۷، ۷۳۷، ۷۴۷، ۷۵۷ اور جدید ترین طیارہ ۷۷۷ (ٹرپل سیون) تیار کرتی ہے۔ صدر امریکا کا طیارہ بوئنگ ۷۴۷ سیریز کا حصہ ہے۔ اس کمپنی کا کارخانہ امریکا کی شمال مغربی ریاست واشنگٹن کے شہر سیٹل (Seattle) میں واقع ہے۔

جب امریکی صدر کے لیے دو طیارے ۱۹۸۷ء میں خریدے گئے، تو مالیت ۲۳۵ ملین ڈالر تھی۔ تبھی ان کی عمر کا تعین بھی کردیا گیا جو تیس سال تھی۔ اب یہ دونوں طیارے ۲۰۱۷ء میں اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر ختم ہوجائیں گے۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا طیارہ لے گا۔ ظاہر ہے، اس وقت تک امریکا کا نیا صدر بھی منتخب ہوجائے گا۔ موجودہ صدر اوباما اپنی دونوں اننگیں کھیل کر کسی فارم ہاؤس کو عزت بخشیں گے۔

صدر امریکا کا طیارہ، فضا میں ۴۵۱۰۰ فٹ بلندی تک پرواز کرسکتا ہے۔ اس کی حد رفتار ۷۰۰ میل (۱۱۰۰ کلومیٹر) فی گھنٹا ہے۔ یاد رہے، فضا میں عام مسافر طیارہ ۳۲/۳۰ ہزار فٹ کی بلندی تک پرواز کرتا ہے۔ اس طیارے میں ۵۳۶۱۱ گیلن (۲۰۳۰۰۰) لیٹر تیل بھرا جا سکتا ہے۔ گویا یہ

www.pdfbooksfree.pk

آدھی دنیا تک بغیر رکے پرواز کرنے کے قابل ہے۔

جہاز میں کھانا تیار کروا کر منجمد حالت میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اسے وقت ضرورت الیکٹرک اوون میں گرم کرنا ممکن ہے۔ جہاز میں ۲۰۰۰ کھانے محفوظ رکھنے کی گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ کھانا تیار کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

جہاز کے دروازے کے ساتھ ہی سوار ہونے اور اترنے کے لیے فولڈنگ (سکڑنے) والی سیڑھی نصب ہے۔ وہ جہاز ہی کا حصہ ہے۔ جہاز کے کمیونیکیشن نظام میں ۲۳۸ میل لمبے تار آلاتِ مواصلات میں استعمال ہوئے ہیں۔ وہ اسی سائز کے عام مسافر طیاروں میں استعمال ہونے والے تار سے دوگنا لمبے ہیں۔

صدر کے ہمراہ سفر کرنے والوں میں مشیر (Advisors)، سیکرٹ سروس کے نمائندے، پرسنل سیکرٹری، افراد ذرائع ابلاغ اور دوسرے خاص مہمان شامل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ صدر امریکا کا پالتو کتا (پپی) بھی اس فضائی محل میں اچھلتا کودتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل جب صدر امریکا مسٹر اوباما بھارت کے سرکاری دورے پر آئے، تو ان کا کتا بھی میڈیا میں موضوعِ سخن بنا رہا۔ امریکا کے سابق صدر جارج ڈبلیو بش کا کتا بھی ان کے ساتھ ہی سفر کرتا تھا۔ اس لیے تو کہتے ہیں بڑے لوگوں کی نرالی باتیں۔

جب کوئی جہاز کسی دوسرے ملک کی فضائی حدود میں محو پرواز ہو، تو وہاں کے محکمہ شہری ہوا بازی کو اپنی شناخت بتاتا ہے۔ یہ عمل ہوا بازی کی اصطلاح میں کال سائن (Call Sign) کہلاتا ہے۔ صدر امریکا کے طیارے کا کال سائن "ایئر فورس ون" (Air Force One) ہے۔ یہ صرف صدر امریکا کے طیارے کے لیے مخصوص ہے۔

یہ کال سائن امریکی افواج اور دنیا کے بھی شہری ہوا بازی کے محکموں میں عام فہم ہے۔ یہ امریکی صدر کے طیارے کو کسی بھی قسم کے سول اور فوجی طیاروں سے ممیز کرتا ہے۔ اگر صدر کسی فوجی جہاز میں سفر کرے، تو اس کا کال سائن 'آرمی ون' ہوگا۔ ہیلی کاپٹر میں سفر کرے، تو اس کا کال سائن 'میرین ون' بن جاتا ہے۔

صدر امریکا کا خاص جہاز امریکی دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کے ساتھ ملحق ریاست میری لینڈ میں ہوائی اڈے، اینڈریو ایئر فورس بیس (Andrew Air Force Base) پر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ واشنگٹن ڈی سی سے ۱۱ کلومیٹر اور وہائٹ ہاؤس سے ۳۳ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہائٹ ہاؤس سے آنے جانے کے لیے صدر امریکا ہیلی کاپٹر استعمال کرتا ہے۔ وہائٹ ہاؤس کا فوجی رابطہ کار براہ راست اس طیارے کی نگرانی کا ذمے دار ہے۔

اینڈریو ایئر بیس امریکی فضائیہ کا ہوائی اڈا ہے۔ یہ ریاست میری لینڈ کی پرنس جارج (PG) کاؤنٹی میں واقع ہے۔ یہ ہوائی اڈا اس قدر محفوظ ہے کہ غیر متعلقہ بندہ بشر تو کیا وہاں کسی پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں۔ راقم کو قیام امریکا کے دوران اس ہوائی اڈے کی ہمسائیگی کا شرف حاصل رہا۔ رات کو جب اترتے چڑھتے طیاروں کی گھن گرج سونے نہ دیتی، تو دل میں اس شخص کو کوستا جس نے مجھے یہ مکان کرائے پر دلوایا تھا۔

گزشتہ سال جب وزیراعظم میاں نواز شریف امریکا کے سرکاری دورے پر واشنگٹن آئے، تو ان کا خصوصی طیارہ بھی اسی ایئرپورٹ اینڈریو ایئربیس پر اترا تھا۔ وہاں سے انھیں خاص ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہائٹ ہاؤس لے جایا گیا۔

اس ہوائی اڈے کے دو رن وے ہیں: ایسٹرن رن وے (۱۱۷۰۰) فٹ اور ویسٹرن رن وے (۱۱۳۰۰) فٹ طویل ہے۔ اس ہوائی اڈے کا کل رقبہ ۱۸ مربع کلومیٹر ہے۔ اس کو چاروں اطراف سے کنکریٹ کی مضبوط دیوار سے محدود کیا گیا ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

سے ریل پر سفر کا آغاز کیا جائے، تو تقریباً
لاہور ۱۰۰ کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد واں
رادھا رام کا اسٹیشن آتا ہے۔ یہ بستی اب حبیب
آباد کہلاتی ہے۔ کئی برس قبل میرے والد، محمد دلشاد خان لودھی
کیبن مین کی حیثیت سے اس اسٹیشن پر تعینات تھے۔
جب پاکستان ریلوے کے اے ٹی او (اسسٹنٹ ٹریفک
آفیسر) کسی ریل میں بیٹھ کر وہاں سے گزرتے، تو وہ سخت
پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ سخت ترین گرمیوں میں انھیں
نیکر پر بھاری بھرکم پاجاما اور بنیان پر موٹی قمیص پہننی پڑتی۔

سرگزشت

اس وقت وہ نہایت بیزاری کے عالم میں کہتے
''یار جب تک اے ٹی او صاحب کی گاڑی نہیں گزر جاتی،
مجھے سکون نہیں مل سکتا۔'' نجانے اے ٹی او کو کون سی
مصیبت پڑی تھی جو ادھر آ نکلے اور ہمیں پریشان کر کے
رکھ دیا۔ اس وقت میری عمر بمشکل آٹھ دس سال ہوگی۔
میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ اے ٹی او کس بلا کا نام ہے
اور یہ کہاں رہتی ہے۔ اگر آسمان پر رہتی ہے، تو پھر زمین

ایک شکر گزار بیٹے نے کہا

مجھے اپنے باپ پر فخر ہے

ریلوے سے تازیست وابستہ رہنے والی نیک روح کا ماجرا، اس نے
ساری عمر حلال روزی کمائی اور اولاد کو بھی قناعت و سادگی کا درس دیا

محمد اسلم لودھی

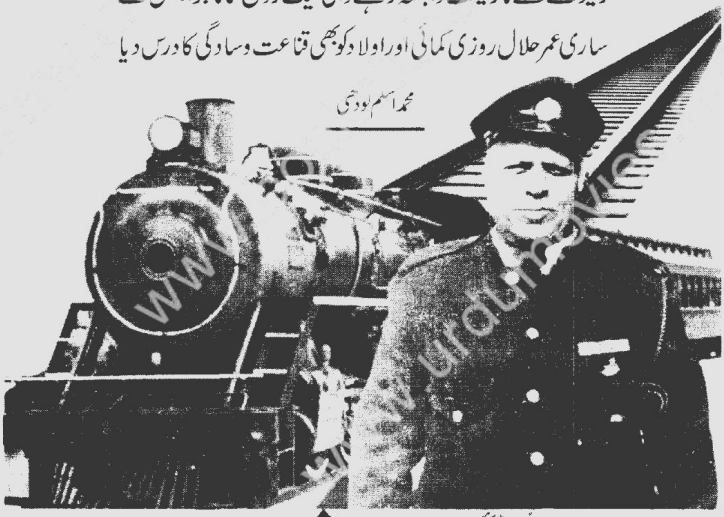

www.urdudigest.com

www.pdfbooksfree.pk

پر کیوں اتر آئی ہے۔

میں اپنے والد سے جنون کی حد تک محبت کرتا تھا۔ مجھے وہ سبھی سے زیادہ طاقت ور اور ذہین دکھائی دیتے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میں انھیں دیوار چین سے زیادہ بلند اور مضبوط تصور کرتا۔ یہ تصور اس لیے میرے ذہن میں محفوظ تھا کہ زندگی کے ابتدائی برسوں میں جب بھی کوئی مصیبت' بیماری یا پریشانی مجھے لاحق ہوتی، والد اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری حفاظت کرتے۔ انھیں اسی وقت سکون ملتا جب میں نارمل حالت میں واپس لوٹ آتا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میری آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔ والد صاحب کی ڈیوٹی اس دن صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک تھی۔ سخت ترین سردیوں میں جب ماں ہمیں دو دو پاجامے، تین تین قمیصیں اور باندر ٹوپہ پہنا کر سردی سے بچانے کی ناکام کوشش کرتی، تو اس لمحے میں اپنے والد کو وردی کے اوپر صرف ایک برانڈی (اوورکوٹ نما) پہنے سخت ترین سردی میں کیبن پر سرد ہوا کے تھپیڑوں سے دست بدست جنگ کرتا ہوا دیکھتا۔

اس دن وہ تھکے ہارے شام ڈھلے گھر واپس پہنچے، تو اپنے لاڈلے بیٹے کی سوجی آنکھیں دیکھ کر بے چین ہوگئے۔ انھوں نے اپنا آرام بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف میرے لیے سردیوں کی شام چھے بجے لاہور سے ساہیوال جانے والی ریل پر رینالہ خورد جانے کا پروگرام نہ صرف بنایا بلکہ آدھا گھنٹا پہلے ہی مجھے اپنی آغوش میں لیے واں رادھا رام ریلوے اسٹیشن کے ٹھنڈے بینچ پر آ بیٹھے۔ جب بذریعہ ریل ہم رینالہ خورد پہنچے، تو نہ صرف سردی میں حد درجہ اضافہ ہوا بلکہ بازار کی دکانیں بھی اکثر بند ہوچکی تھیں۔ نیم حکیم قسم کا ایک ڈاکٹر اپنی دکان ابھی بند کر ہی رہا تھا۔

والد صاحب نے اس سے درخواست کی کہ میرے لخت جگر کی آنکھیں خراب ہوگئی ہیں، از راہ کرم کوئی ایسی دوائی دیں جس سے یہ جلد ٹھیک ہوجائے۔ اُس نے میری آنکھیں غور سے دیکھیں پھر دوائی دے کر یہ کہتے ہوئے ہمیں فارغ کردیا کہ اللہ نے چاہا تو یہ بچہ دوائی سے ٹھیک ہوجائے گا۔ اللہ کے کرم سے میں ٹھیک بھی ہوگیا لیکن اس شام اور رات کی سخت ترین سردی میں اپنے والد کا ایثار اور شفقت مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ میرے والد واقعی ایک عظیم محافظ اور شفیق باپ تھے۔ ان کی قربانیوں کا صلہ زندگی بھر ان کی خدمت کرنے کے باوجود میں ادا نہیں کرسکا۔

بہرکیف اے ٹی او کی آمد کا تصور کرکے جب میرے والد پریشان ہوتے، تو ان سے زیادہ میں فکرمند ہوجاتا۔ اور سوچتا کہ یہ صاحب ہیں کون؟ انھیں کبھی واں رادھا رام جیسے چھوٹے اسٹیشن پر اترنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ بلا اگر واقعی واں رادھا رام اسٹیشن پر اتر جاتی، تو پتا نہیں وہاں کیا طوفان برپا کرتی۔ یہ تو اس بلا کی مہربانی تھی کہ لاہور سے بذریعہ ریل ساہی وال چلی جاتی تھی۔ اے ٹی او اپنے ائیرکنڈیشنڈ ڈبے کے شیشے اتارنا بھی گناہ تصور کرتے، لیکن اس کا ڈر لاہور سے ساہی وال تک ہر ریلوے اسٹیشن پر تعینات خاکروب سے لے کر اسٹیشن ماسٹر تک کو ہوتا۔ اے ٹی او کی ریل جس جس اسٹیشن سے بخیریت گزر جاتی، وہاں کے ریلوے ملازمین کی جان میں جان آتی۔ مشکل کے اس لمحے کئی ملازمین کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ ''جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔''

حالات نے کروٹ لی اور ۱۹۶۴ء کے سال میں چوتھی جماعت میں پہنچا۔ میرے دونوں بڑے بھائی محمد رمضان خان لودھی اور محمد اکرم خان لودھی بالترتیب میٹرک اور

www.pdfbooksfree.pk

آٹھویں جماعت میں پہنچ چکے تھے۔ انھیں پڑھنے کے لیے پتوکی جانا پڑتا۔ والد صاحب کی شفقت نے ایک بار پھر جوش مارا۔ انھوں نے اپنی ۸۰ روپے ماہوار تنخواہ میں سے جو ۱۰ روپے بچا رکھے تھے، وہ ڈی ایس آفس کے متعلقہ کلرک کو رشوت میں دے کر اپنی تعیناتی بطور شنٹنگ پورٹر لاہور کینٹ کروالی۔

شنٹنگ پورٹر کا کام بہت خطرناک اور کٹھن ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے صرف اپنے بچوں کو معیاری تعلیم دلوانے کی خاطر زندگی کا خطرناک ترین کام کرنا بھی گوارا کرلیا۔ میں نے کئی شنٹنگ پورٹرز کو معمولی سستی کرنے پر ریل کے نیچے آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے۔ اسے پاکستان ریلوے کی سب سے خطرناک ترین ڈیوٹی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ریلوے افسروں کے نزدیک شنٹنگ پورٹر کے فرائض انجام دینے والوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ وہ انھیں بھی دیگر ملازمین کی طرح جانور کے مانند ہانکنے ریٹائرمنٹ کی دہلیز پر لے جاتے ہیں۔

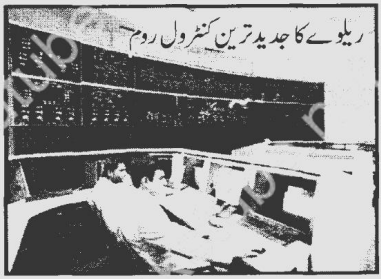
ریلوے کا جدید ترین کنٹرول روم

بہرکیف لاہور آنے کے بعد والد صاحب بڑے شہر کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر اپنی ڈیوٹی کے علاوہ چھانگا مانگا اور چیچہ وطنی کے جنگل سے لاہور آنے والی لکڑیوں سے بھرے ڈبے بھی خالی کرنے لگے۔ مجھے یاد ہے، ہم تینوں بھائی اسکول سے فراغت کے بعد والد صاحب کے ساتھ مل کر رات آٹھ بجے تک صرف ایک ڈبا بمشکل خالی کرتے۔ اس کے عوض روزی خان ٹھیکیدار ہمیں صرف تین روپے مزدوری دیا کرتا۔ یہ تین روپے ہی ہمارے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی ہوتے۔

میرے بھائی، تو میٹرک پاس کرنے کے بعد کہیں نہ کہیں ملازم ہوگئے، میں نے بطور پرائیویٹ امیدوار ایف اے اور بی اے بھی کرلیا۔ میرے والد کی خواہش تھی کہ میں ریلوے میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر بھرتی ہوکر ''باؤ'' بن جاؤں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ڈی ایس آفس کے متعلقہ کلرک کو رشوت بھی دی۔ کلرک کے کہنے پر میں ہیڈکوارٹر میں ریلوے بورڈ کے ایک اہم ترین رکن کی کوٹھی پانچ کلو بغیر کانٹے والی مچھلی دے کر آیا۔ لیکن رشوت کی رقم اور مچھلی، دونوں کام نہ آئی۔ جب اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے بھرتی ہونے والوں کی فہرست لگی، تو اس میں میرا نام شامل نہیں تھا۔ نہ صرف مجھے افسوس ہوا بلکہ میرے والد کو بھی بہت صدمہ پہنچا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا خوبصورت سفید رنگ کی وردی پہنے سر پر سیاہ پی کیپ پہن اے ایس ایم کی کرسی پر بیٹھے اور لاہور میں گاڑیوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنے والے کنٹرولر سے فخر سے بات کرے۔ گاڑیاں لاہور سے ہارن بجاتی ساہیوال جائیں اور ان کا بیٹا ہر آنے جانے والی گاڑی کو خوبصورت وردی پہن کر سبز جھنڈی دکھائے۔ اس وقت سیون اپ، ون ڈاؤن کا نام بہت مشہور تھا۔ تیز گام، تیز رو، خیبر میل، کوئٹہ ایکسپریس بہت ''پھنے خاں'' ٹرینیں تصور کی جاتی تھیں۔ لاہور میں بیٹھ کنٹرولر ان ریلوں کی نقل و حرکت بہت باریک بینی سے دیکھا کرتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

مجھے یاد ہے، ۱۹۶۲ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں جماعت اسلامی نے ریل کے ذریعے خانہ کعبہ کا غلاف پہلے کراچی بھجوایا۔ پھر وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے اسے سعودی عرب بھیجا جانا تھا۔ یہ غلاف غالباً کسی ایکسپریس ریل پر موجود تھا۔ واں رادھا رام پتوکی سے دوسرا اور چھوٹا سا اسٹیشن ہے، اس لیے وہاں کوئی ایکسپریس گاڑی نہیں رکتی تھی۔ پسنجر ٹرینوں کے ذریعے ہی وہاں کے لوگ سفر کیا کرتے۔

اس زمانے میں ''گولہ سسٹم'' ریلوے میں رائج تھا۔ بغیر رکے جانے والی ایکسپریس ریل کو ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن سے چمڑے کے خول میں بند ایک گولہ پکڑنا ہوتا تھا۔ لوہے کی تار سے بنے گول چھلے میں یہ گولہ ڈالا جاتا۔ بغیر رکے جانے والی گاڑی جس لائن سے گزرتی، وہاں لوہے کا ایک فریم نصب ہوا کرتا تھا۔ اسٹیشن پر ڈیوٹی انجام دینے والا کانٹے والا وہ گولہ لوہے کے فریم میں نصب کر کے گاڑی کا منتظر رہتا۔ انجن کے دائیں جانب بیٹھا فائرمین ایک ہک کے ذریعے اس گولے کو تیز رفتاری سے اٹھاتا۔ اگر گولہ اٹھانے میں ناکام رہتا تو اس گاڑی کو اسٹیشن پر رکنا پڑتا۔

خانہ کعبہ کا غلاف لے کر جانے والی ریل کے بارے میں کنٹرولر کا حکم تھا کہ وہ کسی چھوٹے اسٹیشن پر نہ رکے بلکہ اُسے زیادہ احتیاط اور ذمے داری سے گزارا جائے۔ ایک جانب کنٹرولر کا سخت حکم، تو دوسری جانب واں رادھا رام شہر کے لوگ ریلوے لائن پر آ کے بیٹھ گئے کہ ہم نے خانہ کعبہ کے غلاف کی ہر حال میں زیارت کرنی ہے۔ اس صورت حال میں معمولی سی غلطی پر والد نوکری سے برطرف ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے ریل روکنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کر لیا۔

اسٹیشن ماسٹر، اے ایس ایم اور ریلوے کا تمام عملہ پلیٹ فارم پر بہت چوکنا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ریل کا نام کیا تھا لیکن جب وہ اوٹر سگنل عبور کر کے واں رادھا رام کی حدود میں داخل ہوئی، تو انجن میں بیٹھا فائرمین ہک کے ذریعے گولا اٹھانے لگا۔ اسی لمحے والد صاحب نے فریم کو جھٹکا دے کر گولہ زمین پر گرا دیا۔ گولہ نہ ملنے پر ریل کو رکنا پڑا۔ جونہی ریل رکی، ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس میں رکھے غلاف کعبہ کو چومنے لگے۔ جن کی پہنچ سے غلاف کعبہ دور تھا، وہ ریلوے انجن ہی کو چوم کر اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔

ایک جانب شہر والوں کا جوش و خروش عروج پر تھا، تو دوسری جانب اسٹیشن ماسٹر سمیت ریلوے کے تمام عملے کی پتلونیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ کنٹرولر بہت غصے میں دھاڑ رہا تھا کس نے یہ ریل روکی اور کیوں؟ کسی سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ جب والد صاحب سے باز پرس ہوئی، تو انھوں نے کہا کہ میں تو فریم میں گولہ لگا کر کھڑا تھا۔ اب گولہ پکڑنا فائرمین کا کام تھا میرا نہیں۔ بہرحال بہت مشکل سے بات دب آئی گئی ہوئی۔

لیکن اس واقعے کے بعد میرے ذہن میں یہ بات پیوست ہو گئی کہ جس کنٹرولر سے ریلوے کا تمام عملہ خائف رہتا ہے، آخر وہ بیٹھتا کہاں ہے؟ اور اس کو کس طرح خبر ہو جاتی ہے کہ ریل پتوکی پہنچ گئی، اب واں رادھا رام کے پلیٹ فارم پر رکی، اسے کب ساہیوال کی جانب روانہ ہونا ہے اور ساہیوال سے لاہور جانے والی چھوٹی گاڑیاں روک کر ایکسپریس ریل کو کیسے گزارنا ہے؟

اس انجانی اور ان دیکھی دنیا کا تصور میرے دماغ میں محفوظ تھا۔ میں اے ٹی او کے بعد کنٹرولر کے بارے میں بھی جاننے کی جستجو رکھتا تھا۔ کانٹے والے شنٹنگ پورٹر

www.pdfbooksfree.pk

کیبن مین اور اے ایس ایم سمیت ہر شخص کی زبان پر کنٹرولر کا لفظ بہت سننے کو ملتا۔

میں گزشتہ پچیس سال سے مختلف اخبارات میں باقاعدگی سے کالم/فیچر/مضامین لکھتا چلا آرہا ہوں لیکن کبھی یہ ''بلائیں'' دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ڈی ایس آفس بھی دو چار مرتبہ جانا ہوا، لیکن اس دفتر میں داخل ہونے کی مجھ میں جرات کہاں تھی؟ سنا کرتے تھے کہ اس دفتر میں اے ٹی او صاحب کے دادا جی بیٹھتے ہیں۔ پھر یہ خیال ذہن میں ابھرتا کہ اگر اے ٹی او کا اتنا جاہ و جلال ہے، تو ڈی ایس صاحب (ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ) کے رعب و دبدبے کا عالم کیا ہوگا۔

قدرت نے مہربانی کی۔ میں نے ریویو وزیر کو مخاطب کرکے ایک کالم لکھا جو روزنامہ نوائے وقت میں ۱۲ جنوری ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا۔ اس کالم میں کیبن مین اور شنٹنگ پورٹر کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ازالے کی تجاویز دیں۔ کالم شائع ہوتے ہی ایک کال آئی۔ معلوم ہوا ڈی ایس لاہور، جناب عبدالحمید رازی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ڈی ایس لاہور کا لفظ سننا تھا کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں پچاس سال پہلے کے دور میں پہنچ گیا جب اے ٹی او صاحب کے گزرنے پر میرے والد خوفزدہ ہوجایا کرتے تھے۔ میں نے سوچا، اگر ڈی ایس صاحب سے میری ملاقات ہوئی، تو میں دنیا کے خوفناک ترین انسان، اے ٹی او صاحب کو ضرور دیکھوں گا کہ وہ ہوتا کیسا ہے؟

میں نے اپنے داماد، حافظ تاج محمود سے رابطہ کیا اور رازی صاحب کے متعلق پوچھا۔ حافظ تاج پاکستان ریلوے میں سگنل انجینئر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ریلوے کے بارے میں بے پناہ معلومات رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ نہ صرف پورے ڈویژن کے مالک بلکہ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ صاحب کتاب ہیں اور انھوں نے ہفتے میں دو دن عام ملازمین سے ملاقات کے لیے وقف کررکھے ہیں۔ اب عبدالحمید رازی سے بالمشافہ ملاقات کی آرزو دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ ان سے گزارش کی کہ مجھے ٹریننگ اسکول/اکیڈمی کا دورہ بھی کرنا ہے۔ میں ایک جانب ریلوے کی انوکھی دنیا کو عملی روپ دھارتے، تو دوسری جانب میں اس ادارے کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں جہاں کسی زمانے میں میرے والد زیرتربیت رہے تھے۔

ایک گارڈ جھنڈی لہراتے ہوئے

میں سمجھتا ہوں یہ محبت کی انتہا ہے کہ مجھے ہر وہ شہر اور مقام، مقدس دکھائی دیتا ہے جہاں میرے والد کسی نہ کسی حوالے سے مقیم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بطور خاص بہاولنگر ریلوے اسٹیشن بھی دیکھ آیا جہاں پاکستان بننے سے پہلے میرے والد بہ حیثیت فائرمین اسٹیم انجن پر ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد انھیں اس دن ریلوے میں بطور کانٹے والا ملازمت ملی جب میری ولادت ہوئی۔ اس لیے دنیا میں میری آمد کو خاندان کے لیے خوش بختی تصور کیا گیا۔

آخر منگل ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء کو میں صاحب کرامت اور نیک سیرت قاری محمد اقبال عارف قادری

www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ ڈی ایس آفس پہنچا۔ سرد ہوا کے جھونکے جسم میں تھرتھلی مچا رہے تھے، لیکن ہم ریلوے کی حیرت پراسرار اور حیرت انگیز دنیا دیکھنے جا رہے تھے، اس کی خوشی دیدنی تھی۔ دہشت گردی کے اس دور میں ہر سرکاری دفتر میں رکاوٹیں کھڑی کر کے آنے والوں کے لیے بے پناہ مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں، لیکن ڈی ایس آفس میں داخل ہوتے ہوئے کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر نہ صرف میں حیران ہوا بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ ڈی ایس آفس نہیں جہاں اے ٹی او صاحب کے دادا جی بیٹھتے ہیں، بلکہ یہ تو درویشوں کا ڈیرہ ہے جہاں جو چاہے آ جا سکتا ہے۔

جناب عبدالحمید رازی نے اپنی نشست سے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا اور سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ بیٹھ کر ہم کمرے کا بغور جائزہ لینے لگے۔ کمرے میں ایک طرف لاہور ڈویژن کا نقشہ آویزاں تھا۔ دوسری جانب بہت تاریخی اہمیت کا حامل گھڑیال (وال کلاک) دیوار پر نصب دکھائی دیا۔ ذرا غور سے دیکھا، تو اس پر ۱۶۸۶ء سن لکھا تھا۔ سوا چار سو سال پرانا یہ گھڑیال انگلینڈ کی کسی معروف کمپنی نے بنایا تھا۔ حیرت کی بات یہ کہ سوا چار سو سال گزرنے کے باوجود اس گھڑیال میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ حرکت کرتی سوئیاں وقت گزرنے کا بخوبی احساس دلا رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد عبدالحمید رازی صاحب فارغ ہو کر ہم سے مخاطب ہوئے۔ وہ ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ جیسے اہم عہدے پر فائز ہیں، لیکن ان کی شخصیت بہت کھلی ڈھلی دکھائی دی، نہ کوئی رعب اور نہ کوئی دبدبہ! میں حیران تھا کہ میرے والد سمیت ہزاروں ریلوے ملازمین جس کے خوف سے تھر تھر کانپتے تھے، یہ ان سے کئی درجے بڑے افسر ہیں لیکن پھر بھی نہایت خوش اخلاق نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ پاکستان ریلوے کے بہترین سفیر ہیں۔ جو اپنے اخلاق اور حسن سلوک سے دوسروں کے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔

انھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ایک کیبن مین کا بیٹا ہوں، میری عزت افزائی کی اور ریلوے کے بارے میں بے شمار معلومات فراہم کیں۔ دوران گفتگو ایک صاحب اندر تشریف لائے۔ رازی صاحب نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ ڈی پی او ہیں۔ ان کا نام ہمدان نذیر ہے۔ گرمجوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ بھی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ ابھی اس شخص کو دیکھنے کی آرزو دل میں مچل رہی تھی جس کی آمد کا سن کر میرے والد پریشان ہو جایا کرتے تھے یعنی اے ٹی او.....

رازی صاحب نے بتایا کہ آپ جس اے ٹی او صاحب سے خوفزدہ ہیں، یہ ان سے زیادہ بڑے افسر ہیں۔ میں نے مسکرا کے جواب دیا، یہ تو بہت سادہ اور شریف النفس افسر دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے تو مجھے کوئی خوف نہیں آ رہا۔ رازی صاحب نے قہقہہ لگایا اور فون اٹھا کر اے ٹی او صاحب کو بھی بلوا لیا۔ اب میری نگاہیں دروازے پر جم گئیں۔ دروازہ کھولا، تو ایک سانولا سلونا درمیانی عمر کا شخص ادب سے نگاہیں نیچی کیے کمرے میں داخل ہوا۔ رازی صاحب نے مجھے مخاطب کر کے کہا ''لودھی صاحب، یہ ہیں وہ اے ٹی او صاحب۔ جنھیں دیکھنے کی فرمائش آپ بار بار کر رہے تھے۔''

میرے جسم میں خوشی کے پھوارے پھوٹ رہے تھے۔ میں تصور ہی میں اپنے والد سے بولا ''ابا جان کاش آج آپ زندہ ہوتے، تو اس کمرے میں پاکستان ریلوے کے سینئر ترین افسروں کو اکٹھے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کس

www.pdfbooksfree.pk

قدر خوش ہوتے۔ ان افسروں میں وہ اے ٹی او بھی ہیں جن کے ریل گزرنے سے آپ خوفزدہ ہوجایا کرتے تھے۔"

میں نے رازی صاحب کو بتایا کہ میرے والد ریلوے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ ریلوے ہی ان کی زندگی کا اہم ترین حصہ تھا۔ انھیں اپنی وردی سے بہت پیار تھا۔ جب ترقی پاکر وہ یارڈ فورمین بنے، تو سیاہ رنگ کی گرم وردی ریلوے کی جانب سے ملی۔ جب گھر پر ہوتے، تو براس پالش سے اپنی وردی کے بیج چمکانے میں مصروف رہتے۔ ہم ان کے سیاہ جوتے بھی پالش سے اس طرح چمکا دیتے کہ چہرہ نظر آجائے۔ وہ جب وردی پہن کر لاہور کینٹ اسٹیشن پلیٹ فارم پر چلتے، تو ان کے کندھے پر لگے بیج سورج کی روشنی میں جگمگانے لگتے۔

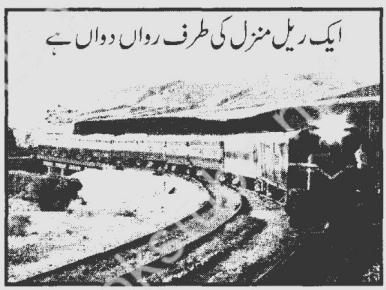

دوران ڈیوٹی کبھی کبھار انھیں مال گاڑی میں بہ حیثیت گارڈ سے ساہیوال جانا پڑتا، تو وہ مال گاڑی کے ۷۲ ڈبوں کے بعد ایک ویران کیبن میں بہترین وردی پہن اس طرح بیٹھ جاتے جیسے شادی گھروں کی اسٹیج پر دولھے بیٹھتے ہیں۔ انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ مال گاڑی ہے جس کی نہ روانگی کا کوئی وقت تھا اور نہ ہی منزل مقصود پر پہنچنے کا کوئی حتمی پروگرام۔ بعض اوقات تو کسی چھوٹے اسٹیشن کے جنگل میں مال گاڑی کو کھڑا کرکے کنٹرولر بھول جایا کرتا۔ جبکہ والد صاحب کو بھوکا پیاسا رہنا پڑتا تھا۔ ساہیوال پہنچ کر وہ ریسٹ ہاؤس میں کچھ دیر آرام کرتے پھر کسی اور گاڑی کو لیے لاہور آجاتے۔

وہ کانٹے والے تھے، کیبن مین، یارڈ فورمین یا مال گاڑی کے گارڈ، پاکستان ریلوے میں ان کی ساری زندگی سرخ اور سبز جھنڈی دکھاتے ہی گزری۔ رات کو ان کے پاس ایک ہاتھ سے پکڑنے والی بتی ہوا کرتی۔ اس میں گودام سے مٹی کا تیل بھروا کر ایک چراغ سا رکھا ہوتا۔ بتی میں تین گھومنے والے شیشے تھے: ایک سفید ایک سبز اور ایک سرخ رنگ کا۔ رات کے وقت جب کسی ریل کو روانگی کا سگنل دکھانا ہوتا، تو وہ گھوما کر چراغ کی روشنی کے سامنے سبز شیشہ کردیتے۔ جب کسی ریل کو روکنا مقصود ہوتا، تو سرخ شیشہ استعمال کرتے۔ عام حالت میں سفید شیشہ ہی چراغ کے سامنے روشنی فراہم کرنے کے لیے نصب رہتا۔

انھوں نے پاکستان ریلوے میں ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کو بطور کانٹے والا ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۸ء میں لاہور اسٹیشن سے (فائل کے باعث) ریٹائرمنٹ لے لی۔ لیکن اس دوران کوئی ایک تنخواہ بھی انھیں پوری نہیں ملی۔ ریلوے کیشئر ہر ماہ کی تنخواہ سے کچھ نہ کچھ رقم خود ہی کاٹ لیا کرتا۔ والد صاحب سمیت ریلوے کے سبھی چھوٹے ملازم صبر شکر کرکے خاموش ہوجاتے۔

سال میں ایک بار وہ آنکھوں کا طبی معائنہ کرانے لاہور جاتے۔ جتنی راتیں انھیں لاہور میں رکنا پڑتا، میں رات کو خود سوتا اور نہ ہی کسی اور کو سونے دیتا۔ مجھے والد کے بغیر نیند ہی نہیں آتی تھی۔ لاہور سے آنے والی ہر ریل دیکھنے کے لیے دوڑتا ہوا یہ تصور کرا سٹیشن پہنچ جاتا کہ

www.pdfbooksfree.pk

شاید وہ واپس آ گئے۔ لیکن جب گاڑی گزر جاتی تو منہ بسورتا گھر چلا آتا۔

والد سے والہانہ محبت کا اظہار دوران تعلیمی دور بھی عروج پر رہا۔ کچی، پکی، پہلی اور دوسری جماعت کا جب امتحان ہوا، تو والد اسکول کی کچی دیوار کے اس پار اس وقت تک کھڑے رہتے جب ماسٹر مجھ سے سوال پوچھتا۔ میں سوال سن کے والد کے چہرے کو پیار بھری نگاہ سے دیکھتا۔ پھر نہ جانے کہاں سے بالکل صحیح جواب میری زبان پر آجاتا۔ اس طرح میں ابتدائی تین مرحلے تو عبور کر گیا لیکن تیسری جماعت کے امتحان کا دن آیا، تو والد صاحب ڈیوٹی کی وجہ سے میرے ساتھ سکول نہ جا سکے۔ نتیجتاً میں فیل ہو گیا۔ نتیجہ سننے کے بعد جب میں منہ لٹکائے گھر پہنچا، تو والد نے پوچھا ''میرا شہزادہ پاس ہو گیا ہے نا؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ''ابا جی میں فیل ہو گیا ہوں۔''

یہ سنتے ہی والد صاحب کا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور وہ غصے میں دھاڑنے لگے۔ انھیں غصے میں بولتے سن کر ماں بھی صحن سے دوڑی چلی آئی کہ کیا آفت آ گئی۔ پہلے تو والد صاحب نے مجھے ایک طمانچہ مارا پھر بازو سے پکڑ کر اسکول پہنچ گئے اور ہیڈ ماسٹر ابراہیم صاحب سے کہا ''میرا بیٹا فیل نہیں ہو سکتا، اس کا دوبارہ امتحان لیا جائے۔''

کلاس ٹیچر ہیڈ ماسٹر کی ہدایت پر سب کے سامنے مجھ سے سوالات کرنے لگا۔ میں سوال سن کر اپنے والد کا چہرہ دیکھتا پھر جواب دے دیتا۔ ماسٹر صاحب نے جتنے سوال پوچھے، میں نے ان کے بالکل صحیح جواب دیے۔ یوں میں تیسری جماعت کا امتحان پاس کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ مجھے اس لمحے ہیڈ ماسٹر کی بات اب تک یاد ہے ''میں اس بچے کی نفسیات نہیں سمجھ سکا۔ یہ اپنے والد سے اتنا پیار کرتا ہے کہ اس کے بغیر اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ جب والد سامنے ہو، تو سب کچھ یاد آجاتا ہے۔ یہ والد کے بغیر زندگی کیسے گزارے گا؟''

آج جب والد صاحب کو فوت ہوئے بیس سال بیت چکے، شاید ہی کوئی رات ایسی ہو، خواب کی حالت میں وہ مجھے نہ ملتے ہوں۔ میں آنکھیں بند کروں، تو اس دنیا پہنچ جاتا ہوں جہاں میرے والدین موجود ہیں۔ بیدار ہوں، تو اس دنیا میں واپس آجاتا ہوں جہاں بیوی بچے بستے ہیں۔ مجھے خواب میں بھی وہ ریلوے اسٹیشن کے اردگرد اور ریل پر ڈیوٹی انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کسی ٹرین کو شنٹنگ کر رہے ہیں، کبھی کیبن پر لیور کھینچ کر تیز گام کے سگنل ڈاؤن کر رہے ہیں، تو کبھی پلیٹ فارم پر سیاہ رنگ کی وردی پہن کر چہل قدمی کرتے ہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہو چکے لیکن ان کی روح ریلوے اسٹیشن کے اردگرد ہی گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ان کی ریلوے سے والہانہ محبت کا کھلا اظہار ہے۔

اس لمحے مجھے ایف اے انگلش کی کتاب میں شامل ایک کہانی یاد آ گئی جو ایک انگریز اسٹیم انجن ڈرائیور کے گرد گھومتی ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ ریلوے کا ایک ڈرائیور ریٹائر ہوا۔ حسن اتفاق سے اس کے انجن کو بھی ناقابل استعمال قرار دے کر عجائب گھر کھڑا کر دیا گیا۔ ریٹائر ہونے کے باوجود اس ڈرائیور کا یہ معمول تھا کہ ہر صبح وردی پہن عجائب گھر پہنچتا اور وہاں آنے والے لوگوں کو انجن کے بارے میں بتاتا۔ جب یہ کام کرتا تھک جاتا، تو گھر واپس آجاتا۔

ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ پہلے کی طرح جوان اپنے انجن پر سوار گاڑی کو سبز کھیت کھلیانوں کے درمیان سے سیٹی بجاتا گزر رہا ہے۔ وہ اس لمحے بہت

www.pdfbooksfree.pk

خوش تھا۔ جب بیدار ہوا، تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوش و خرم اور چاق چوبند تھا۔ بیٹی کے ہاتھ کا بنایا ناشتا کر کے وہ عجائب گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بیٹی نے اتنی جلد جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا "آج رات میں نے ایک خواب دیکھا جس میں پہلے کی طرح اپنا انجن چلاتے گاڑی کو بھگائے جا رہا ہوں۔ میرا انجن بھی جوان ہے اور میں بھی۔ پتا نہیں کیوں آج مجھے اپنے انجن کی یاد بہت ستا رہی ہے اور میں عجائب گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔

وہ انتہائی جذباتی انداز میں اپنی منزل پر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہاں بہت سارے لوگ اردگرد کھڑے تجسس کی نگاہ سے انجن کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ قہقہے مارتا انجن پر سوار ہوتا اور لوگوں کو اس کے متعلق قصے سنانے لگتا ہے۔ اسی اثنا میں عجائب گھر کا نیا گارڈ وہاں پہنچ کر اسے انجن سے نیچے اترنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ گارڈ کو بتاتا ہے کہ میں ہی اس انجن کا ڈرائیور رہا ہوں۔ میں نے ساری زندگی اس انجن کے ساتھ گزاری ہے۔ براہ کرم مجھے نیچے نہ اتارا جائے۔ میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میری اور میں اس کی زندگی ہوں۔

لاہور اسٹیشن کی قدیم تصویر

ڈرائیور کی باتوں کا نئے گارڈ پر کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ بازو سے پکڑ کر ڈرائیور کو نیچے اتار دیتا ہے۔ ایک تو انجن سے جدائی اور دوسرا لوگوں کے سامنے بے عزتی کا غم اسے گھیر لیتا ہے۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا اپنے گھر پہنچتا ہے۔ بیٹی جلد واپسی پر استفسار کرتی ہے۔ لیکن وہ بیٹی سے بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ دوپہر کو جب کھانے کے لیے اسے بیدار کرنے بیٹی کمرے میں پہنچی، تو وہ اُسے مردہ حالت میں ملا۔

آخر میں لکھاری لکھتا ہے کہ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرے، اس سے جدائی برداشت نہیں کرتا۔ جدائی موت کا دوسرا نام ہے۔ کچھ یہی عالم میرے والد کا بھی ہے۔ دنیا سے رخصت ہونے کے باوجود وہ مجھے ریلوے اسٹیشن کے اردگرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ان کی ریلوے سے محبت کا انوکھا اور انمٹ نقش ہے۔

اسی طرح ایک ڈراما پاکستان ٹیلی ویژن پر کچھ عرصہ پہلے دکھایا۔ ایک گارڈ ریٹائر ہونے کے باوجود اپنی وردی پہن ریلوے لائن کے قریب سبز اور سرخ جھنڈی لیے صبح سے بیٹھ جاتا۔ شام تک جتنی بھی گاڑیاں وہاں سے گزرتی، وہ ان کو پورے پروٹوکول کے ساتھ سبز جھنڈی دکھا کر اپنے قلبی سکون کا اظہار کرتا۔ جب تھک جاتا، تو گھر واپس آ کر اپنی جوانی کے قصے لوگوں کو سناتا جو دوران ملازمت پیش آتے رہے۔

بات کچھ لمبی ہو گئی۔ میرے والد ہی نہیں ان کی اولاد کے خون میں بھی ریلوے کی محبت رچی بسی ہے۔ ہمارے خاندان کے جتنے بھی گھرانے ہیں، وہ ریلوے لائن کے نزدیک ہی آباد ہیں تاکہ چلتی گاڑی کی مدھر آواز اور انجن کی سیٹی کانوں میں رس گھول سکے۔ ہمیں دنیا جہان کے کانوں سے زیادہ اچھی آواز چلتی گاڑی اور انجن کی لگتی ہے۔ چلتی گاڑی جب کانٹے بدلے، تو اس وقت جو دھم

www.pdfbooksfree.pk

پیدا ہو، وہی ہماری محبوب ترین آواز کہلاتی ہے۔

بہرکیف اے ٹی او، ملک قمر الحق کو سامنے پا کر طبیعت خوش ہوگئی۔ یقیناً میرے والد کی روح بھی پُرمسرت ہوگی۔ ریلوے کا وہ افسر جس کے صرف گزرنے سے ریلوے ملازمین کے سانس رک جاتے تھے، وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہمارے درمیان اس لیے موجود تھا کہ میں اس سے بڑے افسر کا مہمان تھا۔ آج اس کا جاہ وجلال ختم ہو چکا تھا اور وہ ایک عام انسان کی طرح ہم سے بات بھی کر رہا تھا۔ قدرت کا یہ ہم پر بہت بڑا احسان تھا۔

عبدالحمید رازی افسر کے بجائے ہر دلعزیز انسان دکھائی دیے۔ ان کی شخصیت اور تربیت کے پیچھے عظیم ماں اور باپ کا ہاتھ ہے۔ بے شک اچھے اور بااخلاق انسان ایسے پھول کی طرح ہوتے ہیں جس کی خوشبو کسی دائرے کی محتاج نہیں ہوتی۔ مجھے زندگی میں چار شخصیات عظیم نظر آئیں ایک ڈاکٹر محمد عارف جو سیکرٹری خزانہ حکومت پنجاب رہے۔ دوسرے جاوید احمد قریشی (سابق چیف سیکرٹری پنجاب)، تیسرے جاوید محمود (سابق چیف سیکرٹری پنجاب) اور موجودہ صوبائی محتسب اعلیٰ) اور اب رازی صاحب کو بھی ایسے عظیم لوگوں میں شمار کرتا ہوں جن سے ملنے والا کوئی شخص اُن کی شخصیت کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اسی اثنا میں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک افسر ڈی ایس آفس میں داخل ہوا اور رازی صاحب کو سیلوٹ مار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ غالباً ریلوے پولیس کا کوئی افسر تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ریلوے پولیس کے تمام کارنامے یاد آگئے جو وہ اکثر و بیشتر انجام دیتی ہے۔ وہ ریلوے کا تحفظ کم، چوری کی افزائش زیادہ کرتی ہے۔ کراچی سے پشاور تک ریلوے کی زمین پر جتنی بھی کچی آبادیاں قائم ہیں، وہ ریلوے پولیس کی ''مہربانی'' کا نتیجہ ہیں۔ ان کی مٹھی گرم کرکے جہاں چاہو قبضہ پالو۔ بلکہ ریلوے پھاٹک اور اسٹیشن کے اردگرد جتنے بھی خوانچہ فروش موجود ہیں، وہ روزانہ ریلوے پولیس کو بھتا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اہلکار پیسے لے کر بغیر ٹکٹ مسافروں کو اپنے ڈبے میں بٹھانے سے گریز نہیں کرتے۔

جب گاڑی چلے، تو کچھ مسافروں کی ٹکٹوں کے پیسے گارڈ جیب میں ڈال لیتا ہے، تو کچھ ایس ٹی اپنی جیب میں؛ پھر پولیس والے کہاں پیچھے رہنے والے ہیں؟ گویا پاکستان میں ریلوے کا نظام تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا، تو اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ریلوے پولیس کا ہے۔ عرف عام میں ریلوے پولیس کو چوروں کی نانی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ چیز جو کسی اور جگہ میسر نہ ہو، وہ ریلوے پولیس کے ملازمین کے گھروں میں بآسانی مل جاتی ہے۔ ریل کے ذریعے آنے والی لکڑی، مٹی کا تیل، مچھلی، دودھ، چینی یا ڈیزل، وہ پہلے ریلوے پولیس کے ملازمین کے گھر پہنچتا ہے، پھر بچا کھچا منزل مقصود پر! جنھیں رکھوالی کے لیے ملازم رکھا جائے جب وہی چوری کرنے لگیں، تو وہ کون سا ادارہ ہے جو اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے؟ ریلوے کا محکمہ اس لوٹ مار کی بہترین مثال ہے۔

دوران گفتگو میں نے رازی صاحب سے درخواست کی کہ بے شک آپ بہت اچھے افسر اور اعلیٰ انسان ہیں۔ اپنے ملازمین کے لیے اچھا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن انجنوں اور ڈبوں کی بوسیدگی، ماتحت ملازمین کے مسائل اور کارکردگی جاننے کے لیے آپ کو بغیر کسی پروٹوکول کے ہر چھوٹے بڑے ریلوے اسٹیشن کا اچانک دورہ ضرور کرنا چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ مسائل کا ازالہ ہو سکے۔ کسی نہ کسی شکل میں ریل گاڑیاں چل تو رہی ہیں لیکن انھیں چلانے والوں کے حالات اور مسائل سے آگاہی آپ کے کارناموں میں مزید نکھار پیدا کرسکتی ہے۔ پھر یہ عمل رب

www.pdfbooksfree.pk

کائنات کی نظر میں بھی نیکیوں میں اضافے کا باعث بنے گا۔ انھوں نے میری بات توجہ سے سننے کے بعد فرمایا ''ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا'' جب واپس آئیں گے تو یقیناً اپنے سارے وعدے بھول چکے ہوں گے۔

رازی صاحب نے پھر اے ٹی او کو حکم دیا کہ وہ ہمیں ساتھ لے جاکر کنٹرولر آفس دکھائیں۔ وہ ہمارے ساتھ پیدل چلتے ہوئے کنٹرولر آفس کی جانب گامزن ہوئے۔ کسی نے ہوٹر بجایا نہ کسی نے رک کر سلام کیا۔ کنٹرولر آفس میں داخل ہوتے ہی بڑی میز پر بیٹھے ایک مصروف شخص سے ہمارا تعارف کروایا۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے ملے، لیکن ان کا دماغ ریلوے لائنوں پر دوڑتی ریلوں کے تعاقب میں مصروف تھا۔ میں نے سوچا، یقیناً یہی وہ خوفناک شخص ہے جسے ریلوے کی زبان میں کنٹرولر کہا جاتا ہے۔ اور جو پورے لاہور ڈویژن کی گاڑیوں کی نقل و حرکت کو اپنی ذہانت سے کنٹرول کرتے ہیں۔

پھر ہم لاہور تا فیصل آباد سیکشن کا ٹریفک کنٹرول کرنے والے کمرے میں پہنچے۔ وہاں ایک نوجوان سامنے لگے نقشے کو مسلسل گھور رہا تھا۔ ایک ڈایاگرام نما لکیروں والا کاغذ اس کے سامنے تھا۔ جیسے ہی ریل ایک سے دوسرے اسٹیشن پہنچتی، وہ اپنے ڈایاگرام میں لکیر کھینچ دیتا۔ پھر ہمیں لاہور تا ساہیوال سیکشن والے روم میں لے جایا گیا۔ وہاں بھی ایک مستعد نوجوان بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے سامنے بھی ہر بڑے اسٹیشن کی تمام لائنوں کو ظاہر کرنے والی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔ میرے سوال پر اے ٹی او نے بتایا کہ نہ صرف تمام آنے جانے والی ریلوں کی نقل و حرکت یہاں سے کنٹرول ہوتی ہے بلکہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کون سی ریل کس پٹڑی پر کھڑی کرنی ہے اور کس سے گزاری جائے۔

یہاں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ عام طور پر درمیانے درجے کے اسٹیشن پر دونوں جانب بنے پلیٹ فارم کے درمیان چار لائنیں ہوتی ہیں۔ پلیٹ فارم کے ساتھ والی لائنوں کو لوپ لائن کہا جاتا ہے۔ دوسری مین لائن کہلاتی ہے۔ جن ریلوں کو اسٹیشن پر رکنا ہو، انھیں پلیٹ فارم کے ساتھ والی لائن پر لایا جاتا ہے۔ ایکسپریس ٹرینوں کو درمیانی لائنوں سے گزارا جاتا ہے۔

کنٹرولر کے دفتر کا دورہ کرتے ہوئے مجھے خانہ کعبہ کا غلاف لے جانے والی ایکسپریس ریل روکنے کا واقعہ یاد آ گیا۔ اس کے رکنے پر کنٹرولر حبیب آباد اسٹیشن کے تمام عملے پر برسا تھا، شاید اب بھی کسی ایکسپریس ریل کو بغیر اسٹاپ روکنے پر کنٹرولر کا یہی رویہ ہوتا ہوگا۔ یہ پتا نہیں چلا کہ بڑی سی میز پر بیٹھا افسر (شاید کنٹرولر) برستا ہے یا چھوٹے کمروں میں بیٹھنے والے افسر ریلوے ملازمین پر غصہ اتارتے ہیں۔ گو حضرت عزرائیل علیہ السلام روزانہ لاکھوں انسانوں کی بیک وقت روح قبض کرتے ہیں لیکن اس کام میں لاکھوں فرشتے بھی ان کی معاونت کرتے ہیں۔ شاید اسی طرح کنٹرولر آفس میں بھی کنٹرولر تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس کے معاون بے شمار ہیں۔ وہ ہر ریلوے اسٹیشن کے عملے بطور خاص اے ایس ایم پر روزانہ گولہ باری کرتے ہوں گے۔

آخر وہ دورہ اختتام پذیر ہوا جس کی خوشگوار یادیں ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہیں گی۔ والد مرحوم سے ملاقات تو روزانہ خواب میں ہوتی ہے، لیکن مجھے یقین ہے، کسی رات خواب میں ڈی ایس آفس دورے کے حوالے سے بات ہوئی، تو والد یقیناً بہت خوش ہوں گے۔ وہ کام جو خود نہیں کر سکے، اسے ان کے بیٹے نے سے انجام دے دیا۔ پھر دل سے یہی آہ نکلتی ہے کہ کاش یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے والد زندہ ہوتے تو میری اس کامیابی پر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

جیسے ہی اسٹاپ پر رکی۔ میں نے نیچے اترنا چاہا، تو میرے پہلو میں بیٹھے ایک نابینا بزرگ نے میری کلائی پکڑ لی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سوزوکی سے اترنے میں میرا سہارا چاہتا ہے۔ میں نے کندھوں سے پکڑ کر اسے اترنے میں مدد دی۔ بزرگ جب اتر چکا، تو بھی میری کلائی پر اس کی گرفت بدستور قائم رہی۔

''بزرگ! آپ سوزوکی سے باخیریت نیچے اتر چکے ہیں۔'' میں نے اسے یاد دہانی کرائی۔

''مجھے اگلے چوک تک پہنچا دو۔'' بزرگ نے فرمائش کی۔

''مگر بزرگ! مجھے اس طرف نہیں جانا۔'' میں ہرگز پیچھا چھڑانا نہیں چاہتا تھا بلکہ حقیقتاً مجھے مخالف سمت جانا تھا۔ کچھ ہی دور میرا دفتر تھا۔ اگر میں چوک کی طرف جاتا، تو مجھے لمبا چکر کاٹ کر دفتر پہنچنا پڑتا۔ یہ جانچتے ہوئے میں نے بزرگ سے پیچھا چھڑانا چاہا، مگر وہ کمبل کی طرح میرے گلے پڑ گیا۔

''جب صف میں کھڑے ہو چکو، تو امام کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔'' کلائی پر بزرگ کی گرفت بنوز برقرار تھی۔ مجھے ناچار اس کے ساتھ چلنا پڑا۔ بزرگ نابینا ضرور تھا مگر اس کی ظاہری حالت کافی بہتر تھی۔ صاف ستھرا لباس، بینائی سے محروم آنکھوں پر سیاہ چشمہ۔ ہاتھوں

سوزوکی

دنیا میں یکتا و نرالا

دیکھنے والا نابینا

ایک بزرگ کا یادگار قصہ، وہ معذوری کے باوجود بھکاری بننے کو تیار نہ تھا

تنویر اقبال واگھورہ

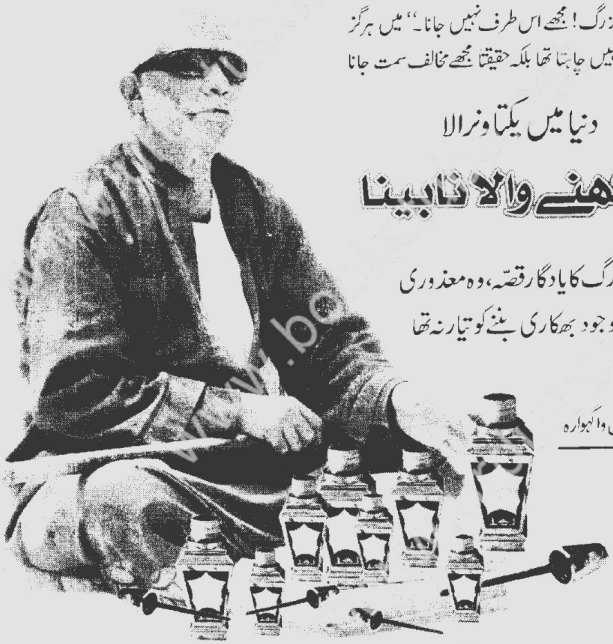

www.pdfbooksfree.pk

میں چھڑی، بغل میں لٹکتا سیاہ رنگ کا صاف ستھرا تھیلا...... ویسے تو ایسے نابینا بھیک مانگتے نظر آتے ہیں مگر وہ بزرگ مجھے کسی بھی طرح بھکاری نہ لگا۔

لیکن اس نے مجھے جس چوک پر پہنچانے کا کہا، وہاں اکثر بھکاری ہی بیٹھے نظر آتے کہ کافی ہجوم ہوتا تھا۔ باقی جگہوں کی نسبت وہاں کے بھکاری خاصی بھیک بٹور لیتے تھے۔ بزرگ نے میری کلائی پکڑ رکھی تھی۔ میں طوعاً کرہاً اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ حالانکہ میں تیز چل کر جلد چوک پر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس نیکی سے جان چھوٹے۔ میں اندر ہی اندر یہ سوچ کر کڑھنے لگا کہ بزرگ کو کیا مجبوری ہے جو اس عمر میں بھی گھر میں ٹک نہیں پایا...... اوپر سے گرمی بھی بلا کی تھی۔ ویسے تو ابھی صبح کے نو بجے تھے مگر ان دنوں سورج صبح ہی سے سوا نیزے پر محسوس ہوتا۔ میں بزرگ کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا۔ اب گلے پڑے ڈھول کو بجانا، تو تھا۔

''بزرگ! آپ نے کدھر جانا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اس چوک تک ہی جانا ہے...... وہیں بیٹھتا ہوں۔'' بزرگ نے کہا۔

''تو کیا آپ وہاں بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں'' میں نے پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے بزرگ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ بولا ''اللہ نہ کرے کبھی مجھے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑیں۔ آنکھیں نہ سہی ہاتھ پاؤں تو سلامت ہیں۔''

میں شرمندہ ہو گیا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا اور ویسے بھی بزرگ کسی طرح سے بھکاری نہیں لگتا تھا مگر چوک پر جانے کا مقصد کیا ہے؟

''معاف کرنا بزرگ!'' میں نے معذرت چاہی ''لیکن آپ چوک میں بیٹھ کر کیا کرتے ہیں؟''

''سرمہ اور سرمہ سلائی بیچتا ہوں'' بزرگ نے کہا۔ میں تعجب سے اس کی بغل میں لٹکتے تھیلے کو دیکھنے لگا جس میں یقیناً سرمہ اور سرمہ سلائیاں (سرچو) ہوں گے۔

''یقیناً تم حیران ہو گے کہ نابینا اور سرمے کا کاروبار...... لیکن واقعی میں سرمہ بیچتا ہوں۔ میں خود پیدائشی نابینا ہوں۔ میرے پاس بینائی نہیں لیکن جن کے پاس یہ نعمت ہے، انھیں اس کی حفاظت کا درس دے رہا ہوں کیونکہ کسی چیز کی قدر و قیمت کا انسان کو تبھی پتا چلتا ہے جب وہ اسے کھو بیٹھتا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

''لیکن بزرگ، کوئی آپ کو پیسوں کے معاملے میں دھوکا بھی تو دے سکتا ہے۔ آپ دیکھ تو پاتے نہیں۔''

بزرگ مسکرایا......

''اور بولا مانا کہ میں نابینا ہوں مگر میں وہ کچھ بھی دیکھ لیتا ہوں جو تم آنکھوں والے نہیں دیکھ پاتے...... اور جو کچھ تم لوگ دیکھ سکتے ہو، وہ میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔''

بزرگ کے کہنے پر میں متعجب ہوا ''آپ کیا دیکھ لیتے ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ایسا ہی ہے...... دیکھو تم میرے ساتھ چلنے پر اندر ہی اندر کڑھ رہے ہو۔ ممکن ہے مجھے برا بھلا بھی کہتے ہو'' بزرگ نے کہا، تو لاشعوری طور پر میری گردن شرمساری سے جھک گئی۔ وہ کہنے لگا ''آج کی نسل اچھائی سے دور بھاگتی ہے۔ جبکہ وہ زمانہ تھا جب لوگ رضاکار ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔''

''معاف کیجیے گا بزرگ، آپ نے میرے بارے ٹھیک ہی کہا۔ چونکہ آپ پہلے ہی بتا چکے کہ وہ بھی دیکھ لیتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ پاتے۔ اس لیے یہ تو نہیں

www.pdfbooksfree.pk

پوچھوں گا کہ میری حالت کا آپ کو کیسے پتا چلا......؟ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے مزید شرمندہ نہ کیجیے۔'' میں نے کہا۔

بزرگ ہنس دیا اور کہنے لگا ''کاش لوگ اپنے کیے پہ شرمندہ ہوں، مگر ایسا ہوتا نہیں۔ کوئی چاہے غلط کاری ہی کیوں نہ کر آئے، سمجھتا یہی ہے کہ اس نے جو کیا، ٹھیک ہی کیا۔ بلاوجہ خود پر گھمنڈ رکھتا ہے۔''

ہم بظاہر چل مگر حقیقتاً رینگ رہے تھے۔ اوپر سے سورج آگ اگل رہا تھا۔ ایسی سست رفتار میں دھوپ اور بھی تیز لگ رہی تھی ''بزرگ اس عمر اور ایسی حالت میں بھی آپ محنت کرتے ہو۔ کیا آپ کی کوئی اولاد ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''الحمدللہ دو بیٹیاں ہیں۔ مگر کما کر کھلانے کے لیے بیٹا نہیں ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے بیٹا دینا مناسب نہیں سمجھا۔'' بزرگ نے بتایا۔

''تو کیا سرمہ بیچنے سے آپ کے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سارا نظام، تو اوپر والی ذات پاک ہی چلاتی ہے۔ رزق حلال میں برکت وہی ذات ڈالتی ہے۔ کبھی کبھی فاقہ کشی کرنا پڑے، تو برائی نہیں...... ایک مسلمان کی یہی پہچان ہے کہ جب تک جسم مشقت کرنے میں ساتھ دیتا رہے، اسے حلال کی روزی کمانی چاہیے۔ جب اس قابل نہ رہے، تو زکوٰۃ اور فطرانہ لینے میں کچھ حرج نہیں۔ مگر یہ نہیں کہ تندرست اور صحیح سلامت ہونے کے باوجود بھیک مانگتا پھرے۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور جب تک جسم نے ساتھ دیا، ان شاء اللہ محنت مزدوری سے رزق حلال کمانے کی کوشش کروں گا۔ بس اللہ تبارک تعالیٰ اپنی ذات پاک کے سوا کسی کا محتاج نہ کرے۔''

میں نے دل میں بزرگ کو خراج تحسین پیش کیا اور پھر بولا ''بقول آپ کے جو کچھ ہم دیکھ سکتے ہیں، وہ آپ دیکھنا نہیں چاہتے، یہ بات میرے پلے نہیں پڑی۔''

میں نے کلبلاتا سوال کیا، تو وہ مسکرا دیا اور بولا ''پڑھے لکھے لگتے ہو مگر اتنی موٹی بات نہیں سمجھ سکے۔''

''آپ وضاحت کر دیجیے۔''

''تم بینا لوگ یہ سب بے حیائی، قتل و غارت، لوٹ مار، بربریت جو دیکھ رہے ہو، خدا مجھے کبھی نہ دکھائے۔'' بزرگ کہنے لگا ''خدا نے مجھے بینائی نہ دے کر اچھا ہی کیا ورنہ میں بھی تم لوگوں میں شامل ہو کر خوامخواہ گنہگار ٹھہرتا۔''

''وہ کیسے...... میں سمجھا نہیں؟'' میں متعجب ہوا۔

''جانتے ہو گناہ دیکھ کر بھی جو اسے نہ روکے، وہ بھی گناہ میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ اگر میری بینائی ہوتی، تو میں بھی تمہاری صف میں شامل ہوتا۔ تمہاری سیہ روشنی سے میرے روشن اندھیرے کہیں بہتر ہیں۔'' بزرگ نے کہا۔

خدا خدا کر کے ہم منزلِ مقصود پر جا پہنچے۔ میں نے بزرگ کو آگاہ کیا ''ہم چوک پر پہنچ چکے...... بتایئے آپ کو کہاں بیٹھنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی سائے میں بٹھا دیجیے، مگر ان بھکاریوں سے ذرا دور ہی بٹھانا۔''

میں اسے ایک سایہ دار جگہ کی طرف لے گیا۔ کچھ دور بھکاری بھیک مانگ رہے تھے: ''اللہ کے نام پہ دیدے بابا...... مولا خوش رکھے...... جگ جگ جیئے...... محتاج کو دے جا، مولا تجھے دے گا...... کوئی اللہ دے ناں تے دیوے گا۔''

میں نے دیکھا ان بھکاریوں میں کچھ تو لنگڑے اور نابینا تھے یا اداکاری کر رہے تھے۔ کچھ ہٹے کٹے جھوٹ موٹ ہاتھ پاؤں مروڑے لولے لنگڑے بنے بیٹھے تھے۔ ان کی دردبھری صداؤں پر کچھ لوگ جن کے دل پسیج جاتے،

www.pdfbooksfree.pk

وہ نوٹ اور سکے ان کی جھولی یا کشکول میں ڈال دیتے۔

بزرگ نے تھیلا زمین پہ رکھا۔ اندر سے تہ شدہ ایک چادر نکالی اور نیچے بچھا کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا "جن بھکاریوں کی آوازیں تم سن رہے ہو، یقیناً انھیں تم دیکھ بھی سکتے ہو۔"

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ اور کچھ تو کافی بنے کٹے ہیں۔ پھر بھی بھیک مانگ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہی تو میں نہیں دیکھنا چاہتا۔" بزرگ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا "میری حتی الامکان کوشش ہے کہ ان سے دور ہی بیٹھوں ورنہ مجھے بھی بھکاری سمجھ کر کوئی بھیک نہ دے ڈالے۔" بزرگ نے کہا۔

اس نے پھر تھیلے سے بیس ضرب بیس انچ کا اسٹینڈ بورڈ نکال لیا جس پر سرخ حروف میں لکھا تھا: خدا تعالیٰ کی طرف سے عنایت کردہ نعمت "آنکھ" کی حفاظت کیجیے۔"

نیچے سیاہ عبارت درج تھی "حافظ والا سرمہ۔ فی ڈبی مع سرمچو قیمت ۲۰ روپے۔"

میں نے پڑھا، تو پوچھا "بزرگ آپ حافظ ہیں؟"

"اللہ کی دین ہے...... اپنی بیٹیوں کو بھی قرآن پاک حفظ کرایا ہے۔" یہ کہہ کر بزرگ تھیلے سے باقی سامان نکالنے لگا۔

"اچھا بزرگ اب میں چلوں گا...... دعا کرنا۔"

میں مڑنے لگا تو بزرگ نے کہا "ٹھہرو۔"

میں ٹھہر گیا۔ بزرگ نے ایک ڈبی سرمہ مع سرمچو نکال کر میری طرف بڑھائی اور بولا "تم نے میری مدد کی ہے۔ یہ میری طرف سے تحفہ رکھ لو۔ ویسے میں کسی کا احسان رکھتا، تو نہیں لیکن اس وقت تمھارا اتار بھی نہیں سکتا۔ اگر خدا نے موقع دیا، تو ضرور اس بوجھ سے چھٹکارا چاہوں گا...... لو رکھ لو...... خدا تعالیٰ کی طرف سے عنایت کردہ نعمت کا شکر اسی صورت بجالاتے ہیں جب بندہ اس نعمت کی حفاظت کرے۔"

بزرگ کے کہنے پر میں نے سرمہ مع سرمچو لے کر اس کا شکریہ ادا کیا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

میں دیر تک اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس مختصر سی ملاقات میں وہ کیا پیغام دے گیا تھا، آپ بھی پوچھیے گا۔

احساسِ ذمے داری

ایک بدو امیر المومنین حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ مانگا۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا: "میرے گھر میں آج کی روٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔"

بدو مایوس ہو کر چلا گیا۔ وہ بلند آواز سے کہتا جا رہا تھا: "بخدا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ آپؓ سے میرے متعلق باز پرس کرے گا۔"

اس پر امیر المومنینؓ رو پڑے اور اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ پھر بدو کو بلایا اور اپنے غلام کو آواز دی: "قنبر! میری زرہ لے آؤ۔"

قنبر اٹھا لایا۔ امیر المومنینؓ نے زرہ بدو کو دیتے ہوئے کہا "دیکھو تمھیں کوئی ٹھگ نہ لے۔ یہ بڑی قیمتی زرہ ہے۔ اس سے میں نے رسول اللہﷺ کے چہرۂ مبارک پر اُمڈتی ہوئی پریشانیوں کو بارہا دور کیا ہے۔"

"امیر المومنین، بدو کے لیے بیس درہم کافی تھے۔" قنبر نے عرض کیا۔

"قنبر! اگر یہ دنیا میرے لیے سونا اور چاندی بن جائے اور میں سب کی سب اس شخص کو دے دوں، تب بھی مجھے کوئی کوفت نہ ہوگی۔

اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس شخص کے بارے میں جو میرے سامنے کھڑا ہے، باز پرس کی، تو میں کیا جواب دوں گا۔"

(حکمران صحابہؓ، انتخاب: آمنہ رمضان، عارف والا)

www.pdfbooksfree.pk

وطن عزیز کے دلکش سیاحتی مقامات

کھیوڑہ سے کلرکہار تک

کوہستان نمک کی تاریخی و تہذیبی جھلکیاں دکھاتا ایک دلچسپ سفرنامہ

پروفیسر اسد سلیم شیخ

ہماری گاڑی پنڈ دادنخاں شہر چھوڑتے ہوئے کھیوڑہ کی طرف رواں دواں تھی۔ راستے میں گورنمنٹ البیرونی کالج، پنڈ دادنخاں بھی گزرا۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آ گیا کہ اسی علاقے کے ایک امیدوار سے پبلک سروس کمیشن کی انٹرویو کمیٹی نے سوال کیا ''یہاں کے کالج کا نام ''البیرونی'' کیوں ہے؟

اس نے جواب دیا ''یہ کالج شہر سے کافی باہر واقع ہے، اسی لیے۔''

سچ یہ ہے کہ البیرونی نے اس علاقے میں قیام کیا تھا۔ اس نے ایسی جگہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''کتاب الہند'' کے کچھ حصے تحریر کیے اور زمین کا قطر بھی معلوم کیا۔ البیرونی کی بابت سوچتے ہوئے ہم کھیوڑہ کان پہنچ گئے۔ ٹکٹ گھر ایک پرانی بنگلہ نما عمارت میں قائم تھا۔ پتھریلے اونچے نیچے راستوں سے ہو کر براہ مرکزی دروازہ کان کے اندر داخل ہوئے۔

ہاتھوں میں بیٹری لائٹس اٹھائے اور سر پر ہیلمٹ پہن کر ایسے لگا، چاند کے سفر پر روانہ ہونے والے ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

کان کے اندر داخل ہوتے ہی احساس ہوا، گہری اندھیری غار میں داخل ہو چکے۔ اندر کا درجہ حرارت باہر سے قدرے کم تھا۔ایک چھوٹی سی ٹرام گاڑی ہمیں کان کے اندرونی حصوں کی سیر کرانے تیار کھڑی تھی۔ پہلے کان سے نمک باہر لانے کے لیے کوئلے سے چلنے والے انجن چلتے تھے۔ان کے دھوئیں سے کان کی اندرونی چھت اور در و دیوار سیاہ ہو چکے تھے۔ویسے بھی اندر اندھیرا گھپ تھا مگر ٹرام کی بتی نے اسے کچھ کم کر دیا۔

ایک خطرناک موڑ آیا، تو ہم دبک کر بیٹھ گئے۔ مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گاڑی کان کے اندر چاندنی چوک پر جا رکی۔ وہاں راہبر نے ہمیں ایک دائرے میں کھڑا کیا اور خود ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر کان کی تاریخ بتانے لگا۔

کھیوڑہ میں نمک کی یہ کانیں بہ لحاظ رقبے اور ذخائر دنیا میں سب سے بڑی اور نمک کی برآمد میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ یہاں سے سکندر اعظم کی ہندوستان آمد سے بھی پہلے نمک نکالا جا رہا ہے۔ ابن بطوطہ نے بھی اس کا ذکر کیا۔ جب سکندر اعظم کی فوجیں اس علاقے میں آئیں، تو ان کے گھوڑے پہاڑ چاٹنے لگے۔تبھی یونانیوں کو یہاں نمک کی موجودگی کا پتا چلا۔ پہلی بار باقاعدہ طور پر کھیوڑہ سے نمک سکندر اعظم کے عہد میں نکالا گیا۔

کہا جاتا ہے، ایک مقامی شخص ''اسپ خان'' نے اکبر کو یہاں نمک کی موجودگی کی اطلاع اس شرط پر دی کہ وہ جب تک زندہ رہا، اسے کان کنوں کی مجموعی اجرت کے برابر رقم بطور انعام دی جائے گی۔

جدید سائنسی بنیادوں پر کان سے نمک کا حصول انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں شروع ہوا۔ ذخائر تک پہنچنے کے لیے مرکزی سرنگ کھودنے کا سہرا والٹر ریتھ نامی انگریز کے سر ہے جس نے ۱۸۷۲ء میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ یہ کانیں اب محض صنعتی اہمیت ہی نہیں رکھتیں بلکہ ہر سال ہزاروں افراد بہت شوق سے یہ نجوبہ دیکھنے آتے ہیں۔ کان کے باہر چہار سو جپسم کے پہاڑ ہیں جس سے سیمنٹ تیار ہوتا ہے۔

صاحب تحریر

پروفیسر اسد سلیم شیخ کا تعلق وسطی پنجاب کے قصبے پنڈی بھٹیاں سے ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کر کے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کی ڈگری پائی۔ شعبہ درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج پنڈی بھٹیاں میں بطور وائس پرنسپل تعینات ہیں۔قومی اخبارات میں مضامین اور کالم نگاری کرتے ہیں۔ رائٹرز گلڈ پنجاب کے رکن اور ذلا بھٹی سنگت پنجاب کے چیئرمین ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں حکومت پاکستان نے انھیں علمی و تحقیقی کی خدمات کے صلے میں صدارتی ایوارڈ ''اعزازِ فضیلت'' سے نوازا۔ ۲۰۰۶ء میں راولپنڈی آرٹس کونسل کی طرف سے ان کی کتاب ''انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان'' پر تحریک پاکستان میڈل ملا۔ وزارت ثقافت حکومت پنجاب کی طرف سے کتابوں حاکمان پنجاب اور نواب سعداللہ خاں پر ایوارڈ دیے گئے۔ آپ کی تصانیف میں ڈلے دی بار، ویسب، ٹھنڈی سڑک (مال روڈ لاہور کا منظر نامہ)، اور کچھ سفر بھولتے نہیں (سفر نامہ) شامل ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

راہبر کی تاریخ دانی ختم ہوئی، تو سامنے ہی نمک سے بنی اور قمقموں سے جگ مگ جگ مگ کرتی مسجد نظر آئی۔ یہ بھی ایک عجوبہ ہے۔ ساتھ ہی کان کی چھت سے نمک کے آنسو ٹپک ٹپک کر زمین پر یوں جم گئے تھے کہ وہ قدرتی مجسموں کا منظر دکھائی دیتے۔ اسی چوک میں نمک کی اینٹوں سے چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہیں جہاں دمے کے مریضوں کو رکھا جاتا ہے۔ کچھ آگے بڑھے، تو ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ اس کے دونوں طرف نمکین پانی کے گہرے تالاب تھے۔ اس ہال سے اب تک اتنا نمک نکالا جا چکا ہے کہ اس کی چھت بہت بلند ہو چکی۔

کٹاس مندر کی ایک خوبصورت تصویر

اس لیے اسے دکھانے کے لیے ہمارے راہبر نے روشنی کے ایک غبارے کا بندوبست کیا۔ اس نے غبارے کے ساتھ لٹکتی پیتل کی بتی کو آگ لگائی، تو بلند روشنی کا گولہ چمک اٹھا۔ ساتھ ہی وہ غبارے کو اڑاتا چھت تک لے گیا۔ اس روشنی سے ہمیں ہال کی وسعت، بلندی اور نقش و نگار دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ بڑا عجیب و غریب اور دلفریب منظر تھا۔ راہبر نے بتایا کہ یہاں کئی فلموں کی شوٹنگ بھی ہو چکی۔

ہال سے نکلے، تو راہبر ہمیں ایک بڑے تالاب کی طرف لے گیا۔ اس کے اوپر لکڑی کا پل بنا تھا۔ رنگ برنگی روشنیاں تالاب کے پانی سے ٹکرا کر بہت خوش نما منظر پیش کر رہی تھیں۔ پل پر کھڑے ہو کر تالاب کی گہرائی کا اندازہ لگایا۔ نمکین پانی کی وجہ سے تالاب میں اگر کوئی گر جائے، تو ڈوبتا نہیں۔ مگر ہمارے خیال میں بچتا بھی نہیں۔ روایت ہے کہ تالاب میں پتھر پھینکتے وقت انسان کے دل میں جو خواہش ہو، وہ پوری ہو جاتی ہے۔ ہماری تو صرف یہی خواہش تھی کہ ہر تمنا پوری ہو جائے۔ اس لیے صرف ایک پتھر پھینکا۔ مگر دیکھا کہ ہمارے کئی ساتھیوں نے دو دو پتھر پھینکے۔ شاید انھوں نے غالب کا یہ شعر سن رکھا تھا

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہی ناتمام خواہشیں لیے کان کا ہمارا اندرونی سفر ختم ہوا۔ باہر نکل کر ہم پھر اگلی منزل کٹاس کی جانب روانہ ہو گئے۔ پل کھاتی سڑک پر گاڑی جوں جوں بڑھی، اونچائی میں اضافہ ہوتا گیا۔ پہاڑ اور میدان بھی اپنا رنگ بدل رہے تھے۔ کہیں سرسبز میدان آجاتے، تو کہیں سرخی مائل، بنجر، پتھریلی زمین کے قطعے دکھائی دیتے۔ کچھ فاصلوں کا سفر طے ہوا ہوگا کہ پہاڑوں کے دامن سے ڈنمدوت سیمنٹ فیکٹری کی چمنیوں سے اٹھتا دھواں دکھائی دیا۔ اس میں وہاں کام کرنے والے سیکڑوں مزدوروں کا خون پسینا بھی شامل تھا۔

تیس پینتیس منٹ سفر کے بعد قصبہ چوا سیدن شاہ آ گیا۔ یہ قصبہ وہاں مدفون بزرگ حضرت سیدن شاہؒ کے نام سے منسوب ہے۔ ''چوا'' کے معنی ہیں چشمہ! روایت

www.pdfbooksfree.pk

کے مطابق یہاں بہنے والا چشمہ اسی بزرگ کی کرامت اور دعا سے جاری ہوا۔ قصبے کا عرق اور گلاب بہت مشہور ہے۔

قصبے سے نکل کر گاڑی ایک تنگ سڑک پر رواں دواں ہوگئی جو دونوں اطراف سے ناشپاتی، آڑو اور لوکاٹ کے باغات میں گھری تھی۔ کٹاس پہنچے، تو ایک پہاڑ کے دامن میں یوتھ ہوسٹل اور بالکل سامنے انٹر کالج کی عمارت تھی۔ اسی کالج ہم نے ساتھ لایا کھانا گرم کیا اور بھوک مٹائی۔ فارغ ہوئے، تو کٹاس کے مندروں کی سیاحت کرنے نکل پڑے۔ ہندو عقیدے کے مطابق کٹاس مقدس جگہ ہے۔ مہابھارت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ ہندی روایات کے مطابق جب شیو دیوتا کی بیوی ستی کا انتقال ہوا، تو اسے بہت صدمہ پہنچا۔ اس کے آنسوؤں سے روئے زمین پر دو جھیلیں معرضِ وجود میں آئیں۔ ایک اجمیر کی "پشکر" یا "پوکھر" ہے، دوسری دوآبہ سندھ ساگر کی "کٹک شال"۔ کثرتِ استعمال سے یہی لفظ آہستہ آہستہ کٹاس بن گیا۔

بعض مورخین کے نزدیک کٹاس کا اصلی نام "کیلشن راج" تھا۔ اس کے معنی ہیں: ناگوں کا بادشاہ۔ روایت کے مطابق سناتن دھرمی ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ بھگوان شنکر کا ظہور اسی جگہ ہوا۔ کٹاس کے مندر ان مندروں کی باقیات ہیں جنھیں پانڈوؤں کے بارہ سالہ بن باس کے دوران تعمیر کیا گیا۔ ماہرین آثار قدیمہ انھیں "ست گھرا" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کٹاس کی یہ عبادت گاہیں پہاڑ کاٹ کر بنائی گئیں۔ ان کے سامنے ایک چشمہ صدیوں سے بہہ رہا ہے۔ بیشتر عبادت گاہیں اسی چشمے کے ارد گرد واقع ہیں۔

تخت بابری جہاں شہنشاہ بابر کھڑا ہوتا تھا

کٹاس میں ایک عظیم درسگاہ بھی واقع تھی جہاں دور دراز سے طالب علم حصولِ تعلیم کے لیے آتے۔ معروف چینی سیاح "ہیون سانگ" نے وہاں بھی کچھ عرصہ قیام کیا۔ یہاں ہر سال بہت بڑا میلا لگتا تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک چشمے میں اشنان (غسل) کرنے سے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہاں کے سات مندروں میں سب بڑا مندر وشنو جی کا ہے جس کی کچھ سال پہلے ہی مرمت کی گئی۔ دوسرے مندروں میں شیو جی مہاراج، گنیش، شیولنگ، کالی ماتا، پاروتی اور لکشمی دیوی کے مندر شامل ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ کھنڈر بن رہے ہیں۔ کچھ کی مرمت کر کے انھیں محفوظ بنایا گیا ہے۔

ہم چشمے پہ بنے پل سے گزر کر ان مندروں تک پہنچے۔ تفصیلی جائزے کے بعد واپس لوٹنے لگے، تو ایک طرف کسی پرانی حویلی کے کھنڈر نظر آئے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ یہ حویلی راجا رنجیت سنگھ کے جرنیل نلوا سنگھ نے تعمیر کرائی تھی۔ ہم پھر اپنی اگلی منزل کلر کہار روانہ ہوئے جو وہاں سے ۲۸ کلومیٹر دور تھی۔ راستے میں سیمنٹ کے دو تین کارخانے دکھائی دیے۔ موٹروے قریب ہوئی، تو

www.pdfbooksfree.pk

کلر کہار بھی آ گیا۔

جھیل کی طرف جانے والی بل کھاتی سڑک کی طرف مڑے، تو تاحد نظر پھیلے باغات نے ہمارا استقبال کیا۔ معطر اور سرد ہوا بدن چھونے لگی۔ پُر کیف و سرور کے عالم میں گاڑی سے اُترے۔ تاریخی وادی کا قدرتی حسن و جمال ہمارے سامنے تھا۔ تاحد نگاہ پھیلے باغات میں پھولوں کی مہک، کوئلوں کی کوک اور موروں کی پھوں پھوں کی سریلی آوازوں نے مل کر خوب صورت اور سحر آگیں دلھن کا روپ دھار لیا۔

جنرل کننگھم کے بقول اس وادی کا پرانا نام ''شاکلہا'' تھا۔ اس کو ''کلو کہر'' بھی کہا گیا۔ مغل بادشاہ بابر یہاں آیا، تو تخت بابری کے نام سے پہاڑ کی چٹان تراش کر ایک تخت بنوایا۔ اسی پر کھڑے ہو کر بابر نے اپنی فوج سے خطاب کیا۔ نیز ''باغ صفا'' کے نام سے ایک خوبصورت باغ لگوایا۔ یہ برصغیر میں پہلا مغلیہ باغ تھا۔ تخت بابری اور باغ صفا کلر کہار میں مغلیہ دور کی بہترین یادگاریں ہیں۔

کلر کہار میں مزار سخی آہو باہو

باغ کی دیکھ بھال موضع بھون میں آباد شیخ گدھوک خاندان کے مورث اعلیٰ باوا کالی داس کے ذمے تھی۔ آج یہ باغ تاحد نظر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے نیچے ایک وسیع جھیل ہے جس کا پانی نیلگوں تھا۔ اس پر تیرتی رنگ برنگی سائیکل نما کشتیاں بہت بھلی لگیں۔ کناروں پر سیکڑوں مچھلیاں آلودگی کی وجہ سے مری پڑی تھیں اور آبی پرندے ان کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ یہ قدرتی چشموں کے پانی سے بننے والی جھیل ہے۔ اس کے کناروں پر بچوں کے کئی جھولے بنے ہیں۔ ایک اونٹ اور ایک گھوڑا بھی سیاحوں کی سواری کے لیے موجود تھے۔

جھیل کی سیر سے فارغ ہو کر تخت بابری کا نظارہ کیا، تو خود کو مغل بادشاہ بابر سمجھنے لگے، مگر نیچے کوئی فوج نہ تھی جسے خطاب کرتے۔ تخت پر کھڑے ہو کر نظر دوڑائی، تو نیچے لوکاٹ اور کیلے کے باغات تھے، سامنے خوبصورت جھیل کا رواں دواں پانی اور بائیں طرف کلر کہار کی پھیلی آبادی! تخت بابری کے اوپر دو تین خوب صورت ریسٹ ہاؤس بھی ہیں۔ ان میں سے ایک قصر ناز کے نام سے منسوب تھا۔ یہ باغ صفا کے درمیان واقع ہے۔ اب اس کے دروازے پر ''ویرا لاج'' درج ہے۔ ساتھ ہی شاعر مصطفیٰ زیدی کا یہ مشہور شعر درج ہے:

انہی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

دراصل برطانوی طرز کے اس ریسٹ ہاؤس کو ضلع جہلم کے ڈپٹی کمشنر اور شاعر، مصطفیٰ زیدی نے ۱۹۶۱ء میں بنوایا تھا۔ وہیں بیٹھ کر انھوں نے اپنی محبوبہ کی یاد میں کئی غزلیں لکھیں۔ اب یہ ریسٹ ہاؤس کلر کہار کے اسسٹنٹ کمشنر کی رہائش گاہ میں تبدیل ہو چکا۔ اسی کے بالمقابل خوبصورت سفید آنچل اوڑھے آشیاں ریسٹ

www.pdfbooksfree.pk

ہاؤس واقع ہے جسے ضلعی حکومت نے تعمیر کیا۔ ہم نے اسی میں پڑاؤ کیا۔

ٹکر کہار میں شام اترتے ہی خاموشی چھا جاتی اور عجیب قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں سستا کر ہم پہاڑی پر واقع مزار ''سخی آہو باہو'' چلے گئے۔ اس دربار پر شیشہ اور کاشی کاری ایسی صناعی سے کی گئی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ روایت کے مطابق یہ دربار غوث الاعظم کے دو پوتوں، سید محمد یعقوب اور سید محمد اسحٰق کا ہے۔ ان کے دادا، حضرت عبدالقادر جیلانی نے انھیں اس علاقے میں تبلیغ دین کے لیے بھیجا تھا۔ مقامی قبائل سے لڑائی میں انھوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔ انھیں پہاڑ کی چٹان پر موجودہ دربار میں دفن کیا گیا۔

اس دربار پر بڑی تعداد میں موروں اور کبوتروں کا بسیرا ہے۔ کبوتر دن رات دربار ہی پر رہتے ہیں۔ مور دن بھر باغوں میں پھرتے اور شام کو دربار آجاتے ہیں۔ جب سورج غروب ہونے لگے، تو مور اس منظر سے بہت لطف اندوز ہوتے اور سرور میں رقص کرتے ہیں جسے مقامی زبان میں ''پاکل'' کہا جاتا ہے۔

ہم مزار پر فاتحہ خوانی سے فارغ ہوئے، تو باہر دکانوں کا جائزہ لینے لگے جہاں مختلف اشیا برائے فروخت رکھی تھیں۔ ان میں عرق گلاب، عرق چوعرقہ اور گل قند نمایاں تھے۔ یہ چیزیں مقامی سوغات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک آدھ دکان پر پتھر کی بنی اشیا بھی دیکھیں۔ سب نے پسند کی اشیا خریدیں۔ شام تیزی سے رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ چناں چہ ہم نے واپسی کے سفر کا آغاز کر دیا۔

◆○○

لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے

گستاف فلابیر فرانس کا ممتاز لکھاری گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ''لکھنا ایسا فن ہے جس کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال دریافت کرتے، بوجھتے ہیں۔''

اُردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، آپ بیتی، مزاح یا معلوماتی مضمون! یا پھر کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھائیے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قاری کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔

عمدہ نثر پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو جو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اُردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنا دے گی۔ آخر میں مشہور برازیلی ادیب، پاؤلو کیولو کا یہ قول بھی مدنظر رکھیے:

''ساجھے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجربوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔'' (ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

www.pdfbooksfree.pk

ایک اجنبی نے دی

شادی کی سلامی

منگتے کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دینے والے مہربان کا سبق آموز قصہ

سراج دین

یہ اس دور کا واقعہ ہے جب افغانستان میں خوشحالی اور قانون کی بالادستی تھی۔ مختلف نوعیت کے جرائم کی سزائیں نہ صرف مقرر تھیں بلکہ فی الفور اور بلا امتیاز ان پر عمل درآمد بھی ہوتا۔ حتیٰ کہ گداگری کی سزا بھی موت تھی۔

ایک بھکاری نے گرد و پیش کا جائزہ لے کر ایک خوش پوش راہ گیر سے درد بھری آواز میں کہا "جناب! میں دو دن سے بھوکا ہوں......"

اسی اثنا میں ایک سپاہی ادھر آ نکلا تو بھکاری نے چھاتی پھلا کر بلند آواز میں کہا "اور اگر میں دو دن مزید نہ کھاؤں، تب بھی مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی راہ ہولیا۔ راہ گیر اور سپاہی اسے تکتے رہ گئے۔ خیر یہ تو تھا ایک چٹکلا اب میری کتھا سنیے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو کشکول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں بھکاری کیوں بنا مجھے نہیں معلوم! بائیں ٹانگ سے کیسے محروم ہوا یہ بھی نہیں پتا۔ ماں باپ اور خاندان کا

www.pdfbooksfree.pk

بھی کچھ علم نہیں..... ظاہر ہے بہن بھائی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یوں لگتا جیسے میں آسمان سے ٹپکا ہوا وجود ہوں۔ دو بیساکھیوں کے سہارے چلتا۔ یہ بیساکھیاں مجھے کس نے دیں، میں یہ بھی نہیں جانتا۔ البتہ انھیں میں اس مہارت سے استعمال کرتا جیسے یہ بھی میرے ساتھ آسمان ہی سے اتریں اور میرے وجود کا حصہ بن گئیں۔

ہاں میں اس شخص کو جانتا ہوں جس نے ریل کی پٹریوں سے ملحق کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر مجھے سر چھپانے کے لیے دیا جس میں سوائے سرکاری نل کے کوئی سہولت نہ تھی۔ محلے میں صرف بوڑھے اور بوڑھیاں ہی کبھی کبھار میرا حال پوچھتیں اور گاہے گاہے حلوہ اور پہننے کو خوشی کے تہوار پر پرانا بھی دے دیتیں۔ ایک طرح سے میں دھرتی پر بوجھ تھا جس کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ ہو۔ زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں تو کیا..... پھر بھی مجھے زندگی سے پیار تھا۔ میں اسے بھرپور طریقے سے گزارنے کا خواہش مند رہتا۔

میں اپنے علاقے سے ملحق ایک بارونق بازار میں روزانہ دھوبی کے تھڑے پر جا بیٹھتا جو مجھے معذور سمجھ کر کچھ نہ کہتا۔ ساتھ ہی مٹھائی کی دکان تھی جس کا صبح سویرے حلوہ پوری خوب بکتا۔ خاص طور پر اتوار والے دن اس نعمت سے لطف اندوز ہونے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ بالکل سامنے جراح کا مطب خانہ بھی تھا جہاں لوگ پھوڑے پھنسیوں کے علاوہ ذیابیطس سے بگڑے زخموں کا علاج کرانے آتے۔

ان دو دکانوں پر آنے والے میری جھولی میں بھی کچھ نہ کچھ ڈال دیتے۔ میں راہ گیروں کو ہاتھ اٹھا کر سلام ہی کرتا، تو وہ خود بخود میری حالت زار دیکھ کر مالی تعاون کر دیتے۔ میں نے منہ سے کبھی بھیک نہیں مانگی۔ یوں دو چار سو روپے اکٹھے کر میں کوارٹر کی راہ لیتا۔ جب کبھی بارش ہو جاتی، تو کوارٹر ہی میں پڑا رہتا۔ نشیبی علاقہ ہونے کے باعث یہاں فوراً ہی جل تھل ہو جاتا اور میرے لیے پانی میں نکلنا دشوار ہوتا۔

ان پیسوں سے کھانے پینے کے علاوہ میں "نمبر" بھی لگاتا، مگر کبھی میرا نمبر نہیں نکلا۔ یہ بھی ایک طرح کا جوا ہی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے "جوا کسی کا نہ ہوا۔" کبھی کبھی سگریٹ نوشی بھی کر لیتا۔

میں اس بازار کے ایک رہائشی کو روزانہ صبح صبح تیار ہو کر موٹر سائیکل پر دفتر جاتے دیکھتا تھا۔ کبھی کبھی اشارے سے سلام بھی کرتا، مگر اس نے جواب کے علاوہ کبھی میری جھولی میں کچھ نہیں ڈالا۔ وہ ایسی نظروں سے گھورتا جیسے مجھ سے نفرت کرتا ہے اور اسے میرا یہاں بیٹھنا قطعی ناپسند۔ میں بھی اس سے نظریں چرا لیتا اور دل میں اسے برا بھلا کہتا۔

ایک دن وہ میرے پاس آیا اور معقول رقم دیتے ہوئے کہنے لگا "اس سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرو اور ہاں اسے بھیک مت سمجھنا، یہ تمہاری مدد ہے جو میں مسلمان ہونے کے ناتے کر رہا ہوں۔ جیسے ہی تمہارے حالات بہتر ہوں، میری رقم لوٹا دینا۔ بس یہ خیال رکھنا کہ میں تمھیں دوبارہ اس تھڑے پر اس طرح بیٹھا نہ دیکھوں۔ ان پیسوں سے تم خشک میوہ جات، بھنے ہوئے چنے، مونگ پھلی، چنوں کی نمکین دال، بال پوائنٹ، گولیاں ٹافیاں اور بسکٹ خرید کر بیچو۔ مجھے امید ہے، تم باعزت طور پر زندگی گزار سکتے ہو۔"

میں رقم ہاتھ میں لیے ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا اور دل ہی دل میں خود پر تین حرف بھیجے کہ میں خواہ مخواہ

www.pdfbooksfree.pk

اُسے بُرا سمجھتا رہا۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رقم واقعی معقول تھی' میری تو جیسے بھائے چاندی ہو گئی۔ پورا ہفتہ میں بھیک مانگنے نہیں گیا بلکہ اِس رقم سے خوب عیاشی کی اور نمبر بھی کھیلے' مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اب میرے پاس صرف پندرہ سو روپے باقی رہ گئے' تو مجھے فکر لاحق ہوئی کہ اگر بازار جا کر اُسی تھڑے پر بیٹھا' تو اُن صاحب سے ٹاکرا لازمی تھا۔ پھر کیا جواب دوں گا؟

اسی ادھیڑ بن میں ایک دن اور گزر گیا۔ نجانے میرے انجان مہربان کی آنکھوں میں کیا بات تھی کہ میں اُس کا سامنا کرنے کی اپنے اندر ہمت نہ پاتا۔ برسوں سے بغیر مشقت مفت کی کھا رہا تھا' چار پانچ ہزار روپے کی خاطر یہ ''دھندا'' چھوڑنا بہت مشکل لگا۔ یہ خیال بھی آیا کہ وہ میرا کیا بگاڑ لے گا' اگر میں نے کاروبار نہ کیا' تو؟ اسی رات میں نے بڑا ہی ڈراؤنا اور عجیب و غریب خواب دیکھا۔ جیسے میرے چہرے سے گوشت نوچ لیا گیا تھا۔ میں جدھر رخ کرتا' لوگ ڈر کے مارے چیخیں مارتے بھاگ جاتے۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور بے ساختہ میرے ہاتھ اپنے چہرے پر گئے۔ شکر خدا کا کہ وہ ٹھیک تھا۔

میں حسب معمول گھر سے ''دھندے'' کے لیے نکلا۔ حیرت انگیز طور پر میرے قدم اُس منڈی کی طرف اُٹھ گئے جہاں سے دکاندار تھوک میں سودا سلف خریدتے تھے۔ جیب میں پندرہ سو روپے تھے اور انہی پیسوں سے میں نے بھی نمکو' ٹافیاں' بال پوائنٹ اور بسکٹ خریدے اور اسی تھڑے پر آ بیٹھا جہاں کبھی لوگ مجھے صدقہ' زکوٰۃ اور خیرات دیا کرتے تھے۔ اُس روز جس نے مجھے جتنی رقم دی' میں نے اُسی حساب سے اُسے سودا دے دیا۔ جس نے سودا لینے سے انکار کیا' اُس کی رقم لوٹا دی۔ لیکن شیطان مجھے ورغلاتا کہ رکھ لو وہ تمھیں خوشی سے دے رہا ہے' مگر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ بھیک ہرگز نہیں لوں گا' خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ میں اعوذ باللہ کا ورد شروع کر دیتا جس سے تقویت پاتا اور شیطانی وسوسے دور ہو جاتے۔ خیر آہستہ آہستہ میرا کاروبار چل نکلا' لیکن آمدن معقول نہیں تھی۔ اس پر میں فکرمند رہنے لگا۔

بہرحال محنت کی کمائی کھانے پر میرا ضمیر مطمئن رہنے لگا۔ میں سمجھتا ہوں' یہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے اُس محسن کی مہربانی تھی جس نے مجھے کاروبار کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ مالی تعاون بھی کیا۔ ایک دن اچانک وہ میرے پاس آیا' تو اُس کے چہرے سے مسکراہٹ عیاں اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اُس نے میرا حال احوال پوچھا اور آمدن کے بارے میں بھی جاننا چاہا۔ میں نے بتایا کہ لوگ اب بھی مجھے بھیک دینے کی کوشش کرتے ہیں' تو میرے محسن نے مجھے ایک تختہ لا دیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا:

''بھیک نہیں مجھ سے سودا لیجیے۔''

میں نے وہ تختہ اپنی پشت پر سجا دیا۔ اُس کا فائدہ یہ ہوا کہ راہ چلتے لوگ بھی رک کر اُسے پڑھتے اور کچھ نہ کچھ خرید لیتے۔ رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ نے میرے کاروبار میں ایسی برکت ڈالی کہ میں نے تین پہیوں والی سائیکل خرید لی جس کے پیچھے میری چھوٹی سی موبائل دکان ہے۔ میں اپنے علاقے کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی پھیری لگاتا ہوں۔ اب میں نے کاپیاں' پنسلیں اور دیگر اسٹیشنری کا سامان بھی رکھ لیا ہے۔ پھر اُسی مہربان کے مشورے پر بچوں کے لیے رنگ برنگ مختلف شکلوں کے غبارے بھی

www.pdfbooksfree.pk

بیچنے شروع کیے۔ چھوٹے چھوٹے ننھے منے بچے اپنے والدین کو بضد ہو کر غبارے خریدنے پر مجبور کرتے جو انھیں چار و ناچار مجھ سے لینے ہی پڑتے۔ مختصر یہ کہ باعزت طریقے سے میں پندرہ سولہ ہزار ماہانہ کما لیتا ہوں۔ دکاندار مجھے اُدھار سودا دینے پر آمادہ ہیں' بلکہ زبردستی دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں' لیکن میں اس سے کترا تا اور تھوڑے ہی کو بہت سمجھتا ہوں۔

وہ لوگ جو کبھی مجھے معذور سمجھ کر میری مالی اعانت کیا کرتے تھے، اب بخوشی مجھ سے سودا لیتے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ مجھ سے سودا لیا کریں جو میرے کاروبار اور میرے لیے تقویت کا باعث بنا۔ بعض مہربان تو اپنے بچوں کی کاپیاں' پنسلیں' روشنائی' ربڑ اور قلم تراش اکٹھے ہی منگوا لیتے جس سے میری آمدن تیزی سے بڑھنے لگی۔ کاروبار کی برکت سے نہ صرف میری تنخواہیں دور ہوئیں بلکہ میرا رہن سہن اور حلیہ بھی درست ہو گیا۔ اسپتال برائے معذوراں سے ڈاکٹر عابد کی وساطت سے میں اپنی مصنوعی ٹانگ بنوا رہا ہوں جنھوں نے میری ٹانگ کا ناپ لے کر کمپنی کو آرڈر دے دیا ہے۔ دس بارہ ہزار روپے خرچہ آئے گا۔

محلے میں لوگ میری عزت کرتے اور دوسروں کو میری ہمت اور مستقل مزاجی کی مثال دیتے ہیں۔ اب میں کوارٹر کا دو ہزار روپے ماہانہ کرایہ ادا کرتا ہوں اور اسے سامان آرائش سے بھی سجا لیا۔ بجلی کا میٹر لگ چکا اور سوئی گیس پڑوس سے لے رکھی ہے جس کا آدھا بل میں ادا کرتا ہوں۔ آج کل میری ایک غریب اپاہج دوشیزہ سے رشتے کی بات چیت چل رہی ہے۔

میں اپنی معذوری سے صرف اُس وقت دلبرداشتہ ہوتا جب مجھے بیت الخلا جانے کی حاجت ہوتی' یہ نہایت جانگسل اور اذیت ناک مرحلہ ہوتا۔ کئی بار طہارت کے دوران میرے کپڑے بھی خراب ہو جاتے اور میں لڑھک کر گر پڑتا' تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو چھلک جاتے۔ تب دو ٹانگوں والوں پر مجھے رشک آتا' اور اللہ کے حضور گڑگڑانے لگتا۔ پھر اُس رحیم و کریم ذات نے اپنے غیبی خزانے سے مجھے دولت سے نوازا۔ لکشمی ہاتھ آتے ہی سب سے پہلے میں نے غسل خانے میں کموڈ لگوایا جس کے ساتھ نصب مسلم شاور نے مجھے اس اذیت سے نجات دلا دی۔

ایک دن سر راہ اپنے محسن سے ملاقات ہو گئی۔ انھیں اپنا حال احوال بتایا اور یہ بھی کہ عنقریب میری شادی ہونے والی ہے۔ اتفاق سے اُس روز میری جیب میں پانچ ہزار روپے موجود تھے ... وہی رقم جو مجھے بطور قرض حسنہ ملی تھی۔ میں نے اپنے محسن کو روپے لوٹانے چاہے تو انھوں نے کہا "اسے میری طرف سے اپنی شادی کی سلامی سمجھو" یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے چل دیے۔

◆◆◆

سنہرے پھول

۱۔ صرف مال کمانے میں نہ لگے رہیے یوں آپ عزیز و اقارب کو گنوا بیٹھیں گے۔

۲۔ سب لوگوں کو ایک جیسا مت سمجھیے۔ اُن کی طبیعتیں کتنی رنگا رنگ اور مختلف ہیں، آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

۳۔ لوگوں سے ایسی باتیں کیجیے جن میں وہ دلچسپی لیں نہ کہ ایسی باتیں جن سے آپ کو دلچسپی ہے۔

۴۔ جس شخص سے آپ کا میل جول ہے اس کا مزاج سمجھنا آپ کی مشکلات میں کمی کا باعث ہو سکتا ہے۔

۵۔ شہد کی مکھی کا طرز عمل اپنائیے جو میٹھے پر بیٹھتی اور کڑوے سے کتراتی ہے۔ گھریلو مکھی کی طرح نہ بنیے جو ہمیشہ زخموں کی تلاش میں رہتی ہے۔

(امیر حمزہ بن مشتاق، وارٹن)

www.pdfbooksfree.pk

ہماری مذہبی و قومی اقدار پر

شیطان کا وار

بے حیائی کا امنڈتا طوفان ہمارے
مقدس رشتوں کو بھی پامال کرنے لگا

توقیر عائشہ

چھوٹی پھوپھو نے انتہائی احتیاط سے گدے میں لیٹی نومولود بچی کو نرس سے لے کر گود میں بھرا اور بے ساختہ ''ماشاء اللہ'' کہہ کر مبہوت سی ہو گئیں۔ بچی کیا تھی جیسے گلاب کی پنکھڑی، نازک سی کانچ کی گڑیا! آنکھیں میٹھے گہری نیند میں تھی جیسے سخت مشکل سفر کے بعد منزل پر پہنچ جانے والا مسافر۔

اسپتال کے کمرے میں موجود چچی، دادی اور خالہ سب کی نگاہوں کا مرکز یہ بچی شعیب اور ان کی بیگم سلمیٰ کے لیے قدرت کا عطا کردہ تیسرا تحفہ تھا۔ دو بیٹوں کے بعد نگاہیں بیٹی کی آس میں آسمان کی طرف اٹھتی تھیں۔ مانگنے والے نے رحمت طلب کی تھی، سو خواہش پر کر پوری کی گئی اور نہایت حسین بچی سے نوازا گیا۔ شعیب مبارک باد لینے لگے اور بچی کی ماں آنکھیں موندے رب کا شکر ادا کر رہی تھی۔

پھر پھوپھو سے اپنی گود میں لیتے ہوئے رضوانہ نے کہا ''اسے تو میں اپنی بہو بناؤں گی۔''

شعیب کو ہنسی آ گئی، بولے ''واہ بھابی، ابھی اس نے بابل کا گھر بھی نہیں دیکھا اور آپ نے سسرال طے کر دی۔''

خالہ نے فوراً چہک کر کہا ''بیٹا، اب وہ وقت گیا جب بڑے بچوں کے سارے حقوق اپنی مٹھی میں بند کر لیتے تھے۔ اس دور میں ایسی باتیں سوچنی بھی نہیں چاہئیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

قبل اس کے کہ بچی کی سسرال کا حتمی فیصلہ ہوتا اور کچھ پرانے قصے چھیڑے جاتے، دادی جان نے نیا موضوع اٹھا دیا۔ ”میں تو اس کا نام مہ وش رکھوں گی۔ چاند کا ٹکڑا ہے میری پوتی۔“

یوں ہنستے ہولتے وقت گزر گیا۔ بچی بہت ہی پیاری تھی۔ جو دیکھتا بے اختیار پیار کرنے لگتا۔ دادی صبح شام دعائیں اور آیات پڑھ پڑھ کر پھونکتیں، مبادا اپنے پرائے کی نظر لگ جائے یا کوئی ان دیکھی شے سایہ ڈال دے۔ ننھیال اور ددھیال میں پھول کی طرح پرورش پانے والی ننھی اب ہمیشہ بچی ہی تو نہیں رہ سکتی تھی۔ وقت تو بیج سے پھوٹنے والی ننھی کونپل کو بتدریج مضبوط و توانا کرتا چلا جاتا ہے۔ ننھے پودوں اور بچوں کو بھی!

سو بچپن پیچھے چھوڑتے ہوئے مہ وش بھی عمر کے اس دور میں آ پہنچی جب بے وجہ ہنسی آتی ہے۔ جب خاموشی میں بھی آوازیں آتی ہیں ..... اور آواز میں بھی جل ترنگ سے بجتے ہیں۔ ہر گزرتا دن اسے بے پناہ حسین بناتا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

شعیب خوش حال گھرانے کے سربراہ تھے، ایک مستحکم کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے ایک خوش باش رہتے۔ خاندان اور دوستوں سے بنا کر رکھتے۔ ان کے کئی دوست تھے مگر زبیر کی تو بات ہی جدا تھی۔ دونوں کے والدین ایک ہی محلے کے رہائشی تھے۔ سو بچپن سے ساتھ پلے بڑھے۔ ہم عمر، ہم مزاج، ہم مکتب۔ یکساں مضامین لے کر تعلیمی مدارج طے کرنے والے۔

بھائیوں میں اختلاف ہو جاتا ہے، لیکن ان دوستوں کا معاملہ ہی نرالا تھا۔ ہر معاملے پر دونوں کی رائے بالآخر کسی بڑی بحث و تمحیص میں پڑے بغیر یکساں

ہماری معاشرتی قدریں بھیانک طوفان کی زد میں ہیں۔ ایسے سانحات جنم لے رہے ہیں کہ قلم تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ عشروں سے ہمارے گھروں کی دہلیز پر ایک نادیدہ رکاوٹ ہماری گھریلو معاشرت کی محافظ تھی۔ جب رکاوٹ ہٹا کر گھر کو گزر گاہ بنا دیا گیا، تو شیطانی تہذیب اپنے پورے جتھیاروں کے ساتھ اس میں وارد ہوگئی۔

اب حال یہ ہے کہ اونٹ تو خیمے کے اندر ہے اور بدو صحرا کی یخ بستہ رات اوڑھلسا دینے والے دن کا سامنا کرتے خیمے کے آرام کو ترس رہا ہے۔ کوشش کی ہے کہ انہی سکون بخش پاکیزہ روایات سے محرومی کا غم قارئ کا اپنا دکھ بن جائے۔

(توقیر عائشہ)

ہوتی۔ ہاں! ایک وقفہ دوری کا ضرور آیا جب دونوں کو الگ الگ اداروں میں ملازمت ملی۔ شعیب کی کمپنی مضبوط تھی اور آگے بڑھنے کے مواقع بھی زیادہ۔ مناسب جگہ خالی ہوتے ہی اس نے زبیر کو بلا لیا اور یوں روزگار میں بھی یکسانیت حاصل کر لی۔

سال آگے پیچھے کے فرق سے دونوں کی شادیاں بھی انجام پا گئیں۔ دونوں کی بیگمات یوں آپس میں گھل مل گئیں جیسے گھر میں رہنے والی دیورانیاں جٹھانیاں۔ ان کی اس حد تک دوستی سے بعض رشتہ دار حسد بھی کرتے اور موقع آنے پر اس کا اظہار بھی کر دیتے۔ خاص طور پر جب تقریبات میں خاندان اکٹھے ہوتے، کوئی نوک جھونک ہو ہی جاتی مگر انھیں اس کی پروا نہ تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ دونوں صاحب اولاد بھی ہو گئے۔ زبیر کا ایک بیٹا احمر اور بیٹی ماہم تھے۔ جبکہ شعیب کے دو

www.pdfbooksfree.pk

بیٹے، سلمان اور نعمان تولد ہوئے۔ اب مہ وش کے آنے سے خاندان مکمل ہو گیا۔

ابھی بچے چھوٹے ہی تھے کہ انھیں ایک نو تعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہائش حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ایک ہی گلی میں آمنے سامنے کے دو گھر مناسب ادائیگی کی شرائط پر مل گئے۔ یوں ذاتی رہائش کا حصول بھی آسان ہو گیا۔

بچے جس ماحول میں پلے بڑھے تھے، ایک دوسرے کے والد کو اپنا چچا ہی سمجھتے۔ یہ زبیر انکل تھے، تو وہ شعیب انکل..... دونوں گھرانوں میں بے تکلفی تھی۔ دن بھر آنا جانا لگا رہتا۔ بیٹے ایک دوسرے کے گھریلو کام مثلاً لڑکیوں کو ٹیوشن سنٹر، سہیلیوں کے ہاں ملانے، ماؤں کو اپنے میل ملاپ اور مارکیٹ کے کاموں سے لانا لے جانا وغیرہ انجام دیتے رہتے۔ یوں وقت گزرتا چلا گیا۔

جہاں بڑوں میں ذہنی ہم آہنگی ہو وہاں نوجوانوں میں آپس کی بے تکلفی معنی خیز ہو جاتی ہے۔ یہ بات بڑوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ لہٰذا زبیر کے بیٹے احمر کے لیے مہ وش کا رشتہ طے پا گیا۔ احمر کو سعودی عرب میں اچھی ملازمت مل چکی تھی۔ مہ وش کی تعلیم کے اختتام پر شادی ہونا قرار پایا۔ دونوں گھرانے پرسکون اور زندگی کے سارے رنگوں سے لطف اٹھا رہے تھے۔

☆☆☆

شعیب دفتر کے کمرے میں ایک فائل ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے تھے۔ انھیں خیال آیا کہ دو دن پہلے وہ کچھ فائلیں مطالعے کی غرض سے گھر لے گئے تھے۔ گھر فون کر کے معلوم کیا، تو پتا چلا کہ فائل گھر پر ہی ہے۔ پارٹی کو وقفہ طعام کے بعد آنا تھا۔ اس وقت تک فائل دفتر میں موجود ہونی چاہیے تھی۔ ایسے میں زبیر کمرے میں داخل ہوئے۔ آج وہ گھر پر کھانا کھانے کے موڈ میں تھے۔ شعیب نے موقع غنیمت جانا اور فائل لانے کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ زبیر نے گاڑی لی اور گھر کی طرف چل پڑا۔

وہ ایک گرم دن تھا۔ گھر کی گاڑی مصروف ہونے کے باعث مہ وش کو رکشے سے واپس آنا پڑا۔ آج اس کا سمسٹر تھا، فارغ ہوتے ہی گھر آ گئی۔ گھریلو ملازم، فضل دین مرکزی دروازے پر کسی کام سے کھڑا تھا۔ مہ وش نے شکر ادا کیا کہ اطلاعی گھنٹی بجا کر دروازہ کھلنے کے انتظار سے بچ گئی۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ اے سی بھی چل رہا تھا۔ اس نے کھٹ سے بیگ ایک طرف ڈالا اور صوفے پر آڑی ترچھی پڑ گئی۔ کمرے کی خوشگوار ٹھنڈک نے نیند طاری کر دی اور وہ بالکل ہی بے خبر سو گئی۔

☆☆☆

زبیر ذیلی سڑکیں عبور کر کے جب مرکزی شاہراہ پر پہنچے، تو ٹریفک بری طرح جام ہو چکا تھا۔ وہ اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ انھوں نے پلیئر آن کر دیا اور ان کی انگلیاں موسیقی کا ساتھ دینے لگیں۔ چورستہ اشتہارات سے سجا ہوا تھا۔ بڑے بڑے ہورڈنگز پر خوبصورت ماڈل لڑکیاں کہیں لباس، کہیں شیمپو، ذراموں اور دیگر مصنوعات کی تشہیر کر رہی تھیں۔ چورستے سے داہنے ہاتھ شہر کا ایک مشہور تھیٹر واقع تھا۔ اس میں گلی فلموں کے نیم برہنہ اداکاراؤں والے اشتہار دور ہی سے دعوت نظارہ دیتے۔ زبیر نے آس پاس دیکھا، سب اپنی اپنی گاڑیاں بند کیے ان ماڈلوں کے حسن سے اپنی کوفت دور کر رہے تھے۔ پندرہ منٹ بعد راستہ کھلا۔ اگلے دس منٹ میں وہ اپنے گھر کے دروازے پر تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے سوچا، پہلے شعیب کے گھر سے فائل اٹھا لیں۔ فضل دین نے دروازہ کھولا اور انھیں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا کہہ کر بیگم صاحبہ کو بتانے چلا گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ مرکزی میز پر فائل بھی نظر آ گئی۔ فائل اٹھاتے ہوئے سامنے نظر پڑی...... حسن خوابیدہ حالت میں سامنے تھا۔ ان کی نظریں سراپا حسن پر جیسے جم سی گئیں۔ وہ دل پھینک اور گھٹیا قسم کے انسان نہ تھے۔ مگر فرشتہ بھی نہیں اور ابھی تو وہ چورستہ پر حسن کی تمام گھاتیں دیکھتے آ رہے تھے۔ شیطان نے چند ہی لمحوں میں بڑا کاری وار کر دیے۔ جیسے ہی انھیں اپنی نظروں کے گھٹیا پن کا احساس ہوا، وہ آسمان سے زمین پر آ رہے۔ اپنی نظروں میں آپ گر گئے۔ شرمندگی کے مارے پسینا پھوٹ نکلا۔ تیزی سے فائل اٹھائی اور اپنے گھر چلے گئے۔

شیطان نے چند ہی لمحوں میں بڑا کاری وار کر دیا۔ جیسے ہی انھیں اپنی نظروں کے گھٹیا پن کا احساس ہوا، وہ آسمان سے زمین پر آ رہے۔

ادھر سلمیٰ ان کے لیے مشروب لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں، تو وہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ بیٹی صوفے پر آڑی ترچھی سو رہی تھی۔ ''ابھی تو زبیر بھائی فائل لینے آئے تھے، کہاں چلے گئے؟ اور یہ مہوش کب آئی، کچھ پتا ہی نہیں چلا۔'' خود کلامی کرتے ہوئے مہوش کو جگا کر پوچھا لیکن اس کے علم میں کچھ نہ تھا۔ بلکہ کسی کے بھی علم میں کچھ نہ تھا سوائے زبیر کے! میز پر فائل نہ پا کر وہ سمجھ گئیں کہ فضل دین نے فائل دے دی ہے۔ مطمئن ہو کر کمرے سے چلی گئیں۔

٭٭٭

ادھر زبیر کی بیگم رضوانہ میز پر کھانا سجا رہی تھیں۔ زبیر کو پسینے میں شرابور گھر میں داخل ہوتے دیکھا، تو پوچھنے لگیں ''کیا گاڑی کا اے سی ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا؟ آپ تو پسینے میں بھیگ رہے ہیں۔''

وہ بات نظرانداز کرتے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ تو بڑے سکون سے گھر طعام کرنے آئے تھے، مگر اب کھانے سے رغبت اور بھوک ختم ہو چکی تھی۔ ان کی بے دلی رضوانہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ ''کیا ہوا؟ کس خیال میں گم ہیں؟''

اس کے پوچھنے پر وہ دکھ سے مسکرا دیے۔ اپنے احساسات بتا کر اپنی ذلت کا سامان خود تو نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے تیسے کھانا کھایا۔ واپس جانے میں کچھ وقت تھا۔ رضوانہ چائے بنانے گئیں، تو وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹ گئے۔ مگر...... کسی ڈرامے کے ری پلے کی طرح وہ منظر بار بار آنکھوں کے آگے ناچتا رہا۔

انھیں لگا، در و دیوار ان پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں...... یہ بچی تو تمھاری آنکھوں کے سامنے بڑی ہوئی ہے۔ تم ہی نے اسے شعیب سے بہو بنانے کی بات کی تھی۔ اب یہ کیسی نظر ڈال آئے؟ اگر کسی کو پتا چل گیا تو؟ احساس جرم کی شدت سے ان کے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ چائے آنے سے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بے زاری سے چائے پی اور دوبارہ دفتر کی راہ لی۔

٭٭٭

مہوش اور ان کی بیٹی ماہم کا ایک دوسرے کے پاس آنا جانا لگا رہتا۔ کبھی نوٹس لینے ہیں، تو کبھی مل کر کیک بنانا ہے۔ زبیر کی کوشش ہوتی کہ مہوش سے سامنا نہ ہی ہو۔ مگر جوں ہی سامنا ہوتا، اپنے مجرم ہونے کا احساس

www.pdfbooksfree.pk

پھر سر اٹھنے لگتا۔ ادھر اس کی موہنی صورت اور ادھر اپنے خیال کی تاریکی۔ وہ لاکھ پیچھا چھڑاتے، پہلے کی طرح بیٹا، بیٹا کہہ کر نارمل ہونے کی کوشش کرتے مگر انھیں اپنی آواز اجنبی اور لہجہ کھوکھلا محسوس ہوتا۔

انہی دنوں مہ وش کی خالہ زاد بہن کی شادی ہوئی۔ خالہ کی رضوانہ سے بہت دوستی تھی۔ وہ اسے دعوت نامہ دینے چلی آئیں۔ مہندی مایوں سب ہی تقریبات کی دعوت دے ڈالی۔ رضوانہ نے زبیر سے ذکر کیا، تو وہ الجھ سے گئے، بولے ''ساری تقریبات میں جانے کی کیا ضرورت ہے بس برات والے دن چلی جانا اور میرا جانا کوئی ضروری تو نہیں۔''

رضوانہ نے حیران ہو کر پوچھا ''کیوں؟ آپ نہیں چلیں گے؟ شعیب بھائی تو بہت برا مانیں گے۔''

''دیکھا جائے گا۔'' کہہ کر زبیر نے بات ختم کر دی۔ شعیب کے دونوں بیٹے، سلمان اور نعمان خالہ کے گھر کی تقریبات کے انتظامات میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ مہ وش کے والدین بھی منتظمین میں شامل تھے۔ برات والے دن وہ جلد چلے گئے۔ لہٰذا زبیر کا ہی شادی میں سب کو لے جانا ضروری ٹھہرا۔ مہ وش اور ماہم پارلر میک اپ کے لیے پارلر گئی ہوئی تھیں۔ رضوانہ اور زبیر ان کا انتظار کرنے لگے۔

اتنے میں دونوں کمرے میں داخل ہوئیں۔ رضوانہ نے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے ''ماشاء اللہ'' کہا۔ ان کی بیٹی ماہم بہت پیاری لگ رہی تھی مگر مہ وش سنہرے کام والے سفید جارجٹ کی لمبی سی فراک میں یوں معلوم ہوتی جیسے کوئی باوقار شہزادی عوام کو اپنی جھلک دکھانے محراب میں جلوہ افروز ہو رہی ہے۔ زبیر خوفزدہ سے ہو گئے اور اس پر اچٹتی سی نظر ڈال بیٹی کو دیکھنے لگے۔ ایک عجیب سا خیال ان کے دماغ میں کوندا، جب میری نظر بھٹک سکتی ہے، تو بیٹی کو دیکھ کر بھی کیسے گندے خیال کسی کے دل میں آئیں گے۔ تقریب میں جانے کون کیسی نظر ڈالے گا۔ ان کی اذیت یہ خیال آتے ہی دوہری ہو گئی۔ اچانک رضوانہ سے کہنے لگے ''ماہم سر پہ اسکارف لے لے، تو کتنا اچھا ہو۔''

رضوانہ یہ سن کر کچھ پریشان ہو گئیں، بولیں ''اتنے مہنگے پارلر سے تیار ہو کر آئی ہیں۔ سارے ہیئر اسٹائل کا تو ستیاناس ہو جائے گا۔ ہم کسی مذہبی تقریب میں تو نہیں جا رہے۔''

زبیر جان گئے کہ معاشرتی روایت اتنی تیزی سے تبدیل ہو چکیں کہ ان کا یہ معصوم سا مطالبہ پورا نہیں ہو سکتا۔ بس دونوں کو موبائل کی تصویروں میں قید کرتے دیکھتے رہ گئے۔

دوران تقریب انھیں ایسا لگا کہ سوائے ان کے ہر شخص مسرور ہے۔ تقریب نمٹا کر رات گئے گھر واپسی ہوئی۔ دوسرے دن سب ہی کو اپنے معمولات انجام دینے تھے۔ جلد لیٹ گئے مگر ان کی نیند تو حسب معمول روٹھی ہوئی تھی۔

خاموشی سے لیٹ تو گئے مگر دماغ جاگ رہا تھا۔ انھیں اپنا ابتدائی زمانہ یاد آیا۔ تب وہ اور شعیب گھر کے باہر درخت کے نیچے یا کہیں بینچ پر بیٹھ کر گھنٹے سے بھی زیادہ وقت گزار دیتے۔ معاشرتی روایات یہ تھیں کہ جس گھر میں بہنیں ہوں، وہاں بھائیوں کے دوست گھروں کے اندر نہیں آتے۔ عزیز و اقارب میں بھی گھر کی بہو بیٹیوں کے لیے حجاب اور احترام ہوتا۔ بے تکلفی کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کرنے کی اجازت کسی کو نہ تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

چچا جان بھی گھر میں آتے، تو گھنکار کر داخل ہوتے۔ ان کی امی جھٹ اپنا دوپٹہ نماز کی طرح پہن لیا کرتیں۔ تب کتنا سکون تھا! پھر لوگ کئی فتنوں سے بچے ہوئے تھے۔ اب تو جس کا جی چاہے گھر میں داخل ہو جائے۔ باپ اور بھائیوں کے دوست اور دور پار کے رشتے دار سب ہی ''انکل'' ہیں۔ وہ خود بھی تو انکل ہی ہیں۔ انھیں لگا کمرے کی ہر دیوار میں سے مدوش کی آواز آ رہی ہے۔ ''زبیر انکل..... زبیر انکل!'' انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ جانے کس پہر انھیں بھی نیند آ گئی۔

انسان جسمانی طور پر بیمار یا معذور ہو، تو تیماردار میسر آ جاتے ہیں۔ مگر وہ ایسی کیفیت میں گرفتار تھے کہ دل و دماغ نادیدہ بوجھ تلے دب رہے تھے اور وہ کسی سے مدد بھی نہیں لے پاتے۔ ایسی حالت میں جسمانی صحت کا متاثر ہونا بھی لازمی تھا۔ صوفیانہ قول ہے کہ روح پہلے بیمار ہوتی ہے اور جسم بعد میں! ان پر یہ بات بالکل صادق آ رہی تھی۔

نیند کی کمی، بھوک ختم ہو جانا، معمولی باتوں پر شدید جھنجھلاہٹ، تنہائی پسند کرنا اور زیادہ تر خاموش رہنا..... یہ علامات گھر والوں سے چھپی نہ رہیں۔ اُدھر دفتر میں کیسوئی بھی متاثر ہو رہی تھی۔ ان کی بیگم رضوانہ اور شعیب یہ صورت حال محسوس کر رہے تھے۔ باہم مشورے سے انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

ڈاکٹر نے علامات دیکھ کر بتایا کہ انھیں کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ گو بظاہر کوئی بات اس کی تصدیق کرتی نظر نہ آتی۔ خاندان اور معاشرے میں انھیں بلند مقام حاصل تھا۔ مالی آسودگی تھی، بچوں کی طرف سے بھی کوئی فکر کا پہلو نہ تھا۔ بس دل آرام کا مشورہ مانگ رہا تھا۔

دماغ کہتا تھا کہ سخت مصروف رہا جائے تاکہ آسیب کی طرح چمٹنے والے خیال سے پیچھا چھوٹ سکے۔ یہی کشمکش ان کی صحت تباہ کر رہی تھی۔

ان کی گرتی صحت کے پیش نظر طے کیا گیا کہ مدوش اور احمر کی شادی کا فرض جلد ادا کر دیا جائے۔ ممکن ہے گھر میں ماحول کی تبدیلی، رونق اور چہل پہل سے طبیعت بہتر ہو جائے۔ لیکن سب کا تجویز کردہ یہ نسخہ ان کے لیے تریاق کے بجائے زہر ثابت ہوا۔

ان کا تو یہ دل چاہ رہا تھا کہ مدوش کے بہو بن کر گھر میں آنے سے پہلے ہی وہ کہیں بھاگ جائیں۔ دونوں خاندان مختصر تقریبات کے ساتھ شادی پر متفق تھے تاکہ یہ فرض جلد ادا ہو جائے۔ مگر آنے والا ہر دن زبیر کی دہشت اور اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔

جس دن احمر سعودی عرب سے آیا، وہ اسے دیر تک سینے سے لگا کر روتے رہے۔ وہ کہتا رہا ''ابو! آپ کیا کر رہے ہیں؟ تین سال میں کتنی بار آیا ہوں، ایسا تو آپ نے کبھی نہیں کیا۔ ہمت کریں ابو۔ کیا ہو گیا ہے ابو آپ کو؟''

بیوی بچے اور شعیب سب قریب ہی موجود تھے۔ زبیر روح پر پڑنے والا بوجھ اٹھائے تھک چکے تھے۔ اچانک انھیں محسوس ہوا کہ دل میں لگی آگ۔ اب سرد ہو رہی ہے۔ یہ اور بات تھی کہ اس آگ کو بجھاتے بجھاتے جسم کی ساری قوتیں صرف ہو گئیں۔

احمر نے ہاتھوں کی جنبش ڈھیلی پڑتے دیکھ کر باپ کو بستر پر لٹا دیا۔ ان کی گردن عجیب انداز میں تکیے پر لڑھک گئی۔ سب ہی ان پر بے ساختہ جھک گئے۔ فون اور ایمبولینس کی تلاش کرنے کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی..... مگر انھیں اب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

وہ باتوں باتوں میں بن گیا

دنیا کا سب سے بڑا احمق

ایک چالاک آدمی کا ڈرامائی قصہ، اس نے مارنے آنے والے کو شہ مات دے دی

جیک رچی

دیکھنے میں ایک شریف آدمی لگتا تھا۔ اس نے ہلکے فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ جب میں نے چہرہ دیکھا، تو میری نظر خود بخود اس کے ہاتھ کی طرف گئی۔ مجھے یقین تھا، اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس ہوگا۔ یہ مرد شریف اُسے کھول کر کوئی چیز فروخت کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن میری توقع کے خلاف اُس کے ہاتھ میں بریف کیس کے بجائے بڑے دہانے کا ایک ریوالور چمک رہا تھا۔ پکڑنے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ یہ ''شریف آدمی'' ایسے ہتھیار استعمال کرنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔

اس نے بڑی شائستگی و اہتمام سے یہاں آنے کا مقصد بیان کیا، لیکن میں پرسکون رہا۔ خود مجھے بھی اپنے آپ پر تعجب ہوا۔ ''تو گویا تم مجھے قتل کرنے آئے ہو؟ ٹھیک ہے مگر یہ تو بتا دو کہ مجھے ہلاک کرنے پر تمھیں کس نے مامور کیا؟ مرنے سے پہلے مجھے کم از کم یہ جاننے کا حق تو ہے؟'' میں نے کہا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کو صرف ذاتی دشمنی کی بنا پر ہلاک کرنا چاہوں؟'' اس نے بھی بڑے سکون سے کہا۔ ''مجھے کسی بھی شخص کو اپنا دشمن تصور کرنے کا پیدائشی حق حاصل

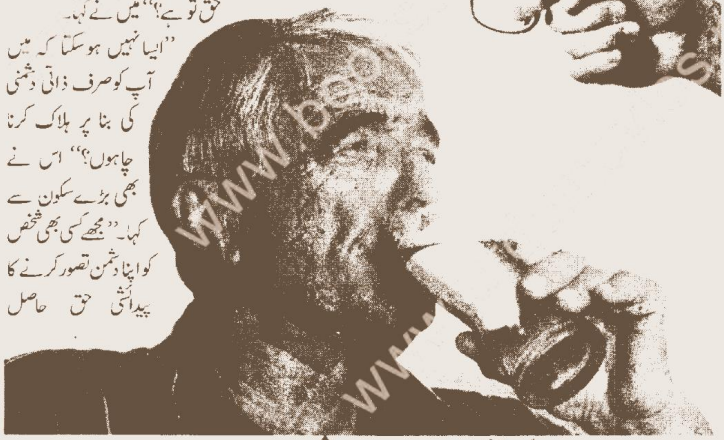

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔''

جب وہ آیا، میں لائبریری میں بیٹھا اپنے لیے ایک گلاس میں مشروب انڈیل رہا تھا۔ آہٹ ہوئی، تو پلٹ کر اسے دیکھا۔ میں نے تحمل سے کہا ''میں اپنے دوستوں اور دشمنوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم میرے لیے قطعاً اجنبی ہو۔ کیا تمھاری خدمات میری بیوی نے حاصل کی ہیں؟''

وہ مسکرایا۔ ''درست ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیوی کے پاس آپ کو مروانے کے لیے معقول وجہ موجود ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں دولت مند آدمی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے، وہ میری ساری دولت پر قابض ہونا چاہتی ہے۔''

وہ چند لمحوں تک مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا ''آپ کی عمر کیا ہوگی؟''

''ترپن سال۔''

''اور بیوی کی عمر؟''

''بائیس سال۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر وہ آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہیں، تو آپ کو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر آپ اس سے وفاشعاری کی امید رکھتے ہیں، تو معاف کیجیے گا، آپ دنیا کے سب سے بڑے احمق ہیں۔''

میں نے مشروب کی چسکی لی اور کہا ''مجھے اس سے وفاشعاری کی توقع تو نہیں تھی البتہ شادی کرتے وقت یہ توقع ضرور تھی کہ وہ سال دو سال بعد طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ اور مجھے طلاق کے ساتھ اپنی کچھ جائداد بھی اسے دینی پڑے گی۔ اس کا حسن دیکھتے ہوئے مجھے یہ سودا مہنگا نظر نہیں آیا۔ لیکن اب نوبت جان کی بازی تک پہنچ گئی اور یہ قیمت ادا کرنا بڑا مہنگا سودا ہے۔''

''آپ کی بیوی خوب صورت ہونے کے علاوہ لالچی بھی ہیں مسٹر ولیم! مجھے حیرت ہے، آپ جیسا تجربہ کار آدمی اس کی یہ خوبی نہیں بھانپ سکا۔''

میں نے اس کا ریوالور دیکھا اور بولا ''مجھے امید ہے تم پہلے جس معقول معاوضے پر دوسروں کے لیے یہ خدمت انجام دے چکے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے انکسار سے جواب دیا۔

''اور تمھیں اپنے اس عمل سے لطف بھی ملتا ہوگا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ہاں آپ اسے بھیانک مسرت کا نام دے سکتے ہیں مسٹر ولیم! مجھے اعتراف ہے، دوسروں کو قتل کرتے وقت مجھے واقعی بڑی مسرت ملتی ہے۔''

میں چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر کہا ''دیکھ لو

صاحبِ تحریر

امریکا کے ممتاز ادیب، جیک رچی امریکی شہر ملواؤکی میں ۲۶ فروری ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ اصل نام جان جارج رچی تھا۔ جاسوسی کہانیاں لکھ کر نام کمایا۔ ان کی تعداد ۵۰۰ سے زیادہ ہے۔ ایک ناول بھی لکھا ''ٹائیگر آئی لینڈ'' نامی یہ ناول ۱۹۸۷ء کو شائع ہوا۔ رچی کی کئی کہانیاں اردو میں بھی ترجمہ ہو چکیں۔ جو ڈرامائی موڑوں کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ رچی ۲۷ اپریل ۱۹۸۳ء کو چل بسے۔

www.pdfbooksfree.pk

تمھیں یہاں آئے دو منٹ سے زیادہ عرصہ بیت چکا لیکن میں اب تک زندہ ہوں؟''

''میں اپنا کام اطمینان سے انجام دینے کا عادی ہوں اور مجھے کوئی جلدی بھی نہیں۔ آج بس یہی ایک کام کرنا ہے۔''

''تو گویا تمھیں اپنے شکار کو تڑپتا ہوا دیکھ کر مسرت نہیں ہوتی بلکہ تم اسے دہشت زدہ کر کے لطف اندوز ہوتے ہو، ٹھیک ہے نا؟''

''آپ بہت گہرے آدمی ہیں مسٹر ولیم!'' اس نے مجھے تعریفی نگاہ سے دیکھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم لطف اندوز ہوتے رہے، میں زندہ رہوں گا؟''

''ہاں لیکن ایک حد تک۔ میں ساری رات تو یہاں بیٹھ نہیں سکتا اور پھر مجھے ایک بات کا خیال رکھنا ہے۔''

''ظاہر ہے، ظاہر ہے۔ مشروب کے ایک گلاس کے بارے میں کیا خیال ہے مسٹر.....؟''

''آپ مجھے آسمتھ کہہ سکتے ہیں۔ سادہ سا نام ہے۔ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں آپ کی دعوت شکریے کے ساتھ قبول کرتا ہوں لیکن مہربانی فرما کر مشروب، بوتل سے گلاس میں میرے سامنے انڈیلیں۔ میں شربت کے ساتھ بے ہوشی کی دوا یا زہر پینے کی عیاشی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن تم یہ تو سوچو، مجھے تمھاری آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ میں ایسی صورت میں اپنی جیب میں زہر کی پڑیا تیار رکھنے سے تو رہا۔''

''درست ہے، اچھا نکتہ ہے لیکن میں خواہ مخواہ خطرہ مول لینے کا قائل نہیں۔''

میں نے میز پر رکھی بوتل سے مشروب ایک اور گلاس میں انڈیلا۔ وہ میرے ہاتھوں پر مسلسل نظریں جمائے رہا۔ میں نے اس کا گلاس میز کے کونے پر رکھ دیا۔ وہ ایک کرسی گھسیٹ میرے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے ریوالور کی نال اب بھی میری طرف تھی۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ میں نے پوچھا ''اس وقت میری بیوی کہاں ہے؟ ظاہر ہے اس نے جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنے کا کوئی بہت عمدہ انتظام کیا ہوگا؟''

''وہ ایک تقریب میں شریک ہیں۔ اس لیے ایک درجن سے زیادہ گواہ قسمیں کھا کے یہ بیان دیں گے کہ وہ آپ کے قتل کے وقت ان کے سامنے موجود تھیں۔''

''ظاہر ہے، ظاہر ہے اور میرا قاتل ایک چور ہوگا جس نے میری غیر متوقع مداخلت سے گھبرا کے مجھے گولی ماردی؟ وہی گھسی پٹی کہانی؟''

اس نے ایک بڑا گھونٹ لے کر گلاس میز پر رکھ دیا اور کہا ہاں، کہانی تو واقعی گھسی پٹی ہے لیکن اثر اب بھی رکھتی ہے۔ کم از کم پولیس کو اس پر یقین آجاتا ہے۔ آپ کو گولی مارنے کے بعد میں یہ گلاس پانی سے اچھی طرح دھو کر دوبارہ الماری میں رکھ دوں گا۔ اور جب واپس گیا، تو دروازے کا ہینڈل بھی رومال سے صاف کردوں گا کیونکہ اندر آتے وقت میں نے اسے پکڑا تھا۔ اس پر میری انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ میں ہر کام نہایت سلیقے اور احتیاط سے کرتا ہوں۔''

''اور غالباً تم یہاں سے چند چیزیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤ گے تاکہ چوری کی کہانی میں جان پڑ جائے؟''

''جی نہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں مسٹر ولیم! پولیس یہ سمجھے گی کہ چور مسٹر ولیم کو گولی مارتے ہی دہشت زدہ ہوا اور گھبراہٹ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے خالی ہاتھ فرار ہوگیا۔''

www.pdfbooksfree.pk

"وہ تصویر جو دیوار پر آویزاں ہے۔" میں نے نظروں سے اس کی پشت پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تیس ہزار ڈالر مالیت رکھتی ہے۔"

اس نے ایک ثانیے کے لیے سرموڑ کر تصویر دیکھی۔ پھر بولا "میں اپنے پاس ایسی کوئی چیز رکھنا نہیں چاہتا مسٹر ولیم جو میرا آپ سے تعلق ثابت کرے۔ میں فن کا قدر دان ہوں لیکن اتنا بھی نہیں کہ اس کی خاطر پھانسی کا خطرہ مول لے لوں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "آپ شاید یہ قیمتی تصویر اپنی زندگی کے عوض مجھے دینا چاہتے ہیں؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی خیال تھا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "مجھے افسوس ہے مسٹر ولیم! جب میں کسی کے لیے معاوضے پر کوئی کام قبول کرلوں، تو مخالف مجھے کسی قیمت پر نہیں خرید سکتا، یہ میرا کاروباری اصول ہے۔"

میں نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا اور بولا "تمھیں غالباً یہ انتظار ہے کہ میں دہشت زدہ ہو کے تم سے گڑگڑا کر زندگی کی بھیک مانگوں؟"

"ہاں، اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کا یہ سکون محض کچھ دیر کی بات ہے۔"

"پھر تم مجھے قتل کر دو گے؟"

"ظاہر ہے مسٹر ولیم! ویسے خوشی محسوس کرنے کے باوجود اسے ظاہر نہ کرنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔"

"شاید تم اپنے ہر شکار سے گڑگڑا کے رحم کی بھیک مانگنے کی توقع رکھتے ہو؟"

"ہاں اور مجھے اس میں کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ البتہ ہر شخص کا انداز مخصوص اور منفرد ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم نے کبھی رحم کھا کر کسی کو زندہ چھوڑا؟"

"اب تک تو ایسا نہیں ہوا۔" وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرایا۔

"مرنے والوں نے تمھیں مال و زر کی پیشکش بھی کی ہوگی؟" میں نے پوچھا "ہاں، اکثر و بیشتر۔"

"پھر بھی انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا؟"

"جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے۔"

"ابھی میں نے تمھیں جو تصویر دکھائی، اس کے پیچھے ایک تجوری پوشیدہ ہے۔"

اس نے لمحہ بھر کے لیے سرموڑ کر دوبارہ تصویر دیکھی اور کہا "اچھا پھر؟"

> "کیا آپ کو یقین ہے مسٹر ولیم کہ آپ پانچ لاکھ ڈالر کے عوض اپنی زندگی خریدنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟"

"اس تجوری میں اس وقت پانچ لاکھ ڈالر موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو خاصی بڑی رقم ہے مسٹر ولیم!" اس کی آنکھوں میں لالچ چمکا۔

میں نے میز سے اپنا گلاس اٹھایا۔ اس میں کچھ مشروب باقی تھا۔ پھر میں تصویر کے قریب گیا۔ تجوری کھولی۔ اندر سے ایک لمبا لفافہ نکالا اور بچے مشروب کا ایک گھونٹ لے خالی گلاس تجوری میں رکھ پھرتی سے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ تجوری دروازہ بند ہونے پر خود بخود مقفل ہو جاتی تھی۔

اس کی نظریں لفافے پر جمی ہوئی تھیں۔ "یہ لفافہ ذرا یہاں لائیے مسٹر ولیم!" وہ بولا۔

میں نے لفافہ میز پر اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ چند لمحوں تک اسے گھورتا رہا "کیا آپ کو یقین ہے مسٹر ولیم کہ آپ پانچ لاکھ ڈالر کے عوض اپنی زندگی خریدنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا ''نہیں، مجھے یقین ہے کہ تمھیں کسی قیمت پر بددیانتی کے لیے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔''

اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا ''اس کے باوجود آپ نے تجوری سے رقم کا لفافہ نکالا؟ کیوں آخر؟''

میں نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھایا اور اسے میز پر الٹ دیا۔ کچھ بوسیدہ کاغذات نکل کر میز پر بکھر گئے۔ ''دیکھ لو، اس میں ایک بھی کرنسی نوٹ نہیں۔ یہ سب پرانے بل ہیں اور تمھارے لیے بیکار ہیں۔''

وہ کچھ جھنجھلا سا گیا۔ ''پھر اس حرکت کا مقصد؟''

''مجھے اس بہانے تجوری کھول کر اس میں تمھارا گلاس رکھنا تھا۔ اس پر تمھاری انگلیوں کے نشانات ثبت ہیں۔''

اس نے جلدی سے اپنے سامنے رکھے گلاس کی طرف دیکھا اور بولا ''وہ آپ کا گلاس تھا، میرا تو یہ رکھا ہے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''وہ تمھارا گلاس تھا مسٹر! مجھے یقین ہے، جب پولیس نے تجوری میں ایک خالی گلاس دیکھا تو ضرور سوچے گی کہ آخر یہ تجوری میں کیوں آیا؟ اور چونکہ یہ قیمتی کی واردات ہوگی، اس لیے وہ گلاس پر ضرور توجہ دے گی۔ اسے گلاس پر تمھاری انگلیوں کے نشانات آسانی سے مل جائیں گے۔''

اس کی پتلیاں سکڑ گئیں، تلملا کر کہنے لگا ''آپ بک رہے ہیں۔ میں نے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ آپ گلاس تبدیل کر ہی نہیں سکتے۔''

''کیا واقعی؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم نے کم از کم دو بار سر موڑ کر اس تصویر کی طرف دیکھا جس کی قیمت میں نے تیس ہزار ڈالر بتائی تھی۔''

اس نے بے اختیار سر موڑ کر پھر تصویر دیکھی پھر کہا۔ ''لیکن وہ ایک دو سیکنڈ سے زیادہ کا وقفہ نہیں تھا۔''

''میں وقت کا صحیح تعین تو نہیں کر سکتا لیکن میرے لیے وہ وقفہ کافی تھا۔ میں نے تمھارا گلاس اپنے سامنے رکھا اور تمھارے سامنے اپنا گلاس رکھ دیا۔''

اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں، وہ ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ''میں کہتا ہوں، یہ ناممکن ہے۔''

''ہوگا۔ مگر مجھے یقین ہے، جب پولیس نے تمھیں گرفتار کیا، تو تمھیں بڑا تعجب ہوگا۔ پھر کچھ عرصے بعد تمھیں موت کی کرسی پر بیٹھ کے موت کو خوش آمدید کہنے کا موقع ملے گا۔ مجھے اصل خوشی اس بات کی ہے کہ تمھیں اپنی موت کا ہفتوں یا شاید مہینوں انتظار کرنا پڑے۔ ہر نیا دن تمھیں یقینی موت سے قریب تر کرتا چلا جائے گا۔ تم نے اب تک کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا؟ اپنے اس کھیل سے تم ہر بار کتنی دیر لطف اندوز ہو سکے؟ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے؟ لیکن تمھیں اپنی موت کا کئی ہفتے، ہزارہا گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا؟ مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ میں اس وقت تمھیں نہیں دیکھ سکوں گا۔''

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ریوالور کی لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ گیا۔ وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ ''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمھارے آخری لمحات کیسے ہوں گے؟'' میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے اسمتھ، تمھیں بھی دوسروں کی طرح یہ غلط فہمی ہوگی کہ جب مرنے کا وقت آیا، تو بے حد پرسکون انداز میں اس کا

www.pdfbooksfree.pk

استقبال کرو گے۔ مگر میرا خیال ہے کہ جب جیل کے محافظ تمھیں گھسیٹتے ہوئے.....''

''تجوری کھولو ورنہ میں تمھیں گولی مار دوں گا۔'' اس کی آواز شدید غصے سے کانپ رہی تھی۔

میں بہت زور سے ہنسا اور بولا ''واہ مسٹر، خوب لطیفہ سنایا۔ جب تک تجوری بند ہے تم میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ہم دونوں کو معلوم ہے، اگر میں نے تجوری کھول دی، تو تم یقیناً مجھے گولی مار دو گے۔''

ماحول میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ تقریباً آدھے منٹ بعد اس نے کہا ''آپ اس گلاس کا کیا کریں گے؟''

''اگر تم مجھے گزند پہنچائے بغیر یہاں سے چلے گئے جس کا اب مجھے پورا یقین ہے، تو میں یہ گلاس ایک سراغ رساں ادارے کے پاس لے جاؤں گا..... تاکہ گلاس سے تمھاری انگلیوں کے نشانات اتار کر محفوظ کر لیے جائیں۔ پھر میں تمھاری انگلیوں کے نشانات آج کی مکمل روداد کے ساتھ ایک لفافے میں بند کر ان کے حوالے کر دوں گا۔ انھیں ہدایت کروں گا کہ اگر میری موت غیر فطری طور پر واقع ہو، تو وہ لوگ میرا لفافہ اسی طرح پولیس کے حوالے کر دیں۔''

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ ''اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' آخر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں آج سے جانے کے بعد دوبارہ کبھی تمھیں شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا ''تمھاری اس یقین دہانی کے باوجود میں اپنے منصوبے ہی کو ترجیح دوں گا کیونکہ اس طرح مجھے مستقبل کا تحفظ بھی مل جائے گا۔''

وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا ''آپ پولیس سے ابھی رابطہ کیوں نہیں کر لیتے؟''

''اس کی بھی چند وجوہ ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے اپنے ریوالور کی طرف دیکھا پھر اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا، بولا ''آپ کی بیوی قتل کے لیے کسی دوسرے کی خدمات بھی تو حاصل کر سکتی ہے؟''

''ہاں تمھاری آج کی کارکردگی سے مایوس ہو کر وہ ضرور کوئی نیا آدمی تلاش کرے گی۔''

کام کی باتیں

☆ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔

☆ لوگوں سے ڈرنے کی بہ نسبت اللہ تعالیٰ کا زیادہ حق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

☆ اے مسلمانو! تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ایک عمدہ نمونہ ہے۔

☆ لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔

☆ جنھوں نے ہماری راہ میں کوشش کی، ہم ان کو اپنا راستہ بتائیں گے۔

☆ لوگو! تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور نہ اسے بطور رشوت حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔

☆ جو شخص جو بھی کوئی عمل کرتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔

☆ اے نبی ﷺ کہہ دو کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم کو دوست بنا لے گا۔

☆ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو۔

☆ نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر کوئی ظلم کیا جائے گا۔

(محمد شہزاد، ملتان)

www.pdfbooksfree.pk

''پھر سراغ رساں ادارہ آپ کا لفافہ فوراً پولیس کے حوالے کر دے گا۔ پولیس آپ کے قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کرے گی اور عدالت بھی مجھے موت کی سزا سنا دے گی۔''

''ظاہر ہے، بشرطیکہ.....'' میں نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

اسمتھ خاموشی سے جملہ مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا ''تم اب بھی بچ سکتے ہو اسمتھ! بشرطیکہ میری بیوی کسی نئے آدمی کی خدمات حاصل کرنے کے قابل نہ رہے۔'' میں مسکرایا ''کیا میری بیوی نے تمھیں یہ بتایا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟''

وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ''جی ہاں۔ صرف یہ بتایا کہ وہ کسی مسز پیئرسن کے گھر میں ہے۔ وہاں سے گیارہ بجے رات کو واپسی کے لیے انھیں گی۔ انھوں نے کہا تھا کہ مجھے اپنا کام گیارہ بجے سے پہلے پہلے انجام دینا ہوگا۔''

''گیارہ بجے؟ تب تو بہت تاریکی چھا جاتی ہے۔ ویسے بھی آج کی رات بہت تاریک ہے، کیا تمھیں مسز پیئرسن کا مکان معلوم ہے؟''

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا ''نہیں۔''

میں نے اسے مسز پیئرسن کا پورا پتا تفصیل سے بتایا تاکہ وہ آسانی سے مکان تلاش کر لے، پھر کہا ''ابھی گیارہ بجنے میں خاصا وقت ہے، تم اطمینان سے وہاں پہنچ سکتے ہو۔''

ہم دونوں آدھ منٹ تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ میں نے کہا ''اچھی طرح سوچ لو۔ اپنے مستقبل کی حفاظت کے لیے تمھیں یہ کام کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔''

وہ آہستہ آہستہ کوٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔ پھر بولا ''گیارہ بجے آپ کہاں ہوں گے مسٹر ولیم؟''

''میں اپنے کلب میں پانچ دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہا ہوں گا۔ وقت آنے پر وہ دوست پولیس کو حلفیہ بیان دیں گے کہ میں گیارہ بجے ان کے ساتھ تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے، تم یہ کام گیارہ بجے ہی کر لو گے؟''

''اس کا انحصار مناسب حالات اور موقع ملنے پر ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم نے مسز پیئرسن کا مکان نہیں دیکھا۔ میں بتاؤں، وہاں تمھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

وہ مجھے گھورتا رہا پھر دھیرے سے مسکرایا۔ ''آپ کو کسی زمانے میں اپنی بیوی سے محبت تو ہوگی؟''

میں نے میز پر رکھا ہوا ایک قیمتی مجسمہ اٹھا کے کہا۔ ''جب میں نے اسے خریدا، تو مجھے یہ بہت پسند تھا۔ میں اسے تعریفی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ لیکن اب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ سوچ رہا ہوں کہ اسے گودام میں ڈال دوں اور اس کی جگہ نیا مجسمہ خرید لاؤں۔''

☆☆☆

اسمتھ کے رخصت ہوتے ہی میں نے میز پر رکھا گلاس اٹھایا اور سیدھا ایک سراغ رساں ادارے کے دفتر پہنچا۔ گلاس حوالے کرتے ہوئے میں نے انھیں اسمتھ کی انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے کی ہدایت کی اور اپنے کلب چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر گھڑی دیکھی، پونے گیارہ بج رہے تھے۔

میں نے اسمتھ کے سامنے تجوری میں جو گلاس رکھا، وہ وہیں موجود رہا کیونکہ اس پر میری انگلیوں کے نشانات ثبت تھے۔ ●●●

www.pdfbooksfree.pk

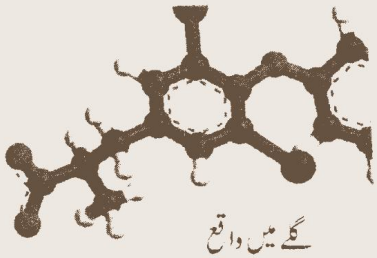

گلے میں واقع

انسانی جسم کا ایک اہم غدہ

اس غدے کی خرابی ہمیں تھکن، کمزوری اور سستی کا شکار بنا ڈالتی ہے

عالیہ فاطمہ

سالہ عالیہ کچھ عرصے سے تھکن کا شکار تھی۔ ۴۰ جب بھی لیٹتی، تو سر درد ہونے لگتا۔ اس کی یادداشت بھی کمزور ہوگئی۔ باتوں پر توجہ دیتے ہوئے بھی دشواری محسوس کرنے لگی۔ جب یہ تکلیف دہ کیفیت کافور نہ ہوئی، تو ناچار ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر بیماری کی وجوہ سمجھ نہ پایا اور اسے کچھ ادویہ دے کر ٹال دیا۔

عالیہ کی ایک سہیلی تعلیم یافتہ تھی۔ وہ بھی کچھ عرصہ قبل غدہ درقیہ یا تھائرائڈ (Thyroid) کے ایک بیماری کا شکار ہوکر انہی علامات میں مبتلا رہ چکی تھی جن سے عالیہ کو واسطہ پڑا تھا۔ سہیلی کے مشورے پر وہ ماہر امراض صماوی (Endocrinologist) کے پاس پہنچی۔

ماہر امراض صماوی نے عالیہ کو کہا کہ وہ غدہ درقیہ سے خارج ہونے والے ہارمونوں کا ٹیسٹ کرائے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ہارمونوں کا اخراج کم یا زیادہ تو نہیں ہو چکا۔

جب غدہ درقیہ کے ٹیسٹ ہوئے، تو انکشاف ہوا کہ عالیہ "ہائپوتھائرائڈزم (Hypothyroidism) میں مبتلا ہو چکی۔ غدہ درقیہ کی اس بیماری میں وہ بہت کم ہارمون خارج کرتا ہے۔ اس خلل کے باعث انسان کئی طبی مسائل کا نشانہ بن جاتا ہے جن میں کمزوری، تھکن، قبض، نیند آنا، جلد خشک ہونا، چہرے کی سوجن، یادداشت کی کمی، وزن بڑھنا، آواز بیٹھنا اور عضلات میں اینٹھن شامل ہیں۔

مرض کی تشخیص کے بعد ماہر امراض صماوی عالیہ کا علاج کرنے لگا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مرض ابتدائی حالت میں تھا، اسی لیے وہ جلد تندرست ہوگئی۔

www.pdfbooksfree.pk

خدانخواستہ وہ اپنی بیماری ٹالتی رہتی، تو موت کے منہ میں بھی جاسکتی تھی۔

☆☆☆

پاکستان میں کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے جسم میں غدہ درقیہ اہم ترین غدود میں سے ایک ہے۔ تتلی کی شکل والا یہ غدہ ہمارے گلے میں واقع ہے۔ یہ تقریباً ۱۰ سینٹی میٹر لمبا ہے۔ ہمارے بدن میں اس غدے کی بنیادی ذمے داریاں یہ ہیں:

جسم کو غذائی توانائی جذب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ☆ پروٹین بنانے میں حصہ لیتا ہے ☆ اور یہ کنٹرول کرتا ہے کہ ہمارا جسم دیگر ہارمونوں کے ساتھ کس طرح توازن رکھے۔ ☆ جسمانی درجہ حرارت معتدل اور دل تندرست رکھنے میں بھی اس کا اہم کردار ہے۔

غدہ درقیہ ہارمون خارج کر کے درج بالا ذمے داریاں انجام دیتا ہے۔ ان میں سے دو ہارمون اہم ہیں: ٹرائیوڈوتھائرونین (Triiodothyronine) اور تھائروزائن (Thyroxine)۔ یہ دونوں ہارمون کئی جسمانی اعضا کی نشوونما اور دیگر نظاموں کے عمل میں حصہ لیتے ہیں۔ ان دونوں کو مختصراً بالترتیب ٹی ۳ (T3) اور ٹی ۴ (T4) کہا جاتا ہے۔

غدہ درقیہ سے ہارمون کم خارج ہوں گے یا زیادہ، اس امر کو تھائرائڈ سیمولیٹنگ نامی ہارمون کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ہارمون ہمارے دماغ میں واقع غدہ نخامیہ (Pituitary Gland) سے خارج ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ درج بالا ہارمون کی پیداوار بھی تھائروٹروپین ریلیزنگ نامی ہارمون کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ہارمون دماغ ہی میں واقع ایک اور عضو، وطاء یا ہائپوتھالمس (Hypothalamus) چھوڑتا ہے۔

غیر صحت مند طرز زندگی اور دیگر مسائل کے باعث غدہ درقیہ چار امراض کا نشانہ بن سکتا ہے۔ ان میں ہائپر تھائرائڈزم، تھائرائڈیٹس، ہائپوتھائرائڈزم اور سرطانی یا غیر سرطانی رسولیاں شامل ہیں۔ ان چاروں امراض کی وجہ سے غدہ درقیہ گلہڑ (Goiter) میں مبتلا ہوتا ہے۔

ہائپوتھائرائڈزم کے بارے میں آپ اوپر پڑھ چکے، ہائپر تھائرائڈزم کا شکار ہونے پر غدہ درقیہ معمول سے زیادہ ہارمون خارج کرتا ہے۔ اس غیر معمولی کیفیت کی بنا پر جسم انسان میں یہ علامات جنم لیتی ہیں: گھبراہٹ، رنج و تردد، عضلات میں کمزوری، وزن میں کمی اور پیاس لگنا۔

تھائرائڈیٹس میں غدہ درقیہ سوزش زدہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ سرطانی رسولی جنم لینے پر جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ گلہڑ جنم لے، تو غدہ درقیہ پھول جاتا اور تکلیف دیتا ہے۔ ان تمام بیماریوں کا علاج موجود ہے۔

خرابی کی نمایاں علامات

اگر انسان کا وزن کم یا زیادہ ہو جائے، طبیعت میں تبدیلیاں آئیں، خون کا دباؤ کم یا زیادہ ہو، ڈپریشن چھا جائے اور نظر کمزور ہونے لگے، تو سمجھ جایئے کہ آپ کے غدہ درقیہ میں خرابی پیدا ہو چکی۔ اب ڈاکٹر مرض کی تشخیص کر کے دیکھے گا کہ کس قسم کا علاج کرنا ہے۔

ایک طبی رپورٹ کی رو سے پاکستان میں تقریباً دو کروڑ مرد و زن غدہ درقیہ کی کسی نہ کسی خرابی میں مبتلا ہیں۔ اکثر لوگوں کو پتا ہی نہیں چل پاتا کہ وہ غدہ درقیہ میں نقص کی وجہ سے بیمار ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ پاکستانی غدہ درقیہ کے متعلق کم ہی معلومات رکھتے ہیں۔

اگر خدشہ ہو کہ آپ کا غدہ درقیہ خراب ہے، تو کسی اچھے اسپتال میں جایئے۔ وہاں غدہ کی تندرستی جاننے کے لیے مختلف طبی ٹیسٹ ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس کی

www.pdfbooksfree.pk

اسکیننگ بھی ہوتا کہ مرض کا پتا چل سکے۔ اگر غدہ درقیہ ناقابل علاج ہو، تو اسے نکال دیا جاتا ہے۔

لاہور کے ایک ممتاز معالج، ڈاکٹر زمان شیخ کا کہنا ہے ''جب کسی انسان میں غدہ درقیہ کام نہ کرے، تو کئی لحاظ سے اس کی صحت پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔ وجہ یہ کہ غدہ درقیہ کی خرابی ڈپریشن، امراض قلب، بے چینی، بال گرنا، ہاتھ پیر وغیرہ کو بڑھاوا دیتی ہے۔ لہٰذا یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ غدہ درقیہ ٹھیک کام کر رہا ہے یا نہیں۔''

قدرتی علاج

کئی لوگ ادویہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے بعض قدرتی علاج سے غدہ درقیہ کو صحت مند رکھنا ممکن ہے۔ اگر غدہ خراب ہو، تو سفید آٹا، چکنائی، چینی، گوبھی، ناشپاتی اور آڑو معتدل مقدار میں استعمال کیجیے۔ یہ اشیا زیادہ کھانے کی صورت میں غدہ درقیہ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، روزانہ ایسی غذا کھائیے جس میں ۵۰ فیصد حصہ پھلوں و سبزیوں پر مشتمل ہو۔

غدہ درقیہ کی خرابی کا شکار لوگ کیفین سے دور رہیں۔ یہ شے غدے کا فعل متاثر کرتی ہے۔ جبکہ زنک، تانبا، سیلنیم اور وٹامن اے رکھنے والی غذائیں کھائیے۔ یہ معدن اور وٹامن غدہ درقیہ کو تندرست رکھتے ہیں۔

غدہ درقیہ کے ہارمونوں کی پیدائش کے لیے آئیوڈین عنصر کا جسم میں ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے آئیوڈین کی کمی سے غدہ خراب ہو جاتا ہے۔ یہ کمی آئیوڈین ملا نمک کھانے سے دور کرنا ممکن ہے۔

جسم میں چکنائی کے ضروری تیزاب (Essential fattyacids) بھی ہونے ضروری ہیں۔ یہ غدہ درقیہ کے ہارمونوں کی پیداوار میں حصہ لیتے اور جسمانی سوزش گھٹاتے ہیں۔ السی کا تیل ان تیزابوں کا خزانہ ہے۔

انسانی جسم میں کیلشیم اور میگنیشم بھی وافر ہونا چاہیے۔ یاد رہے، یہ دونوں اپنے افعال انجام دینے کی خاطر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اگر جسم میں میگنیشم کی کمی ہو، تو کیلشیم صحیح طرح جزوِ بدن نہیں بن پاتا۔ عام طور پر ۱۰۰۰ ملی گرام کیلشیم کے لیے ۳۳۵ ملی گرام میگنیشم کی ضرورت ہوتی ہے۔

◆◆◆

کوئی مہرباں سا ہے

ہر ایک نقش ترے پاؤں کے نشاں سا ہے
ہر ایک راہگزر تیرا آستاں سا ہے
کہیں سمٹ کے نہ رہ جائے ہمت پرواز
کہ شاخ شاخ پہ پنہاں اک آشیاں سا ہے
ابھی گلوں کی نظر سے نظر نہیں ملتی
ابھی فضائے چمن میں دھواں دھواں سا ہے
نجانے شوق کی وہ رات کٹ گئی کیسے؟
ہر ایک لمحۂ جہاں عمرِ جاوداں سا ہے
اُجڑ گئی ہے میری کائناتِ دل، پھر بھی
مری نگاہ میں آباد اک جہاں سا ہے
زباں پہ نام بھی آتا ہے تیرا رُک رُک کر
ہر ایک تارِ نفس دل کا پاسباں سا ہے
یہ کس نے آج جگائی ہے عہدِ رفتہ کی یاد
یہ کون دل کے قریں آج نوحہ خواں سا ہے
گلے ہیں دل سے ابھرنے وفا کے افسانے
کہ اپنے حال پہ پھر کوئی مہرباں سا ہے

(صوفی تبسم)

www.pdfbooksfree.pk

ہماری حاضر جواب اور بذلہ سنج

بیٹی گھر کی رونق بن گئی

ایک فخر مند باپ اپنی ہونہار دختر کی کامیابیاں بیان کرتے ہیں

انور احمد علوی

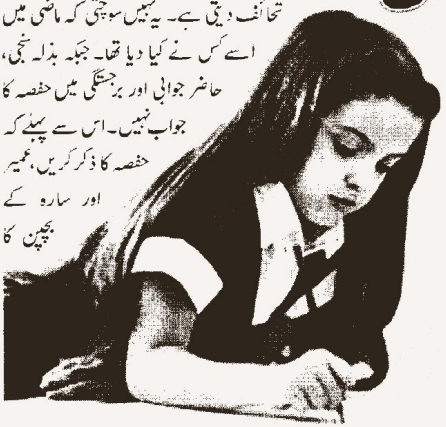

تین بچے ہیں: عمیر، سارہ اور حفصہ۔

ہمارے تینوں کی قدر مشترک یہ ہے کہ وہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ان سے کسی غریب کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔ یہ ابھی بچے ہیں اور سیاست نہیں جانتے، اس لیے عملی قدم اٹھاتے اور تصویر بھی نہیں کھنچواتے! پتا اس وقت چلتا ہے جب دوبارہ جیب خرچ دینے کا مطالبہ کریں۔

ایک مرتبہ عمیر نے پندرہ سو روپے مانگے۔ ہم نے چپ چاپ دے دیے۔ ہمیں تو خیر کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ماؤں کو ایسے مواقع پر تشویش ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اہلیہ کو شک گزرا کہ بیٹا لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا ہے، کہیں کوئی چکر تو نہیں چلا رہا؟ اگر کبھی تنخواہ دینے میں دیر ہو جائے، تو یہی شک انھیں ہم پر بھی ہوتا ہے! وہ ٹوہ میں لگ گئیں۔

جب عمیر کے دوستوں سے رابطہ کیا، تو پتا چلا، مالی بابا کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور عمیر اسکول کے بچوں کے ساتھ مل کر ان کے لیے خطیر رقم کا بندوبست کر رہا ہے۔

تینوں بچوں کی انفرادی خصوصیات بالکل مختلف ہیں۔ عمیر تابع فرمان اور ذمے دار ہے۔ ہر وقت اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ گھر میں کسے، کب کس چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ سارہ کھلے دل کی مالک اور شاہ خرچ ہے۔ وہ خوشی کے موقع پر (کوئی توقع رکھے بغیر) دل کھول کر تحائف دیتی ہے۔ یہ نہیں سوچتی کہ ماضی میں اسے کس نے کیا دیا تھا۔ جبکہ بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور برجستگی میں حفصہ کا جواب نہیں۔ اس سے پہلے کہ حفصہ کا ذکر کریں، عمیر اور سارہ کے بچپن کا

www.pdfbooksfree.pk

ایک ایک دلچسپ واقعہ سناتے چلیں۔

ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے باہر جانے لگے۔ عمیر سے کہا ''حالات اچھے نہیں لہٰذا کوئی دروازہ کھٹکھٹائے، تو ہرگز نہ کھولنا۔ مبادا ڈاکو وغیرہ اندر آجائے۔''

اتفاق سے اس دوران ہمارے بڑے ماموں آ گئے۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، اپنا نام بتایا اور عمیر سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ عمیر (جو اس وقت چار سال کا تھا) کہنے لگا ''نانا ابا، میں گھر میں اکیلا ہوں۔ ابو نے منع کیا ہے کہ ڈاکو آئیں تو دروازہ نہیں کھولنا!''

ایک بار سارہ نے ہم سے بڑی فرمائش کر ڈالی۔ ہم نے کہا ''ہم غریب آدمی ہیں، تمھاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتے۔'' وہ بجھ سی گئی۔ ہمیں سخت ملال ہوا۔ اسے بہلانے کی غرض سے شام کو سیر و تفریح کا پروگرام بنایا۔ اہلیہ نے سارہ سے تیار ہونے کے لیے کہا، تو انتہائی معصومیت سے بولی ''آپ لوگ چلے جائیں، مجھے غریبوں کے ساتھ گھومنے نہیں جانا۔''

☆☆

میری بیٹی حفصہ ۲۲ راگست ۱۹۹۱ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹی ہے اور بے حد حساس۔ اس نے چھے برس کی عمر میں انگریزی زبان میں خط اور نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ بچپن میں جب کسی کی کوئی بات ناگوار گزرتی، تو زبان سے کچھ نہ کہتی، غصے میں دروازہ بند کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کچھ دیر بعد ایک لفافہ باہر پھینک دیتی۔ ہم لوگ لفافہ کھول کر خط پڑھتے، محظوظ ہوتے اور اسے محفوظ کر لیتے۔ دلیل میں وزن ہوتا، تو اس کی بات مان بھی لیتے۔ ان یادگار خطوط کا مجموعہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور دلچسپ انگریزی کتاب ''Warning Letters to Parents'' (والدین کے لیے تنبیہی خطوط) کے نام سے شائع ہو چکا۔

یہ وہ باتیں ہیں، جو بچے بڑے ہو کر حدِ ادب کی وجہ سے نہیں کر سکتے۔ یہ خطوط اس کی حساس طبیعت کا ردِعمل ہیں اور طنز و مزاح کا خوب صورت امتزاج۔ ان میں پایا جانے والا مزاح فطری ہے۔ یہ مزاح زیادہ تر اس کی منفرد تشبیہات سے پیدا ہوتا۔ وہ جو کچھ دیکھتی، سوچتی، محسوس کرتی، اسے ''پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس'' کی پروا کیے بغیر معصومیت سے لکھتی جاتی۔ کہیں مصلحت پسندی سے کام نہیں لیتی۔

یہی وجہ ہے، اپنے خطوط میں وہ کہیں ہم میاں بیوی کو دھمکیاں دیتی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات یاد کراتی اور کہیں اپنے بڑے بھائی کی تربیت کرتی نظر آتی ہے۔ اس کے یہ خطوط چھے سے بارہ برس کی عمر کے درمیان لکھے گئے۔ یہ ایک بچی کے احساسات و جذبات ہیں، اس لیے ان میں زبان و بیان اور گرامر کی غلطیاں تلاش نہ کی جائیں۔

حفصہ کی ایک اچھی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے کام ترتیب سے کرنے کی عادی ہے۔ خود پریشان ہوتی ہے نہ دوسروں کو تنگ کرتی ہے۔ دہلی میں پیدا نہ ہونے کے باوجود نہاری، پائے اور پلاؤ اس کے پسندیدہ کھانے ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہمارے ہاں مشرقی کھانے پکانے کی روایت برقرار ہے ورنہ عمیر اور سارہ بدمزہ مغربی کھانوں اور فاسٹ فوڈز کے دلدادہ ہیں۔ اسکول جاتے وقت اہلیہ کو باقاعدہ دھمکی دے کر جایا کرتی ''امی آج فلاں چیز بنائیے گا ورنہ دیکھیے گا، میں کیا کرتی ہوں؟''

اب حفصہ کے چند مزیدار واقعات جنھیں پڑھ کر

www.pdfbooksfree.pk

آپ کو یقیناً لطف آئے گا:

ایک رات حفصہ نے اسکول جاتے ہوئے پچاس روپے مانگے۔ اہلیہ نے ڈانٹ دیا کہ اتنے پیسوں کا کیا کرو گی؟ اسے پندرہ بیس روپے دیے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد حفصہ ایک بڑی سی چادر اوڑھے باورچی خانے میں داخل ہوئی اور کپکپاتی آواز میں بولی ''اے باجی..... اے باجی! تیرے بچے سدا جیویں..... مجھ غریب کو پچاس روپے دے دے!'' یوں اپنی ذہانت سے امی کو ہنسا کر پچاس روپے لے لیے۔

ہماری بڑی بیٹی سارہ کو بلی پالنے کا شوق ہے۔ ایک بار وہ کہنے لگی ''ابو اس مرتبہ نتیجہ آنے پر آپ مجھے تحفے میں بلی دیجیے گا۔ امی، بھائی اور حفصہ کی مرضی، وہ جو بھی دیں۔''

حفصہ، جو اسکول کا کام کرنے میں مصروف تھی، دور ہی سے چلائی: ''سارہ کوئی بھی تمھیں تحفے میں بلی نہیں دے سکتا۔''

''کیوں نہیں دے سکتا، میں تو ابو سے بلی ہی لوں گی۔''

''ابو تمھیں تحفے میں بلی نہیں دے سکتے۔''

''کیوں نہیں دے سکتے؟''

''پاگل، وہ بلی کو ڈبے میں پیک کیسے کریں گے!''

ایک بار ہمارے ایک ادیب دوست آئے۔ ہم نے حفصہ سے کہا کہ ان پر اچھی سی نظم لکھ دو۔ اگلے ہفتے انھیں اپنے ہاں ادبی نشست میں بلائیں گے، تو پڑھ دینا، خوش ہو جائیں گے۔ انھیں گئے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ حفصہ دوڑی آئی اور کہنے لگی ''ابو، ابو! آپ کے دوست پر ایک شعر تو ہو گیا..... آپ..... جلدی سے نوٹ کر لیں، کہیں میں بھول ہی نہ جاؤں۔''

ہم نے اسی وقت کاغذ پنسل اٹھائی تو بولی:

His colour is very fair,

But his head is without hair!

(ان کا رنگ تو اُجلا ہے، مگر سر بالوں سے عنقا ہے)

اسی طرح ایک دن ہمارے ہاتھ میں پرچی لا کر دی کہ میں بھائی پر نظم لکھ رہی ہوں، ابھی ایک شعر ہوا ہے، یہ اپنے پاس رکھ لیں، مجھ سے کہیں گم نہ ہو جائے۔ ہم نے شعر پڑھا، تو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ لکھا تھا:

My brother is thin

Just like a common pin!

(میرا بھائی پتلا ہے، کامن پن سے ملتا ہے)

ہمارے ایک دوست محمد سرور عالم دفتر کے ساتھی ہیں۔ ہمیں جب کچھ رقم درکار ہو، ان سے تذکرہ کر دیتے۔ وہ ہمیں رقم دے ڈالتے، کبھی انکار یا بہانہ نہ کرتے۔ ایک روز رات کے کھانے پر اسکول سے متعلق کسی بڑے خرچے کا ذکر ہوا۔ ہم نے کہا ''ہمارے پاس تو اتنی رقم ہے نہیں، کل دفتر میں 'سرور' سے بات کریں گے۔''

حفصہ نے سنا، تو چھوٹتے ہی بولی ''ابو جی ی ی ی! 'سرور' تو کمپیوٹر میں ہوتا ہے!''

ہمارا بیٹا بہ لحاظ پیشہ ایکچوئری (Actuary) ہے۔ ایکچوئری کا شمار بھاری معاوضہ لینے والے ماہرین میں ہوتا ہے۔ حفصہ کو معلوم ہوا کہ ایکچوئری کو بہت زیادہ تنخواہ ملتی ہے، تو اس کے معصوم ذہن میں ایک خدشہ پیدا ہوا۔ پریشان ہو کر اہلیہ سے کہنے لگی ''امی..... امی! بھائی جب ایکچوئری بنا، تو اس کی تنخواہ ابو سے زیادہ ہو جائے

www.pdfbooksfree.pk

گی..... تب کہیں..... کہیں ابو اس سے جلیں گے تو نہیں؟''

ایک بار حفصہ چھٹیوں میں کسی عزیزہ کے ہاں رہنے گئی۔ خاتون خانہ نے کسی بات پر اپنی ملازمہ کو مارا، تو وہ رونے لگی۔ حفصہ سے چھوٹی سی بچی کو مارنا اور اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ شام کو جب وہ بچی بچوں کو لیے پارک میں گئی، تو راستے میں حفصہ اس سے کہنے لگی ''نصرت! سب سے پہلے تو تم یہ ملازمت چھوڑ دو تاکہ تمھیں مار نہ پڑے۔ پھر کسی اچھے اسکول میں داخلہ لو۔ تمھاری زندگی بن جائے گی۔''

حفصہ بے چاری کو کیا پتا کہ اگر بچی کے والدین کے پاس وسائل ہوتے، تو وہ غریب کھیل کود کی عمر میں ملازمت کرنے کے بجائے کسی اسکول میں پڑھ رہی ہوتی۔

حفصہ آسمان کی طرف منہ کیے دعا مانگ رہی ہے ''اللہ میاں! ہمارے لیے بھی اوپر سے ایک گاڑی پھینک دیں۔''

ایک بار اہلیہ نے کسی بات پر اسے ڈانٹا، تو کہنے لگی ''میں نے بہت صبر کر لیا۔ اب میں اور برداشت نہیں کروں گی۔ آپ ٹھیک ہو جائیں..... ورنہ میں آپ کے رویے پر ایک نظم لکھ دوں گی۔''

حفصہ کو بچپن میں بیر بہت پسند تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ 'بیر' کو بیئر کہتی اور مونث بولتی۔ گھر میں جب کوئی مہمان آتا، تو اس سے کہتی ''آپ کو پتا ہے، ہمارے فریج میں 'بیئر' رکھی ہے، ابو لائے تھے۔''

جو بھی سنتا مشکوک نظروں سے ہمیں گھورنے لگتا۔ تب ہمیں اپنے گھر میں رکھی 'بیئر' دکھانی پڑتی۔

ایک روز بازار سے ہم مینے کا سودا لے کر آئے۔ حفصہ کارٹن سے مختلف اشیا نکال نکال کر اہلیہ کو دینے لگی۔ اچانک اس کی نظر باریک کنگھی پر پڑی، جو سامان میں نیچے کہیں دبی تھی۔ جس طرح املی یا کھٹائی کے ذکر سے منہ میں پانی بھر آتا ہے، کنگھی دیکھ کر اسے اپنے سر میں کھجلی محسوس ہونے لگی۔ سر کھجاتے ہوئے بولی ''امی، امی کنگھی آئی، کھجلی شروع۔''

ایک دن بولی ''ابو ہمارے اسکول میں سب بچے گاڑی پر آتے ہیں، آپ بھی خرید لیں۔''

ہم نے کہا ''اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ ہمیں گاڑی دے دیں۔''

کچھ دیر بعد بالکونی میں پڑے اپنے کپڑے اٹھانے گئے، تو دیکھا حفصہ آسمان کی طرف منہ کیے دعا مانگ رہی ہے ''اللہ میاں! ہمارے لیے بھی اوپر سے ایک گاڑی پھینک دیں۔''

ایک روز اس کے ہاتھ پر چوٹ لگ گئی اور وہ سرخ ہو گیا۔ غصے میں بھری ہمارے پاس آئی اور کہنے لگی ''ابو، ابو، امی کو دیکھیں، مجھے ہرا جوڑا پہنا رہی ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ لال جوڑا پہنائیں، میری چوٹ اس سے میچ کرے گی، مگر امی سمجھ ہی نہیں رہیں۔''

ایک مرتبہ دونوں بہنیں اپنے اپنے کمروں کا موازنہ کرنے لگیں کہ میرے کمرے میں یہ ہے، تمھارے میں وہ نہیں۔ دونوں میں کافی دیر بحث چلتی رہی۔ سارہ کے کمرے میں زیادہ چیزیں نکلیں۔ حفصہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی ''میرے کمرے میں تو امی اور ابو بھی ہیں۔'' سارہ یہ سن کر مسکرائی اور لاجواب سی ہو گئی۔

اب ذرا حفصہ کے چند معصوم مشاہدے ملاحظہ

www.pdfbooksfree.pk

فرمائیے جنھوں نے ہمیں حیران کر دیا۔

حفصہ چار سال کی ہوئی، تو ہم نے اسے اسکول میں داخل کروایا اور آنے جانے کے لیے وین کا بندوبست کر دیا۔ پہلے دن اسکول سے واپس آئی، تو ہم نے پوچھا ''اسکول کی وین میں مزہ آیا؟''

کہنے لگی ''ہاں بہت مزہ آیا۔ مگر ابو اس میں وہ آدمی، تو تھا ہی نہیں جس کے ہاتھ میں بہت سارے پیسے ہوتے ہیں اور جو بار بار دروازے پر ہاتھ مار کر شور مچاتا رہتا ہے، تھدر تھدر (صدر صدر)۔''

ایک مرتبہ حفصہ کی طبیعت خراب ہوئی۔ رات کو ڈاکٹر کے ہاں گئی، تو وہاں کافی بھیڑ تھی اور بہت دیر سے نمبر آیا۔ اگلے روز اہلیہ نے دوبارہ ڈاکٹر کے ہاں چلنے کو کہا، تو کہنے لگی ''امی! بس نماز مغرب پڑھتے ہی چلیں۔ ڈاکٹر کے ہاں ہجوم نہیں ہو گا کیونکہ اس وقت ساری عورتیں اپنے میاؤں کو چائے دے رہی ہوں گی۔''

ہمارے ایک ہم زلف بنگلہ اور گریڈ بیس میں پروفیسر ہیں۔ ہم نے ایک روز ہوا بھروانے پٹرول پمپ پر گاڑی روکی۔ وہاں ٹائروں میں پنکچر لگانے والے لڑکوں کے منہ پر کالک لگی تھی۔ حفصہ کچھ دیر تو انھیں غور سے دیکھتی رہی کہ یہ کالے کالے سے لڑکے کس سے مل رہے ہیں، پھر حیران سی ہو کر اہلیہ سے کہنے لگی ''امی..... امی! کیا ہمارے خالو بھی ٹائروں میں پنکچر لگاتے ہیں؟''

عمیر نے دفتر جانا شروع کیا، تو اہلیہ اس کا خاص خیال رکھنے لگی۔ وہ صبح جا کر شام کو تھکا ہارا واپس آتا اور پھر رات بھر پڑھتا رہتا۔ حفصہ نے محسوس کر لیا کہ امی اب ہمارے مقابلے میں بھائی کا زیادہ خیال رکھنے لگی ہیں۔ اس سے نہ رہا گیا اور معصومیت سے بولی ''امی..... امی! اگر میں اور سارہ بھی دفتر جانے لگیں، تو پھر آپ ہمارا بھی اسی طرح خیال رکھیں گی؟''

ہمارے بیٹے کو دفتر کی طرف سے ڈیفنس میں مکان ملا، تو ہم لوگ گلشن اقبال سے وہاں منتقل ہو گئے۔ ایک دن ہم نے عمیر سے کہا کہ گھر تو اچھا ہے، علاقہ بھی ٹھیک مگر مسجد بہت دور ہے۔ ہماری فجر کی جماعت ضائع ہو رہی ہے۔ حفصہ نے سنا، تو گھبرا گئی کہ ہم کہیں فلیٹ میں واپس جانے کا پروگرام تو نہیں بنا رہے۔ اس نے اسی وقت ہمیں نو صفحات پر مشتمل ایک طویل خط لکھا، جس میں پہلے تو آپ اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد دلائے گئے اور پھر ہمیں ہماری حیثیت بتائی گئی۔ اس خط کا آخری جملہ کچھ یوں تھا:

''ابو آپ کو لالو کھیت میں چھوٹا سا فلیٹ ملنا چاہیے۔''

ایک مرتبہ ہم نے ایک صاحب کو دورانِ گفتگو بے وقوف کہہ دیا۔ وہ اکڑ گئے اور کہنے لگے ''مجھے پاگل تو بہت سے لوگوں نے کہا ہے، مگر بے وقوف ابھی تک کسی نے نہیں کہا تھا۔'' پھر اچانک انھیں کچھ خیال آیا اور اٹھ کر اندر گئے اور ہمارا خط لا کر دیا کہ اسے پڑھو۔ ہم نے پڑھا تو شرمندہ ہو رہے، کیونکہ اپنے اس خط میں ہم نے انھیں ''مدبر'' کا لقب دیا تھا۔

اسی طرح حفصہ نے کتاب آنے کے بعد خط لکھنے چھوڑ دیے۔ اب اسے جب بھی ہماری کوئی بات ناگوار گزرے، تو چپ چاپ اٹھ کر کمرے میں جاتی اور اپنی کتاب میں ایک رقعہ رکھ کر ہماری طرف بڑھا دیتی ہے۔ مثلاً ''آپ ذرا کتاب کے صفحے ۵۱ اور ۵۰ پڑھ لیجیے۔''

◆○○

www.pdfbooksfree.pk

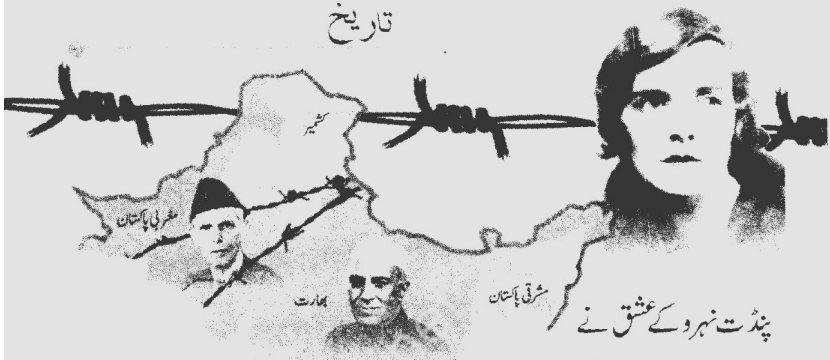

پنڈت نہرو کے عشق نے

پاکستان کو مسلم اکثریتی علاقوں سے محروم کر دیا

انگریز ہندو ملی بھگت کی چشم کشا داستان

رضی الدین سید

تقسیم ہند کا باضابطہ اصول طے پایا، تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کی باہمی رضامندی سے "نیشنل باؤنڈری کمیشن" تشکیل دیا جس کا مقصد دونوں ملکوں کی سرحدوں کی حد بندی کرنا تھا۔ بحث مباحثے سے بچنے کی خاطر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے فریقین سے پہلے ہی ضمانت لے لی کہ کمیشن کے فیصلے پر وہ رضامند ہیں گے۔

لیکن جون ۱۹۴۷ء کے آخر تک بھی کمیشن کا قیام عمل میں نہیں آسکا۔ کمیشن کا چیئرمین "ریڈکلف" تھا جس کے نام پر ہی باؤنڈری کمیشن کا نام بھی رکھا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شخص ۸ جولائی ۱۹۴۷ء ہی کو ہندوستان پہنچا۔ وہ پاک بھارت علاقوں کے جغرافیہ سے بالکل لاعلم تھا۔ ایک اور حیران کن بات یہ کہ ریڈکلف نے اپنا ایوارڈ اس وقت سنایا جب پاک بھارت تقسیم عمل میں آچکی تھی یعنی ۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو!

دو ممالک وجود میں آچکے تھے لیکن ان کی سرحدیں کہاں تک ہوں گی، اس کی کوئی وضاحت ۱۵ اگست تک موجود نہیں تھی۔ فیصلے میں تاخیر کیوں ہوئی، ساری داستان بس اسی بات میں پوشیدہ ہے۔ باؤنڈری کمیشن اس لیے بنایا گیا تھا کہ دونوں ممالک کے علاقے متعین ہو جائیں اور پڑوسی کی حیثیت سے پاک بھارت مل جل کر رہیں۔ کمیشن کا مقصد مستقبل کے سرحدی تنازعات کا خاتمہ

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ لیکن جو کچھ سامنے آیا، وہ توقعات اور مقاصد کے بالکل برعکس تھا۔ سازشی ہندو اور مکار انگریزوں نے پاکستان کو کمزور کرنے بلکہ اسے مٹانے کی خاطر ایک طرف کئی مسلم اکثریتی علاقے خفیہ طور پر بھارت کو عطا کر دیے، دوسری جانب کشمیر کا شعلۂ جوالہ ہمیشہ کے لیے سلگتا چھوڑ گئے۔

معروف دانشور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی تحقیقی کتاب ''جدوجہدِ پاکستان'' میں لکھتے ہیں ''ایسا کوئی ایک علاقہ بھی، جس پر ہندو اپنا جھوٹ موٹ کا حق جتا سکتے تھے، مسلمانوں کے حصے میں نہیں آنے دیا گیا۔ ایسے علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ہندوؤں کے پاس چلے گئے۔ جو نہریں پاکستان کو سیراب کرتی تھیں، ان کی سیرابی کا ہیں (سرچشمہ) ہندوؤں کو مل گئیں... اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسلم اکثریتی ضلع گرداسپور ہندوؤں کے پاس چلا گیا تاکہ انھیں ریاست جموں و کشمیر میں داخل ہونے کا راستہ مل جائے۔''

اس معاملے کی مزید وضاحت تحریکِ پاکستان کے ایک اور کارکن اور ایوارڈ یافتہ مصنف قاضی عبدالمنان مرحوم کرتے ہیں ''جونا گڑھ کی ریاست جو، جس نے پاکستان سے الحاق کیا تھا، بزورِ شمشیر بھارت میں ضم کر دیا گیا۔ اس کے برخلاف ریاست کشمیر جہاں ۸۵ فیصد اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اسے سیاسی، جغرافیائی، معاشی اور قدرتی لحاظ سے پاکستان میں شامل ہونا تھا، نہرو، گاندھی اور ماؤنٹ بیٹن کی ''تگ و دو'' کے نتیجے میں فوج کشی کے ذریعے بھارت کا حصہ بنا لی گئی۔ یہ سب چالیں اس لیے چلی گئیں کہ پاکستان کی بقا ناممکن ہو جائے۔'' (''میرا کاررواں محمد علی جناح''۔ قاضی عبدالمنان۔ ص ۱۷۸۔ رہبر پبلشرز کراچی)

واضح رہے کہ برطانوی وزیراعظم لارڈ کلیمنٹ ایٹلی نے تقسیمِ ہند کی اولین تاریخ ۳۰ جون ۱۹۴۸ء مقرر کی تھی۔ تاہم انجانے معاملات کے باعث تاریخ اچانک نو ماہ قبل یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کر دی گئی۔ بعض کانگریسی مصلحتوں کے پیشِ نظر سردار پٹیل نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مشورہ دیا تھا کہ انتقالِ اقتدار کی طویل مدت گھٹا دی جائے۔ (بحوالہ کتاب فریڈم ایٹ مڈ نائٹ۔ Lorry Collins اور Lappierre۔ ص ۱۹۴)

یہ درج بالا حقائق واضح کرتے ہیں کہ پاکستان کے خلاف سازشیں شروع ہی سے جاری تھیں۔ قاضی عبدالمنان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں ''عبوری انتقالِ اقتدار کی تاریخ کا تعین باؤنڈری کمیشن کے حوالے سے کیا جانا چاہیے تھا تاکہ وہ مقررہ تاریخ سے پہلے اپنا ایوارڈ مکمل کر لیتا کہ کون سے علاقے کہاں جائیں گے۔'' لیکن بدقسمتی سے حد بندی کمیشن کی تقرری ۳۰ جون ۱۹۴۷ء تک نہ ہو سکی جبکہ اس کا خود مختار چیئرمین ریڈ کلف بھی ۸ جولائی کو دلی پہنچا۔'' (میرا کاررواں۔ ص ۵۶۳)۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وضاحت کرتے ہیں ''جو منصوبہ برصغیر کی ہندوستانی سلطنت ختم اور دنیا کے چہرے بدل دینے والا تھا، وائسرائے (ماؤنٹ بیٹن) کے ایک کانگریسی ذہنیت والے مشیر ''وی پی مینن'' اور نہرو کی ملی بھگت سے انجام پایا۔ قائداعظم پر اعتماد کرنے کی ضرورت (ہی) محسوس نہیں کی گئی۔ ان کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا'' (جدوجہد پاکستان۔ ص ۴۱۶)۔

ڈاکٹر قریشی مزید لکھتے ہیں ''آل انڈیا کانگریس کے اجلاس ۱۴ جون ۱۹۴۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اس پر تبصرہ کیا کہ مجھے یقین ہے، اس تقسیم کی زندگی بہت مختصر ہو گی۔'' (ایضاً۔ ص ۴۱۷)

کاش مولانا ابوالکلام آزاد آج حیات ہوتے تو دیکھ لیتے، ۶۶ برس بعد ۱۹۴۷ء کی نسبت معاشی و عالمی لحاظ سے مستحکم پاکستان آج عالمی سطح پر اہم مقام رکھتا ہے اور دنیا کی واحد مسلم

www.pdfbooksfree.pk

اٹیمی قوت بن چکا۔ قاضی عبدالحنان لکھتے ہیں ہندو، انگریز سازش قیام پاکستان کے راستے میں بارودی سرنگ بچھانے کے مترادف تھی۔ اسی مقصد کے تحت پاکستان کی سرحدوں میں کانٹ چھانٹ کی گئی، اس کے آبپاشی نظام کا گلا گھونٹا گیا اور اس کے جنگی سازوسامان (طیاروں، توپوں وغیرہ) کو منتقل نہیں ہونے دیا گیا۔" (ص۔۵۵۹)

انٹرنیٹ کے وکی پیڈیا میں درج ہے: "ریڈکلف نے اپنا کام انتہائی رازداری سے انجام دیا۔ حال یہ تھا کہ بہت سے ہندو یا مسلم دیہاتیوں کو نہیں معلوم تھا کہ ان کا علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا یا انھیں بھارت ہی میں رہنا ہوگا۔ بنگال کے علاقے مرشد آباد اور مالدا کے لوگوں کی اکثریت (۷۰ فیصد) مسلمان تھی اور ان کا یقینی گمان تھا کہ انھیں لازماً پاکستان میں شامل کیا جائے گا اور وہ اس کے شدید خواہش مند بھی تھے۔ ۱۷؍ اگست تک بھی وہ اپنے علاقوں میں جوش و خروش کے ساتھ پاکستان کے پرچم لہرا رہے تھے۔ لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر ان کے علاقے بھارت کے ساتھ ملا دیے گئے۔ گورداسپور کی مسلم آبادی بھی ۵۱ فیصد کے حساب سے اکثریت میں تھی۔ لیکن انہی اسباب کے تحت گورداسپور کو بھی بھارت کے ساتھ ملا دیا گیا۔ واضح رہے کہ اسی ضلع میں قادیانیوں کا صدر مرکز 'قادیان' بھی موجود تھا۔ اس وقت تک قادیانیوں کو سرکاری طور پر مسلم ہی تسلیم کیا جاتا تھا، ہندو وہ بہرحال نہیں تھے۔

"فیروز پور جہاں ستلج اور بیاس کا سرچشمہ تھا، اسے پہلے پاکستان کو دیا گیا۔ بعد میں ایک ہندو راجا کی ایما پر فیصلے میں تبدیلی کرتے ہوئے اسے بھارت کو دے دیا گیا۔ سلہٹ کا تعلقہ کریم گنج بھی بھارت کو ملا جبکہ ۲۰۰۱ء کی بھارتی مردم شماری کے مطابق وہاں اب بھی اکثریت (۵۲.۳) مسلمانوں کی ہے۔

"اس سے بھی خراب معاملہ جموں و کشمیر کے ساتھ ہوا کہ اسے بالکل ہی نظرانداز کر دیا گیا۔ چناں چہ آج تک وہ دونوں ممالک کے درمیان وجہ تنازع بنا ہوا ہے۔

"یہ اہم رپورٹ محض چند افسران پر چھوڑ دی گئی۔ جو

تعارف مصنّف

رضی الدین سید کراچی کے معروف مصنّف و کالم نگار ہیں۔ ان کے تحقیقی و مدلل مضامین پاکستان کے تقریباً تمام بڑے اخبارات و رسائل، بشمول انگریزی روزنامہ ڈان اور دی نیوز وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ملک میں صیہونیت پر مکمل توجہ کے ساتھ مربوط کام کے آغاز کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اس موضوع پر اب تک تقریباً ۱۰ جبکہ دیگر تحقیقی موضوعات پر ۱۲ کتابیں تصنیف و ترجمہ کر چکے جنھیں پڑھے لکھے ہر فرد نے سراہا۔ آپ کی کتب میں (۱) "یہودی مذہب۔ مہد سے لحد تک"، (۲) "دجال"، (۳) "معرکہ عظیم" (۴) "یہودی"، (۵) "بساط عالم کے مہرے"، (۶) "جدید صیہونی جنگ" اور (۷) "تحریک حقوق نسواں" شامل ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

یہ ہے کہ اس ضمن میں اقوام متحدہ کو بھی بیچ میں نہیں ڈالا گیا۔" (حالانکہ تقسیم ہند کے بعد نہرو نے کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ ہی کے سپرد کیا)۔ انسائیکلو پیڈیا مزید لکھتا ہے:

"ایوارڈ میں درون خانہ کئی تبدیلیاں کی گئیں۔ اگرچہ رپورٹ انتہائی خفیہ رکھی گئی لیکن نہرو، پٹیل اور مینن کی وساطت سے اس کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔

وکی پیڈیا کا مضمون وضاحت کرتا ہے کہ ریڈکلف کے اعلان اور پھر واپس لندن روانگی کے بعد سر ریڈکلف نے اس ایوارڈ کے تمام کاغذات جلا کر ضائع کر دیے۔

ان حقائق کے بعد اب یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ۱۶ راگست کو جب ریڈکلف فیصلہ (ایوارڈ) سامنے آیا اور جس میں بددیانتی سے پاکستان کا رقبہ کم کر دیا گیا' تو قائداعظم نے اسے خاموشی سے کیسے برداشت کر لیا اور بھارت کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہ کی؟

جواب یہ ہے کہ جب پاکستان معرض وجود میں آیا، تو وہ کمزور، مفلوک الحال، اقتصادی ابتری کا شکار اور فوجی ساز وسامان سے یکسر محروم تھا۔ اس وقت سوائے زبانی کلامی احتجاج کے اور دوسرا کوئی اقدام اٹھانا ممکن نہ تھا۔ عقل بھی تسلیم کرتی ہے کہ اس وقت کوئی فوجی کارروائی کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوتا۔ تاہم ایوارڈ آنے کے بعد قائداعظم نے اس پر احتجاج ضرور کیا۔ اس ضمن میں برطانیہ میں پاکستانی سفارت خانے کے سابق سیکرٹری اطلاعات قطب الدین عزیز حقیقت احوال سے واقف ہیں۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ نتائج میں یہ تبدیلی مسٹر ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کی پس پردہ سازشوں کے تحت ہوئی۔ ان دونوں کا خفیہ معاشقہ مدت سے جاری تھا۔ (جس کی تائید ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی اپنی مذکورہ کتاب میں کی ہے)۔ اسی دوستی کے باعث لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے ایوارڈ میں تبدیلی کے لیے اپنے وائسرائے شوہر پر دباؤ ڈالا۔ قطب الدین عزیز مزید کہتے ہیں کہ پنجاب کا علاقہ فیروز پور ایک بہت بڑا فوجی ڈپو اور آبپاشی نظام کا ہیڈ ورکس تھا۔ اسی باعث یہ علاقہ بھی پاکستان کے نقشے سے منہا کر دیا گیا تاکہ اسے ناقابل بیان نقصان پہنچایا جا سکے۔

قائداعظم تک جب یہ فیصلہ پہنچا' تو وہ سکتے میں آ گئے۔ قطب الدین عزیز بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر راہنمائے قوم نے ردِعمل میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا "ہمیں ممکنہ حد تک سکیڑ دیا گیا ہے۔ باؤنڈری کمیشن نے ہم پر یہ آخری وار کیا ہے۔ اس ایوارڈ کو سراسر غیر منصفانہ، ناقابل تصور اور متصادمانہ فیصلہ ہی گردانا جائے گا۔ لیکن چونکہ ہم نے باؤنڈری کمیشن کے قیام پر اپنی تائید و منظوری کا سرکاری اعلان کر دیا تھا، اس لیے اب اسے تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ اس آخری جھٹکے کو بھی ہم ان شاءاللہ استقلال، جذبے اور امید کے ساتھ باعزت برداشت کر لیں گے۔" (دیکھیں قطب الدین عزیز کی کتاب (Jinnah and the Battle of Pakistan) کراچی۔ باب ۱۰)

یاد رہے کہ کمیشن کے ایک مسلم رکن، منیر احمد اپنی فطرت کے اعتبار سے لبرل تھے اور جو بعد میں چیف جسٹس آف پاکستان بھی مقرر ہوئے۔ ہماری مراد چیف جسٹس منیر احمد سے ہے۔ نجانے متنازع ایوارڈ پر انھوں نے دستخط کیوں کر دیے؟

یہ واضح ہے کہ ایسے موقع پر قائداعظم کی جگہ کوئی اور سربراہ بھی ہوتا' تو احتجاج کے علاوہ کچھ اور نہ کر پاتا۔ کیونکہ اس وقت پاکستان معاشی و عسکری لحاظ سے کمزور حالت میں تھا۔ اس لیے باؤنڈری کمیشن کے معاملے میں قائداعظم پر انگلی اٹھانا حقائق سے ناواقفیت، مطالعے کی کمی اور تعصب و جانبداری کا مظہر ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

سچا واقعہ

سبھی کے سامنے چل بسنے والی

مردہ دُلھن زندہ ہوگئی

انسانی جذبات کی پُراسرار بھول بھلیوں میں جنم لینے والا حیرت انگیز ماجرا

نابید ہاشمی

یہ واقعہ غیر معمولی نوعیت کا تو نہیں پھر بھی اس کی صداقت پر قدرے شبہ ہو جاتا ہے۔ یہ شبہ دور کرنے کے لیے میں ہر ممکن کوشش کروں گی۔

نانی مرحومہ بیان کرتی تھیں کہ یہ واقعہ سچ ہے۔ اس کے علاوہ ابھی اس واقعے کے چند عینی شاہد زندہ ہیں جن میں میرے نانا جان بھی شامل ہیں۔

اس وقت نانی اماں، بانو کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اٹھان اچھی تھی اس لیے اپنی سب رشتے دار بہنوں سے بڑی نظر آتیں۔ والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ آٹھ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے ناتے وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ اللہ نے صورت کے ساتھ سیرت بھی اچھی دی۔ ساتھ ہی دولت بھی گھر کی لونڈی تھی۔

یوں سمجھ لیں کہ خاندان کے لڑکے ان کے دیوانے تھے۔ ہر گھر کی یہی خواہش تھی کہ بانو ان کے گھر کی بہو

www.pdfbooksfree.pk

بنے۔ ساتھ کی ہر لڑکی کی شادی ہو چکی تھی، لیکن نہ ہوئی، تو بانو کی۔ دراصل جس رشتہ کے لیے حامی بھرتے، دوسرا خواہشمند رشتہ دار فتنہ بازیاں شروع کر دیتا۔ مجبوراً ان کے ابا کو اس رشتے کا خیال چھوڑنا پڑتا۔ وہ چچا کے ہاں پانی بھرتے، تو تایا بگڑ جاتے۔ تایا کو خوش کرنا چاہتے، تو اماں کے نخریال والے منہ پھلا لیتے۔

غیروں میں رشتہ کرنے کو دل نہ مانتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بانو کی عمر بڑھتی گئی۔ ساتھ والیوں کی گود میں بچے کھیلنے لگے، لیکن بانو کی شادی کہیں نہ ہو سکی۔ بانو کچھ دن تو یہ رسہ کشی دیکھتی رہیں پھر لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگنے لگیں۔ اس زمانے میں منہ سے بولنا قیامت تھا، بس اللہ میاں کی گائے ہونے کا خطاب پا کر لڑکی چپ چاپ والدین کی خوشی قبول کر لیتی۔

یہی بانو کے ساتھ ہوا۔ لیکن جوں جوں یہ مسئلہ نازک ہوتا گیا، بانو گھن کی طرح پستی چلی گئی اور پھر بیٹھے بیٹھے دورے پڑنے لگے۔ ہر وقت بخار رہنے لگا۔ چہرے کی ساری شادابی رخصت ہو گئی۔ بخار اور کھانسی نے راستہ دیکھ لیا۔ جب دیکھو بانو سر پر پٹی باندھے چارپائی پر لیٹی رہی۔

پہلے پہل تو گھر والوں نے زیادہ توجہ نہ دی مگر جب چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا، تو ابا کا دل دھڑک اٹھا اور اماں بھی چونک گئیں۔ حکیم کو دکھایا۔ اس نے انھیں بتایا کہ لڑکی کو دق ہو گئی ہے۔ یہ سن کر گھر والوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ حکیم کا منہ بھر کر اسے یہ بات پھیلانے سے منع کیا، لیکن یہ مرض کبھی عارضی دواؤں سے ٹھیک ہوا ہے؟ سدھرنے کے بجائے حالت اور بگڑتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ وہ چھے ماہ کے اندر اندر جلی ہوئی لکڑی بن گئیں۔

آخر یہ بات کب تک چھپتی، سارے رشتے داروں میں پھیل گئی۔ اب تو سارے امیدوار لڑکوں نے اپنی اپنی دکان بڑھانے کی سوچی۔ اب دور دور تک کوئی لڑکا ایسا نظر نہ آتا جو بانو سے شادی کی خواہش رکھتا۔ بانو کے بڑے بھائی فوج میں ملازم تھے۔ وہ جب لمبی چھٹی لے کر گھر آئے، تو بانو کی حالت دیکھ کر گھر والوں پر برس پڑے۔ انھوں نے شہر سے اپنے دوست ڈاکٹر کو بلا لیا۔

ابا کی مخالفت کے باوجود بانو کا ڈاکٹری علاج شروع ہو گیا۔ مریض پر دواؤں سے زیادہ توجہ اثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر کی توجہ نے بانو کے دل میں جینے کی امنگ پیدا کر دی۔ تین ماہ کے اندر اندر کملائی صورت پر بہار کے آثار نظر آنے لگے۔ ڈاکٹر کی محبت بھی گہری ہوتی چلی گئی۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ ڈاکٹر صاحب سے جب معاملہ پوچھا گیا، تو انھوں نے کس چیز کا نذرانہ لینا چاہا۔ گویا بانو مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئی تھی مگر ڈاکٹر صاحب شادی کے بعد انھیں باہر لے جانا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں تبدیلی آب و ہوا کے بعد وہ مکمل ٹھیک ہو جائیں گی۔

مگر اس انکشاف نے خاندان میں آتش فشاں پہاڑ کا منہ کھول دیا۔ منجھلے بھائی سے لے کر ابا تک نے زہر کھا لینے کی دھمکی دے ڈالی۔ اماں نے تو قسم کھائی کہ اگر ایسا ہوا، تو وہ کچھ کھا مریں گی۔ مختصر یہ کہ سوائے بڑے بھائی الطاف کے اور کوئی اس رشتے پر راضی نہ تھا۔

گھر والے ڈاکٹر صاحب کا علاج بتا کر فوراً بانو کی شادی کی کوشش میں لگ گئے۔ اماں کا نالائق بھانجا جائداد کی خاطر اب تک بانو سے شادی کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ اماں نے اسی سے جھٹ منگنی کر ڈالی۔ بانو بچاری منہ سے پھر بھی کچھ نہ بولی۔ لیکن عین نکاح والے دن ایسا

www.pdfbooksfree.pk

واقعہ پیش آیا جس کے متعلق یقین دلانے کے لیے میں ان کی حلفیہ قسم اوپر بتا چکی ہوں۔

گھر میں شادی کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ برات آنے میں صرف ایک پہر باقی تھا۔ بڑے بھائی الطاف ڈاکٹر دوست کے ساتھ شہر چلے گئے۔ انھوں نے شادی میں شریک نہ ہونے کی قسم کھائی تھی۔ خیر ان کی اس دھمکی کا بھلا کس پر اثر ہونا تھا؟ سہ پہر کو اچانک بانو کا دل بری طرح گھبرایا۔ انھوں نے سب سہیلیوں کو چلے جانے کی التجا کی۔ پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے تیورا کر گریں اور پھر نہ اٹھیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ نبضیں ٹٹولیں۔ دل کی دھڑکن گنی چاہی، لیکن وہاں تو ایک خاموشی تھی۔ بانو سب کو چھوڑ کر جا چکی تھیں۔

اب گھر والوں کی آنکھیں کھلیں۔ اماں ابا اپنی بٹ دھرمی پر پشیمان ہوئے۔ اپنی لاڈلی کو لوٹ آنے کے واسطے دے کر رونے لگے۔ رشتے دار الگ شرمندہ کھڑے تھے۔ بھائی بچارے پچھاڑیں کھاتے دکھائی دیتے۔ سب کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ شام برات آنے کے وقت سے کچھ دیر تک میت کو نہلا دھلا کر کفن پہنا دیا۔ غسل پر پھولوں کی چادر ڈال دی۔ ایک آدمی بڑے بھائی کو بلانے شہر گیا ہوا تھا۔ ان کے آنے تک جنازہ اٹھانا ممکن نہ تھا۔ صبح تک لاش اسی حالت رکھی رہی۔

صبح چار بجے بھائی الطاف بھی آ گئے۔ اس غریب نے اپنی لاڈلی بہن کی پھولوں میں لپٹی لاش دیکھ کر سر پیٹ ڈالا۔ اب اس سوگوار جلوس نے بڑے اہتمام سے میت اٹھائی اور صبح پانچ بجے تک قبرستان پہنچے۔ وہیں یہ عجیب واقعہ ظہور میں آیا۔ قبر کھودنے کے بعد الطاف بھائی لحد میں اترے۔ بہن کی لاش کو سہارا دیتے جوں ہی انھوں نے سر کے نیچے ہاتھ رکھا، لاش میں ایک دم حرکت سی پیدا ہوئی۔

ایک ثانیہ کے لیے الطاف بھائی چونک گئے۔ انھوں نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسری بار ابھی ان کا ہاتھ بڑھا بھی نہ تھا کہ بانو کا جسم بری طرح کانپنے لگا۔ یوں لگا جیسے کسی بیمار پر تشنج کا دورہ پڑ گیا۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر سارے لوگ الٹے قدم بھاگ لیے۔ قبرستان میں صرف الطاف بھائی اکیلے رہ گئے۔

ان کا بیان ہے کہ انھوں نے جلدی سے کفن کا کپڑا ہٹایا۔ دیکھا کہ بانو پوری کوشش سے جسم کے ارد گرد لپٹے کپڑے ہٹا رہی ہیں۔ بھائی کو سامنے دیکھ کر انھوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر ایک ٹک دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ بھائی نے سہارا دے کر انھیں اٹھایا اور گھر واپس لے آئے۔ جہاں ماتم کا شور خوف کی دبی دبی سرگوشیوں میں بدل چکا تھا۔

جب غم سے نڈھال والدین کو اپنی لاڈلی کے زندہ ہونے کی خبر ملی اور انھوں نے اسے اپنے قدموں سے بھائی کے ہمراہ گھر آتے دیکھا، تو آپ سوچ سکتے ہیں ان لوگوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ خوف سے بے نیاز ہو کر سب بانو سے لپٹ گئے۔ یہ کہنا اب فضول ہے کہ بانو یعنی ہماری نانی اماں کے شوہر وہی ڈاکٹر صاحب تھے جو اب ہمارے نانا جان کہلاتے ہیں۔ بقول ان کے بانو کو سکتہ ہو گیا تھا یا پھر انھیں نئی زندگی انہی کے لیے ملی۔

بات کچھ بھی ہو، یہ حقیقت ہے۔ یوں بیٹی کی جدائی کا یہ غم بڑے ڈرامائی انداز میں خوشی میں بدل گیا۔ نانی اماں یہ واقعہ سنانے کے بعد ہمیشہ خلاؤں میں گھورنے لگتیں جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

خاکہ

ادیبوں کی آئی ایس آئی اور

اُردو ادب کے محتسب اعلیٰ

دودھاری کاٹ والا تلواری قلم رکھنے والے
مشفق خواجہ المعروف بہ خامہ بگوش کا منفرد تذکرہ

راشد اشرف

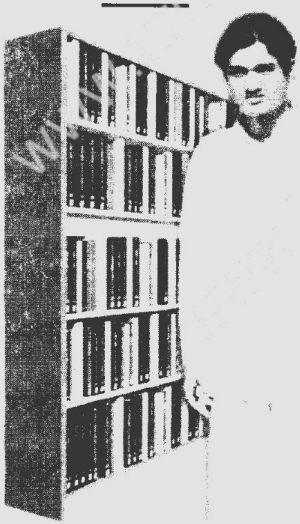

کراچی پٹری کے قریب ایک چھوٹی سی گلی اور اس میں ایک چھوٹا سا مکان جس کے دروازے پر یہ تختی لگی رہتی تھی:

''پیشگی اطلاع کے بغیر زحمت نہ کریں۔''

تختی پر لکھے ہوئے یہ الفاظ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کے بعد مؤثر نہ رہے کہ مذکورہ مکان کا مکین پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کے قبرستان میں جا سویا جہاں اب اس کے کسی بھی ملاقاتی کو ملاقات سے قبل پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ جچے کے بندے سے شروع ہونے والے یہی فون نمبر ۶۶۱۰۶۴۸ پر اب فون کیجیے، تو ایک خاص انداز میں فرمائیے کہ کہہ کر مخاطب ہونے والے کی اہلیہ بھی وہاں نہیں ملیں گی کہ مکان کے مکین بدل چکے:

کس کی خبر اس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ
قبروں تک اپنی کتنے جنازے گئے ہیں آج

معروف نقاد مظفر علی سید نے مشفق خواجہ کی تحریروں کے بارے میں لکھا تھا: ''ہر کتاب کے جنگل میں کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گیدڑ چھپا ہوتا ہے۔ خامہ بگوش کی

www.pdfbooksfree.pk

نظریں نہایت تیزی سے اس گیدڑ کو برآمد کر لیتیں۔''

بقول مختار زمن ''خواجہ صاحب کے اندر بیٹھ ہوا کھلنڈرا بچہ صحیح بات کو اکثر اپنے انداز میں ایسے بیان کر دیتا کہ لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔'' ایک اور موقع پر مظفر علی سید کہتے ہیں: ''ان کی کاٹ اکثر دودھاری ہوتی ہے۔ پہلو داری کا کمال تو یہی ہے کہ ادھر اُدھر کا پہلو نظر نہ آئے لیکن جب دونوں طرف بابا کار چلے، تو پتا چلتا ہے کہ کون کون زد میں آگیا۔''

محمد نگر لاہور میں ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کے دن پیدا ہونے والے عبدالحئی کو دنیائے اردو ادب میں مشفق خواجہ کے نام سے جانا گیا۔ ادبی حلقوں میں وہ خامہ بگوش کے نام سے مشہور تھے۔ مشفق خواجہ کے انتقال کے بعد یوں محسوس ہوا کہ ایک عہد انہی کے ساتھ تمام ہوگیا۔ بقول انور سدید ''مشفق خواجہ کے انتقال پر وہ لوگ زیادہ روئے جن پر خامہ بگوش نے زیادہ سخت کالم لکھے تھے اور جنھیں بار بار اپنے کالم کا موضوع بنایا۔ انھیں غم یہ ہے کہ اب اتنے شگفتہ انداز میں ان کا تذکرہ اپنے کالموں میں کون کرے گا۔''

مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالرحمان طارق کے مطابق انھوں نے بھائی کی موت پر غیروں کو بھی پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔ مشفق خواجہ کے بعد شہر کراچی سے علم کا سایہ اٹھ گیا۔ بقول شخصے، شہر کا حافظہ چھن گیا۔ وہ اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود نہ صرف بہت سے معذور اور بیمار ادیبوں و شاعروں کی مالی مدد کرتے بلکہ مرحومین کی بیوؤں اور بچوں کی مالی اعانت بھی کیا کرتے تھے۔

ایک ادارے نے ان کا وظیفہ دس ہزار روپے مقرر کیا تھا جو ہر چھے ماہ بعد یک مشت ادا کیا جاتا۔ خواجہ طارق بیان کرتے ہیں کہ یہ رقم ملتے ہی ان کے بھائی پہلے ہی سے مرتب شدہ فہرست کے مطابق اسے مستحق احباب میں تقسیم کر دیا کرتے۔ خواجہ عبدالرحمان طارق کے بقول مشفق خواجہ کے پاس ڈھائی سو کے قریب ایسے مقالات تھے جنھیں وہ خود شائع کرنا چاہتے تھے۔

خواجہ عارق نے اپنے ایک مضمون جہاں اپنے چہیتے بھائی کے بارے میں کئی دلچسپ باتیں بیان کی ہیں وہاں مشفق خواجہ کی کالم نویسی کے نتائج کے ایک پریشان کن پہلو سے بھی قارئین کو آگاہ کیا۔ پہلے مشفق خواجہ کا اپنی کالم نویسی سے متعلق یہ تبصرہ ملاحظہ ہو: ''جس قسم کے خطوط (گم نام اور دھمکی آمیز) ہمارے نام آتے ہیں، اگر کسی دوسرے کے آئیں، تو کالم نویسی ہی کیا، شہر بھی چھوڑ دے اور کسی جنگل میں جا کر بقیہ زندگی یاد الٰہی میں گزارے۔''

ایک مرتبہ مدیر ظرافت، ضیاالحق قاسمی مرحوم خواجہ صاحب کے پاس اپنا مجموعہ کلام بغرض تبصرہ (فلیپ پر لکھوانے) لائے۔ بقول مشفق خواجہ ''میں نے کلام دیکھا تو اسے ہر قسم کی رائے سے بے نیاز پایا۔'' قاسمی صاحب کے شدید اصرار پر خواجہ صاحب نے لکھا کہ اس مزاحیہ کلام کو پڑھ کر ہمیں کلام پر نہیں شاعر پر ہنسی آئی کہ انھوں نے ایک ایسے کام پر محنت کی ہے جو ان کی بساط سے باہر ہے۔ اس پر ضیاالحق قاسمی باقاعدہ طور پر مشفق خواجہ سے ناراض ہوگئے۔

مشفق خواجہ کراچی کے اخبار جسارت اور ہفت روزہ تعمیر میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۹۷ء کو اپنا آخری کالم لکھنے کے بعد انھوں نے مکمل طور پر اس شغل سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ خواجہ صاحب نے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں بی

www.pdfbooksfree.pk

اے (آنرز) اور ۱۹۵۹ء میں ایم اے (اردو) کیا۔ ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۷۳ء تک اس ادارے میں خدمات انجام دیں۔

انجمن میں انھیں مولوی عبدالحق کے ساتھ کئی برس کام کرنے کا موقع ملا۔ اردو مخطوطات پر کام کیا۔ یاس یگانہ چنگیزی کی کلیات مرتب کی۔ انجمن ترقی اردو کے جرائد ماہنامہ اردو اور ماہنامہ قومی زبان کی ادارت کی۔ جریدہ قاموس الکتب کے مدیر بھی رہے۔ برصغیر کے اہم کتب خانوں میں مشفق خواجہ کا کتب خانہ اہم ترین شمار کیا جاتا ہے۔ اس کتب خانے سے ہندو پاک کے کم و بیش پچاس افراد بشمول مشاہیر ادب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے سلسلے میں استفادہ کیا۔

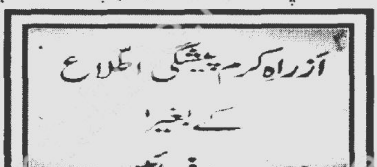

مذکورہ کتب خانے میں لگ بھگ بائیس ہزار کتب اور بارہ ہزار سے زائد رسائل و جرائد موجود ہیں۔ خواجہ عبدالرحمن طارق کے مطابق مشفق خواجہ ہزاروں روپے کی کتابیں خرید کر ہندوستانی لائبریریوں کو بھجواتے تھے۔ ان میں خدا بخش لائبریری پٹنہ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، جامعہ ملیہ لائبریری دہلی اور مولانا آزاد نیشنل لائبریری حیدر آباد دکن شامل ہیں۔ اس بات کا تذکرہ اہم ہے کہ مذکورہ کتب خانے میں مشفق خواجہ کے خطوط، ان کی غیر مطبوعہ تحریریں، ذاتی ڈائریاں، تصویریں اور مخطوطات اب موجود نہیں۔ یہ خزانہ اب ان کے اہل خانہ کے پاس ہے۔ اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ (مشفق خواجہ کی اہلیہ ان دنوں سخت علیل ہیں۔)

شاعر مشفق خواجہ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گیا

پہلے ہی تازہ ہوا آتی تھی کم، اس پر ستم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اونچا کر لیا

راہ کے مصائب سے تھک کے بیٹھنے والے
زندگی سفر میں تھی، زندگی سفر میں ہے

کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ مشفق خواجہ نے اپنی زندگی میں اپنا نادر روزگار کتب خانہ محفوظ کرنے کی خاطر اردو ریسرچ لائبریری کنسورشیم (یونیورسٹی آف شکاگو کنسورشیم) سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس کی رو سے مذکورہ کتب خانہ لائبریری کنسورشیم کو فروخت کر دیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ناصر جاوید کتب خانے کے معاملات کے نگران ہیں۔

کتابوں کی کیٹلاگنگ کا کام اس وقت سے مستقل جاری ہے۔ کتب خانے کا نیا نام مشفق خواجہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر قرار پایا ہے۔ یہ کتب خانہ ۲۰۰۸ء میں وقف کے طور پر رجسٹر کرا دیا گیا۔ علم و ادب سے شغف رکھنے والے احباب کے لیے یہ خوش کن خبر ہوگی کہ اس کتب خانے کو آن لائن کیے جانے کے منصوبے پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ کام کی تکمیل کے بعد دنیا میں کسی بھی جگہ سے اس سے استفادہ کیا جا سکے گا۔

مشفق خواجہ نجی محفلوں میں بھی اپنے شگفتہ تبصروں کی

www.pdfbooksfree.pk

وجہ سے مرکزِ نگاہ رہتے۔ راشد شیخ سے روایت ہے کہ ایک محفل میں ایک صاحب کافی دیر سے اپنی تعریف میں باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے بے اختیار انھیں اپنا ماضی یاد آ گیا اور فرمانے لگے ”ہمارے بچپن کا زمانہ بھی کیا سستا زمانہ تھا، دایہ بچہ جنوا تھوڑا سا گڑ اور آٹھ آنے لے کر خوش ہو جاتی تھی۔“

مشفق خواجہ اُن صاحب کی باتیں پچھلی صف میں بیٹھے سن رہے تھے۔ یہ جملہ سنتے ہی انھوں نے بے اختیار کہا ”اور آٹھ آنے میں بچے بھی آپ جیسے ہی پیدا ہوتے تھے۔“

عطا الحق قاسمی نے ایک مرتبہ مشفق خواجہ سے پوچھا کہ دوزخ مذکر ہے یا مونث؟ خواجہ صاحب نے جواب دیا ”میرا خیال ہے مونث ہے کیونکہ لوگ اس کے عذاب سے واقف ہوتے بھی اسی کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔“

خواجہ صاحب خود پر بھی فقرہ کسنے سے نہ چوکتے۔ مبین مرزا بیان کرتے ہیں کہ ایک بار ہندوستان سے ایک خاتون اور اس کا شوہر ملنے آئے۔ دونوں تدریس کے شعبے سے واقف تھے اور پہلی مرتبہ مشفق خواجہ سے ملے۔ تھوڑی دیر تک تو فضا میں اجنبیت اور تکلف کا تناؤ سا رہا۔ پھر خاتون نے ذرا بے تکلفی اختیار کرتے ہوئے کہا ”خواجہ صاحب ہم تو آپ کے پاس آتے ہوئے ڈر رہے تھے۔“

مشفق خواجہ نے دریافت کیا ”کیوں؟“

خاتون بولیں ”ہم نے تو سنا تھا کہ آپ پنجابی ہیں لیکن آپ سے مل کر اطمینان ہوا۔ آپ کے لب و لہجے، مزاج اور لباس سے کسی طرح ایسا نہیں لگتا۔“

خواجہ صاحب نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا ”ابھی بس تھوڑی دیر بعد دیکھیے، میری حرکتوں سے معلوم ہو جائے گا۔“

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جن مشاہیرِ ادب کو نہایت تواتر کے ساتھ تختۂ مشق بنایا، ان میں سرِفہرست جوش ملیح آبادی، نظیر صدیقی، مظہر امام، انور سدید، منظر علی خاں منظر، قمر جمیل، انیس ناگی، باقر مہدی، بشیر بدر، استاد اختر انصاری، اکبر آبادی، سلطان جمیل نسیم اور ساقی فاروقی شامل ہیں۔ باقر مہدی اور مظہر امام تو باقاعدہ طور پر مشفق خواجہ سے ناراض ہو گئے، اتنے کہ خواجہ صاحب کو ان سے معذرت کرنی پڑی۔

لطف علی خان، ادا جعفری، مشفق خواجہ اور نور الحسن جعفری

واضح رہے مشفق خواجہ کے کالم طنز و مزاح سے بھرپور ہوتے تھے، کوئی ایک کالم بھی ایسا نہیں جس میں کوئی کٹیلا پن نہ چھپا ہو۔ لیکن چند کالم ہی ایسے تھے جن میں محض دنیا سے گزر جانے والوں کی دل کی گہرائیوں سے توصیف کی گئی۔ ان شخصیات میں محمد صلاح الدین، منظر علی خاں منظر، استاد اختر انصاری اکبر آبادی کی وفات پر لکھے کالم شامل ہیں۔

کالموں کے تیر اثر جملے

مشفق خواجہ کے قلم سے نکلے چند یک سطری تبصرے ملاحظہ ہوں جنھیں ان کے شگفتہ کالموں سے منتخب کیا گیا۔ یہ وہ کالم ہیں جو ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۷ء تک کراچی

www.pdfbooksfree.pk

کے اخبار جسارت اور ہفت روزہ تکبیر میں شائع ہوئے۔

☆ مہذب ملکوں میں جن کاموں پر سزا دی جائے، ہمارے ہاں انہی کاموں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔

☆ کتاب کو ایک نشست میں پڑھ ڈالا، یہ سوچ کر کہ جو گزرتی ہے وہ ایک ہی مرتبہ گزر جائے۔

☆ ہم نے آج تک کسی محقق کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں کوئی معقول کتاب نہیں دیکھی۔

☆ جب ابن انشا کو اپنی کوئی طبع زاد نظم پسند نہیں آتی تھی، تو اس پہ یہ لکھ دیتے چینی زبان سے ترجمہ کی گئی ہے۔

☆ ایک زود نویس ادیب سے کسی نے پوچھا، آپ اتنا لکھتے ہیں، کبھی تھکتے نہیں؟ انھوں نے فرمایا: یہ کام میرے پڑھنے والے کرتے ہیں۔

☆ منظر علی خاں منظر کی ہر نئی کتاب کا بوجھ گنا ہوں کے بوجھ سے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ کتاب کو نہ صرف پڑھنا بلکہ اس پر کالم لکھنا پڑتا ہے۔

☆ یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر جرمانہ ہونا چاہیے، ان پر اب انعامات ملتے ہیں۔

☆ ایک زمانہ تھا کہ لوگ دور دراز مقامات کے سفر نامے لکھتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ بعض لوگ اپنے مکان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جائیں، تو سفر نامہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

☆ محقق اکرام چغتائی سے ہم نے عرض کیا کہ آپ نے واجد علی شاہ کی بیویوں پر کچھ زیادہ ہی تحقیق کر ڈالی، اتنی تحقیق تو ان پر خود واجد علی شاہ نے نہیں کی تھی۔

☆ جب نوٹ دھڑا دھڑ چھپتے ہیں، تو افراط زر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کتابیں دھڑا دھڑ چھپتی ہیں، تو ادب افراط و تفریط کے مسئلے سے دوچار ہو جاتا ہے۔

☆ عطا الحق قاسمی کے سفر نامے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ عطا تو سفر سے واپس آجاتے ہیں، لیکن قاری کو واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔

☆ راغب مراد آبادی کا کلام عروضی غلطیوں اور غیر عروضی خوبیوں سے پاک ہوتا ہے۔

☆ جوش کے کلام سے صحت زبان کی سند، تو لی جا سکتی ہے، ذہنی صحت مندی کے لیے کوئی راہنمائی نہیں ملتی۔

☆ اقبال اکیڈمی کو کراچی بدر کر کے لاہور کے سپرد کر دیا گیا، حالانکہ اس شہر میں اقبال کا مزار پہلے سے موجود تھا۔ اقبال اکیڈمی کی وجہ سے ایک ہی شہر میں علامہ کے دو مزار بن گئے۔

☆ افتخار عارف کو قاموس الاغلاط ضرور مرتب کرنی چاہیے۔ یہ کام ان کے لیے نسبتاً آسان ہوگا۔ اس کے لیے مثالیں تلاش نہیں کرنی پڑیں گی، اپنے کلام ہی سے مل جائیں گی۔

☆ قمر علی عباسی کے کالم جس اخبار میں چھپتے ہیں، اس میں جرائم کی خبروں کے بعد یہی ایک پڑھنے کی چیز ہوتی ہے۔

☆ آج کل بہترین مزاحیہ ادب فلمیوں اور دیباچوں کے ذریعے منظر عام پر آتا ہے۔

☆ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی میں اگر صلح ہو گئی تو انور سدید کیا کریں گے؟ ان کے پاس تو مضامین نو کے انبار لگانے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں رہے گا۔

☆ علمی و ثقافتی ادارے علامتی نہیں، سچ مچ کے مزار ہیں جن میں علوم و فنون دفن کر کے سیاسی سرگرمیوں کے مراکز میں تبدیل کر دیا گیا اور گورکنوں ہی کو اگلے گریڈ میں ترقی دے کر مجاور بنا دیا گیا ہے۔

☆ یہ احمد فراز کی سعادت مندی کی انتہا ہے کہ فیض کے انتقال کے بعد بھی وہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی

www.pdfbooksfree.pk

کام نہیں کرتے۔

☆ انیس ناگی بے مثال دیدہ دلیری سے سچ بولتے ہیں۔ ایسی دیدہ دلیری تو پیشہ ور جھوٹ بولنے والوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

☆ عہد میر میں صرف دہلی میں پانچ ہزار شاعر تھے اور آج لاہور کے تھانہ انارکلی کی حدود میں اس سے زیادہ شاعر مل جائیں گے۔

☆ غزل کی صنف پر شاعروں نے جو ستم توڑے ہیں اگر انھیں بیان کیا جائے، تو چنگیز اور ہلاکو کے مظالم کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ چنگیز اور ہلاکو ظلم کرتے کرتے کبھی کبھار تھک بھی جاتے تھے، غزل گو ہر لحظہ تازہ دم رہتے ہیں۔

☆ عام ادبی تحریریں پڑھنے سے پہلے ہم عمداً آنکھیں بند کر لیتے ہیں، لیکن کوئی تحقیقی مقالہ دیکھ کر آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔

خواجہ صاحب دو شعرا رضی اختر شوق اور اختر انصاری اکبرآبادی کے ساتھ

☆ جس طرح سرکاری ملازموں کو نا کارکردگی کی بنا پر جبری ریٹائر کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ادب میں بھی جبری ریٹائرمنٹ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔

☆ جو شعرا کسی موجہ صنف سخن میں کمال نہیں دکھا سکتے، وہ ہائیکو کے ذریعے صاحب کمال بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری نے مشفق خواجہ کے اسلوب کے بارے میں کیا خوب بات کہی تھی، وہ ادب دوست، لاہور کے جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

رسالہ کتاب نما، دہلی میں مشفق خواجہ کا یہ جملہ ان کی ہر تحریر کے آغاز میں درج تھا:

''خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا لطف اٹھائیے۔''

آخری سفر

اردو زبان و ادب کے اس محتسب اعلیٰ اور بقول شخصے ادیبوں کی آئی ایس آئی، مشفق خواجہ نے ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء رات ساڑھے دس بجے کراچی کے آغا خان اسپتال میں دارفانی کو لبیک کہا۔ ان کا جنازہ ۲۲ فروری کو سی ویو کانفنٹن کراچی میں واقع ان کی بڑی بہن کے گھر سے اٹھایا گیا۔ عصر کے وقت سوسائٹی کے قبرستان میں اپنے والدین کے پہلو میں تدفین ہوئی۔

پرستاروں کی بڑی تعداد تدفین کے وقت موجود تھی۔ وہ علم و دانش کے پیکر کو سپرد خاک کرنے آئے تھے۔ لوگوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، بعض پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ مبین مرزا بیان کرتے ہیں:

''نماز جنازہ کے لیے وضو کر کے آتے ہوئے میں نے دو آدمیوں کو گفتگو کرتے سنا۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھا: ''یار! اگر اب اردو اور ادب کے بارے میں کچھ پوچھنا پڑا، تو کس کے پاس جائیں گے؟''

مشفق خواجہ کا قطعہ تاریخ وفات ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے کہا:

تھا بسکہ غنیمت دم مشفق خواجہ
کیسے نہ کریں ماتم مشفق خواجہ
بے سر ہوا، علم اور بے پا تحقیق
ہاتف جو پکارا غم مشفق خواجہ

www.pdfbooksfree.pk

پُراسرار کہانی

قبر کی ہولناک تاریکی سے

مُردے کا ٹیلی فون

وہ لالچ و ہوس میں ایسے اندھے ہوئے کہ عقل سے پیدل ہو کر
گور کنارے جا سوئے..... حیرت و اسرار کے پردوں میں لپٹی کتھا

سلیم اختر

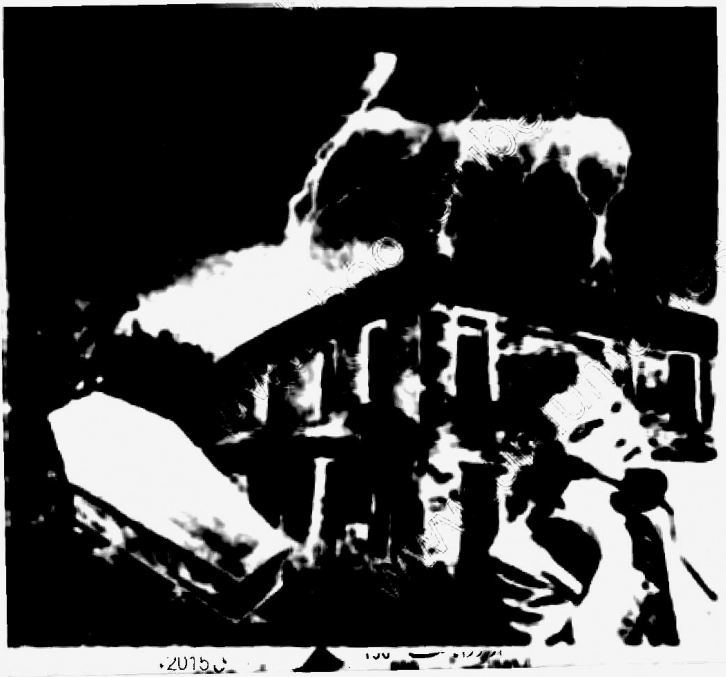

www.pdfbooksfree.pk

"جمیلہ! ہم منزل پر آ پہنچے۔"

کار جس ویران راستے پر رکی وہاں خود رو گھاس نے جھاڑیوں کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ جبار نے آنکھوں میں تمام منظر سموتے ہوئے کہا "یہ ہے وہ گھر جس سے میرے بچپن کی تمام اچھی اور بری یادیں وابستہ ہیں۔" وہ خاموشی سے دھند میں لپٹے مکان کو گھورتا رہا اور پھر بولا "میں چودہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگا تھا اور آج، آج یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دوسرے جنم میں گھر کو دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ گھر؟" جمیلہ کی حیران آنکھیں اس پرانے کھنڈر نما مکان کو گھورنے لگیں جس کی کھڑکیاں ٹوٹی پھوٹی اور چوبی ستون دیمک زدہ تھے۔ مکان کا نصف حصہ درختوں کے جھنڈ میں روپوش تھا اور نظر آنے والے حصے پر خشک بیلیں کسی سادھو کی بے ترتیب زلفوں کے مانند پھیلی ہوئی تھیں۔

چاروں طرف خاموشی تھی، دھند غیر مرئی آسیب کی طرح گردوپیش پر چھا رہی تھی۔ اس سناٹے کو کائیں کائیں کرتے کوؤں کی ایک ٹولی نے توڑا۔ جمیلہ کانپ اٹھی۔ وہ بدصورت نہ تھی لیکن وحشت ناک ماحول کے اعصابی تناؤ کی بنا پر چہرہ جیسے کھنچ کر رہ گیا۔ "نہیں جبار! تم مذاق کر رہے ہو۔" وہ بولی۔

اس خاموشی میں جبار کا قہقہہ بھی عجیب وحشت ناک تھا۔ "جمیلہ جان! تم میری عادت سے واقف ہو۔ میں روپے پیسے کے معاملے میں کبھی مذاق نہیں کرتا۔"

جبار کا قد لمبا اور جسم ورزشی تھا۔ لمبے چہرے پر تیکھی ناک اور چھوٹی مگر تیز چمکیلی آنکھیں۔ شام کے دھندلکے میں اس کے دانتوں کی چمک سے کوئی خوشگوار احساس نہ ابھرا۔ "میں نے تمھیں چلتے وقت ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنی وراثت کا روپیہ وصول کرنے جا رہا ہوں۔ بھلا میں اس جگہ کو بھول سکتا ہوں؟ یہ قصبے کا اختتام ہے۔ اس کے بعد آبادی ختم ہو جاتی ہے اور آگے صرف جنگل اور دلدلی زمین ہے۔" وہ بولا۔

اس نے بستر بند اٹھا کر، اٹیچی کیس اٹھانے کے لیے جمیلہ کو اشارہ کیا۔ اس نے بددلی سے اٹھا لیا۔ "مگر جبار! مجھے یقین ہے کہ اس کھنڈر میں تمھاری وراثت کا کوئی پیسہ نہیں۔ لاحول ولا! بھلا اس بھوت بسیرے میں روپے پیسے کا کیا کام؟" وہ کہنے لگی۔

"مگر مجھے پکا یقین ہے۔" جبار کے پاؤں تلے سوکھے پتے چٹخنے کی آواز جمیلہ کو ناگوار لگ رہی تھی۔ وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا "تم نے سنا نہیں تھا کہ ستار کا چھے ماہ قبل انتقال ہوا ہے۔ اس کی موت کے وقت یہاں سب کو یقین تھا کہ میں مر چکا ہوں اس لیے چچا کے ہزاروں روپوں کی مالک چچی صادقہ بن رہی ہیں۔ چچی کے علاوہ اور کوئی رشتے دار موجود ہی نہیں لیکن میں تو زندہ ہوں۔ اور کیا چچی کے مقابلے میں بھتیجے کا حق فائق نہیں؟ [illegible] نہیں؟" وہ اب سال خوردہ دروازے کے سامنے تھے جس کے بند واڑوں کو جمیلہ مشکوک نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

جبار نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آگے دیکھتے ہوئے کہا "آؤ اب اندر چلیں اور ذرا چچی سے بھی تعارف تو کرائیں۔"

دروازے کے پیچھے سے کسی کے پکارنے کی آواز آ رہی تھی۔

"میرے مولا! میرے بیٹے کو لوٹا دے۔"

یہ بوڑھی مگر کپکپاتی آوازیں تھیں۔ جبار نے اپنی بیوی کو بتایا "اس گھر کی ایک چچی صادقہ ہے یہ [illegible] ہیں، یہ غم کے پیچھے [illegible]

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر ششدر رہ جائیں گی، کیونکہ وہ تو مجھے مردہ سمجھے بیٹھی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔

بند کمرے میں ٹیبب سی گھٹن اور بُو تھی۔ قدیم طرز کے شیشوں والے پلنگ، پرانی وضع کے طاق، فرسودہ پردے، کمرے کی ہر شے عہد پارینہ کا نشان تھی۔ دونوں بوڑھیوں نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ خالہ بے نور آنکھوں سے انھیں گھور رہی تھی مگر اس کی ناتواں چچی نے بڑے سکون سے دریافت کیا۔ ''تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

جبار نے اپنے بارے میں بتایا!

وہ اسی طرح پرسکون لہجے میں بولی ''جبار..... وہ..... وہ تو کب کا مرکھپ چکا۔ پانچ سال پہلے ایک ڈاکے میں دیہاتیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ستار نے یہ خبر خود اخبار میں سے پڑھ کر ہمیں سنائی تھی۔''

جبار ہنسا، بولا ''چچی، یہ تو محض خوش خیالی ہے۔ دیکھ لیں آپ کے سامنے زندہ سلامت کھڑا ہوں۔ یہ جمیلہ ہے میری بیوی۔''

''آداب چچی۔'' جمیلہ نے غیر یقینی لہجے میں سلام کیا۔

''ہوں۔'' اس کی خالہ نے نہ دیکھنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

جمیلہ نے کچھ کہنا چاہا، مگر چچی کی بات شروع ہو چکی تھی ''جمیلہ میری بیوی۔'' وہ اس کے لہجے کی نقل اتار رہی تھی۔ ''ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔'' جمیلہ نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر جبار نے اسے روک دیا۔ چچی کہے جا رہی تھی۔ ''جمیلہ ہے تو خوبصورت مگر جادوگرنی ہے، کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ بھی مر چکی۔''

یہ سن کر جمیلہ کو تو آگ لگ گئی، تنک کر بولی ''مجھے مردہ کہنے سے تمھارا کیا مطلب؟ جبار! یہ تو پاگل ہے۔ یہ تم کس پاگل خانے میں لے آئے ہو مجھے؟''

مگر چچی نے جیسے کچھ نہ سنا ہو، وہ اسی پرسکون لہجے اور کھوکھلی آواز میں کہے جا رہی تھی۔ ''جبار مر چکا۔ آج سے پانچ برس قبل ایک ڈکیتی میں مارا گیا تھا..... بچی تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتیں کہ زندوں کے ساتھ زندہ اور مردوں کے ساتھ مردے رہتے ہیں..... اگر وہ مر چکا، تو تم بھی مردہ ہی ہو نا۔''

جمیلہ وحشت سے پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جبار نے کہا ''چچی اب بس کرو اس ڈرامے کو۔ ہم دونوں زندہ ہیں اور تم دیکھ بھی رہی ہو۔''

''ہوں۔'' خالہ جیسے اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔

چچی جیسے فتح یابی کے احساس سے چلائی۔ ''اگر تم واقعی زندہ ہو، تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟ تمھیں یاد نہیں کہ آوارگی کی وجہ سے تمھارے باپ نے تمھیں گھر سے نکالا تھا۔ اور کیا تمھیں یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے کہا تھا، تم زندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ تو کیا تم یہاں دفن ہونے آئے ہو؟''

جبار ہنس کر بولا ''چچی! میں نہ دفن ہونے آیا اور نہ تم زندہ جنازوں کو دفنانے۔ میں تو اپنی وراثت کی رقم لینے آیا ہوں۔'' اس نے تمام تفصیلات بتائیں۔ ''ستار مر چکا اور اب تمام دولت پر صرف میرا حق ہے۔''

خالہ خاموشی سے اپنی چندھی آنکھیں لیے خوفزدہ بلی کی طرح بیٹھی تھی۔ چچی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں! ستار مر چکا۔ تمھیں بھی ستار کی موت کا علم ہو گیا۔ ظاہر ہے، مرنے کے بعد اس کی تم سے ملاقات ہوئی ہو گی۔ اس نے وراثت کی رقم کے بارے میں بتایا ہو گا۔''

www.pdfbooksfree.pk

اب جبار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، وہ چلا کر بولا ”چچی! بیکار باتیں بند کرو۔ ہم بھوکے ہیں اور بس کے سفر نے انجر پنجر ڈھیلا کر دیا ہے۔“ اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ خالہ تو جیسے اپنی جگہ دبک گئی۔ وہ بولا ”ہم دوسری منزل کے کمرے میں جا کر ہاتھ منہ دھوتے ہیں اور اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔“

جبار نے سامان اٹھا لیا۔ چلتے چلتے ان کے کانوں میں چچی کی آواز آئی:

”اب تو انھیں کھانا، پینا ہی پڑے گا۔ اگر انھوں نے زندہ رہنے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے، تو بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ لڑکی..... اچھی خاصی شکل کی ہے یہ، جوانی میں کیوں مر گئی؟“

وہ دوسری منزل کے جس کمرے میں پہنچے..... وہ دھول سے اٹا ہوا اور فرش پر بچھی دری پھٹی ہوئی تھی۔ دیواروں پر خاندان کے مرحومین کی تصاویر آنکھیں گھور رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے بدطینتی اور مسکراہٹ سے تمسخر عیاں تھا۔ بند کمرے کی مخصوص بو اور گھٹن سے سر میں درد کا احساس ہوتا تھا مگر کھانے اور گرما گرم چائے نے دونوں کی طبیعت کچھ بحال کر دی۔ جمیلہ کے اعصاب کا تناؤ بھی کم ہو گیا مگر مکمل طور پر نہیں کیونکہ ابھی تک وہ ذرا سی نامانوس آواز سے چونک اٹھتی۔ دلدل پر کسی مرغابی کی چیخ یا اس کے جواب میں الو کی آواز سے اس کا دل دہل جاتا۔ وہ بولی ”جبار! ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں مجھ پر تو ابھی سے وحشت طاری ہے۔ تم جانتے ہو کہ مجھے بند اور سیلن والے کمروں سے کتنی کراہت ہے۔“

وہ چمکار کر بولا ”ہمیں صرف ایک رات ہی تو گزارنی ہے۔ صبح ہم ان سے اپنی رقم وصول کریں گے اور پھر اس کے بعد راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ پولیس کو اس قتل کے سلسلے میں اب تک میری تلاش ہے۔ پچاس ہزار! میرے خدا! اس رقم سے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ جعلی پاسپورٹ بنوا کر ملک سے باہر جا سکتے ہیں۔ ایک نئی زندگی شروع ہو سکتی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ جمیلہ غیر یقینی لہجے میں بولی۔ ”مگر یہاں اتنی رقم کہاں ہوگی؟“ وہ ایک مرتبہ پھر کپکپائی۔

”سب کچھ یہیں ہے۔“ وہ اسے سمجھانے کے انداز میں گویا ہوا۔ ”میں نے تمھیں اپنے خاندان کے بارے میں جو کچھ بتایا، غالباً تم نے اس پر غور نہیں کیا۔ میرے پردادا امیر علی ٹھگ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جب ان کا سلسلہ ختم ہو گیا، تو وہ تمام مال و متاع لے کر اس دور افتادہ علاقے میں آ گئے۔ اب تو یہ اچھا خاصا قصبہ بن چکا۔ ریل، تار، ٹیلی فون اور بجلی سب کچھ ہے یہاں۔ لیکن اس زمانے میں یہ بالکل ویرانہ تھا۔ بس جنگلی اور دلدل۔ اس کے پاس لاکھوں روپے کا زر و جواہر ہوگا۔ گو ہمارے دادا اور اس کے بعد میرے باپ نے خاصی عیاشیاں کیں مگر مجھے یقین ہے، اس میں سے اب تک بھی بہت کچھ بچا ہوگا۔ ہمارے بزرگوں نے دولت کے معاملے میں کبھی کسی بینک پر اعتبار نہیں کیا۔“

”تمام دولت تمھاری چچی کے قبضے میں ہے اور یہ کھوسٹ بڑھیا تمھیں ایک دھیلا بھی نہ دے گی۔“

”وہ مجھے کیسے روک سکتی ہے؟“ اس کے لمبے چہرے پر اب بھیڑیے ایسی خشونت اور مکاری تھی۔ ”ضرورت پڑنے پر میں ان دونوں ”مرغیوں“ کی گردنیں مروڑ بھی سکتا

www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔"

"قتل؟" وہ سرگوشی میں بولی۔

"اور کیا۔ قتل کیا، یہ تو دنیا سے ان کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہوگا۔ ویسے بھی چچی اور میں نے کبھی ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا بلکہ یوں سمجھو کہ بارہ برس کی عمر سے ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ وہ میری سالگرہ کا دن تھا اور اسی دن میرے دادا کا انتقال ہوا۔ وہی دادا جنھوں نے اپنے تابوت میں کروٹ بدلی تھی۔"

"جبار!" جمیلہ چلا اٹھی۔

"خانم! گھبراؤ نہیں ہمارے خاندان سے ایسی بہت سی پُراسرار روایات وابستہ ہیں۔"

"نہیں۔"

"ہاں جمیلہ! یہ حقیقت ہے۔ مثلاً میرے باپ نے اپنے تابوت میں ٹیلی فون رکھوایا تھا، حقیقی ٹیلی فون! وہ ٹیلی فون جو درست حالت میں ہو اور جسے کام میں لایا جا سکے۔ یہ اس لیے کہ اگر وہ بھی تابوت میں کروٹ بدلے یا وہاں سے باہر نکلنا چاہے، تو اسے کسی قسم کی دقت نہ ہو۔"

"کیا کہتے ہو؟"

"ہاں، ہاں! یہ سب کچھ اس کی وصیت میں تھا۔ ادھر کھڑکی کے قریب آؤ۔" اس نے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ گھر کے پچھواڑے درختوں کی قطاریں تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر خشک زمین نے دلدل کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ ابتدائی تاریکیوں کے چاند کی ملگجی روشنی میں خشکی اور پانی ملے جلے سے تھے۔ گھر سے سو گز کے فاصلے پر اس نیم دلدلی زمین پر ایک سنگی عمارت نظر آ رہی تھی۔

"یہ تابوت خانہ ہے۔" جبار نے عمارت کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ وہ دونوں سحر زدہ سے خاموشی کے بوجھ تلے دبے اس تابوت خانے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ چرچراہٹ کے ساتھ اس کا دروازہ کھلا۔ جمیلہ نے ریڑھ کی ہڈی میں خوف کو سرد لہر کے مانند محسوس کیا۔ تابوت خانے کے دروازے سے ایک دراز عورت نکلی جو اس بے نور چاندنی میں کسی بھٹکی روح کی پرچھائیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ گھر کی طرف ہی آ رہی تھی۔

"چچی صادقہ۔" جبار کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "مگر یہ اس وقت تابوت خانے میں کیا کر رہی ہے۔"

"تابوت خانہ؟" جمیلہ نے کپکپائی آواز میں دہرایا۔

"ہاں، اس دلدلی زمین میں مردے دفن نہیں ہو سکتے، اس لیے یہ عمارت تابوت خانے کے طور پر بنوائی گئی۔ اسے تم نجی قبرستان ہی سمجھ لو۔ گو ہمارے خاندان ہی کے تمام لوگ یہیں دفن ہیں۔ پھر بھی خاصی جگہ باقی ہے۔ دراصل اس کے فرش کو آب رو ک بنایا گیا ہے۔"

دور بجلی چمکی جس سے ایک لمحے کے لیے یہ وحشت ناک منظر چمک گیا اور ساتھ ہی دور بادلوں کی گرج سنائی دی۔ چند ہی لمحوں میں چاند کا دیا بڑھتے سیاہ بادلوں میں بجھنے والا تھا۔ جبار بڑبڑایا۔ "طوفان آ رہا ہے۔"

کھڑکی سے ہٹ کر وہ دونوں پھر کھانے کی میز پر آ بیٹھے۔ جبار اسے بتانے لگا۔ "جب بارش آئے، تو دلدل میں پانی کی سطح ایک دو دنوں کے لیے اونچی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات نالوں میں سیلاب آ جاتا ہے اسی لیے اس مکان کی نیو بہت اونچی رکھی گئی۔ چنانچہ وہ پانی سے محفوظ رہتا ہے۔ کئی بار بارش کی وجہ سے اس گھر میں چند دنوں کے لیے ٹھہرنا نہ پڑ جائے۔"

"نہ جبار!" وہ گھبرا کر بولی۔ "میں اس گھر میں ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ قطعی ناممکن ہے۔"

"گھبراؤ نہیں، بھلا ہمیں زیادہ دیر تک ٹھہرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہاں تو میں تمھیں چچی صادقہ کے

www.pdfbooksfree.pk

بارے میں بتا رہا تھا۔ جب ہم اپنے دادا کو فون کر کے آئے، تو چچی نے نکلنے میں دیر لگا دی۔ میں نے یہ سمجھ کر دروازے پر تالا لگا دیا کہ سبھی نکل چکے۔ گھر چونکہ عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھرا تھا، اس لیے اگلی صبح تک کسی نے چچی کی کمی محسوس نہ کی۔ ادھر رات کو چچی نے دادا کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے سنا، تو انھوں نے اسے جواب بھی دیا۔ دادا نے التجا کی کہ وہ اسے یہاں سے نکلنے میں مدد دے مگر چچی نہ مانی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دادا مردہ ہے۔ اس دن کے بعد سے چچی کو یہ وہم ہو گیا کہ وہ مردوں سے بات چیت کر سکتی ہے۔"

جمیلہ کا رنگ اڑ چکا اور ہونٹ زرد ہو رہے تھے۔ وہ حلق میں لعاب نگل کر بولی "تم....."

جبار مسکرا کر بولا "یہ تو صرف مذاق تھا ابھی یہ قصہ پورا کہاں ہوا ہے۔ پہلے پہل تو کسی کو چچی کی بات پر یقین ہی نہ آیا۔ مگر پھر میرے والد کو کچھ تجسس ہوا چناں چہ سب نے مل کر تابوت کھولا، تو واقعی دادا کی نعش کروٹ کے بل پڑی تھی۔ یہی نہیں بلکہ منہ بھی یوں کھلا تھا گویا مدد کے لیے پکارتے پکارتے جان نکلی ہے۔ ان کی آنکھیں بھی کھلی تھیں حتیٰ کہ ادھر اُدھر گھومنے کی وجہ سے انگلیوں کے ناخن بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔

"خدا کے لیے جبار! کیوں میری جان نکال رہے ہو۔"

"جمیلہ! اس قصے کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ دراصل ہمارے ابا میں سے کسی کو سکتے کا مرض لاحق تھا، اس لیے امکان ہے کہ دادا کو بھی سکتہ ہوا ہو۔ اس بات سے میرے ابا بہت خوفزدہ ہوئے۔ چناں چہ انھوں نے پیش بندی کے طور پر اپنے تابوت میں ٹیلی فون لگوا لیا....."

"جبار!" وہ کپکپا کر بولی۔

"سچ ہے یہ!" وہ زور دے کر بولا۔ "چناں چہ میرے ابا کو ان کی وصیت کے مطابق فون کے ساتھ تابوت میں ڈالا گیا تا کہ کبھی ان کی آنکھ کھل جائے، تو وہ مدد کے لیے لوگوں کو بلا سکیں۔"

"اف خدایا!"

"اچھا! چلو چھوڑو اس قصے کو، میں تو چچی صادقہ سے معاملے کی بات کرنے کا خواہاں ہوں، لیکن ٹھہرو! تجوری ابا کی تصویر کے پیچھے ہوتی تھی۔ دیکھیں، تو بھلا یہ اب تک وہیں ہے؟"

اس نے جب دیوار کے پاس جا کر ایک تنومند، سرخ چہرے اور باہر کو نکلی آنکھوں والے شخص کی تصویر اٹھائی، تو تجوری کے پٹ وا ہو گئے۔ جمیلہ کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ لیکن کھلی تجوری دیکھ کر خوف اور پریشانی کے احساسات ختم ہو گئے۔ جبار نے خوشی سے ہنستے ہوئے نقدی رکھنے والا ڈبا باہر نکال کر جب اسے توڑا، تو اس میں سے ایک کاغذ نکلا۔ وہ بے تابی سے اسے پڑھنے لگا۔ جمیلہ بھی پنجوں کے بل اونچی ہو اس کے کندھے پر سے جھانک کر پڑھنے لگی۔ دونوں تحریر پڑھنے میں محو تھے اور سیاہ حروف گویا ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

"اس دن کے بعد سے چچی کو یہ وہم ہو گیا کہ وہ مردوں سے بات چیت کر سکتی ہے۔"

پشت پر چوبی تختے کی چرچراہٹ سنی، تو دونوں نے یکلخت گردنیں گھمائیں۔ دروازے پر چچی صادقہ کھڑی گھور رہی تھی۔ جبار چلا کر بولا "یہ کاغذ کہہ رہا ہے کہ ستار کے بعد تم ساری دولت کی وارث ہو۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ یہ میری دولت ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ بتاؤ وہ سب مال تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"جبار بیٹے! وہ سب محفوظ ہے بالکل محفوظ، اگر تم ایسے

www.pdfbooksfree.pk

ہی بے تاب ہو، تو اسے تلاش کیوں نہیں کر لیتے۔"

"بے فکر رہو چچی! میں یہی کروں گا۔" ایک دو لمحوں تک دونوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر وہ بولا "اور ہاں! اتنی رات گئے تم تابوت خانے میں کیا کرتی پھر رہی ہو؟"

"میں تمھارے بھائی ستار سے باتیں کرنے جاتی ہوں۔ وہ اپنی "ٹھنڈی قبر" میں تنہائی محسوس کرتا ہے۔ میری باتوں سے اس کی طبیعت بہل جاتی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ مردے خود تو چل کر آنے سے رہے۔ اسی لیے میں ہی اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

جمیلہ خوف سے کانپ رہی تھی مگر چچی صادقہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی۔ "اسی طرح جیسے میں نے پہلے تمھارے دادا اور پھر ابا سے بات چیت کی تھی۔ جبار! تمھیں دادا والی بات تو نہ بھولی ہوگی؟"

جمیلہ دہشت سے چلا اٹھی۔ مگر جبار نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی، وہ جبار سے پوچھ رہی تھی۔ "مگر بیٹے تم اتنی دولت کا کیا کرو گے؟ تم تو مردہ ہو اور بھلا مردوں کا دولت سے کیا کام؟"

اب وہ جھلا کر بولا "چچی! ختم کرو اس پاگل پن کو تم مجھے سختی پر مجبور کر رہی ہو۔ میں تمھیں کرسی سے باندھ کر جلتے سگریٹ کے کرشمے دکھاؤں گا، پھر میری زندگی کا یقین آئے گا تمھیں۔"

وہ اطمینان سے بولی "اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں دراصل اس وقت ستار کے پاس تمھارے ہی بارے میں مشورہ کرنے گئی تھی۔"

"اچھا؟" وہ بے اعتباری سے بولا۔

"ہاں! اور اس نے کہا کہ تمھیں دولت کا بتانے میں کوئی حرج نہیں، آخر تم اپنے ہی تو ہو۔ اب یہ اور بات ہے کہ ذرا سے مر چکے۔"

وہ بے تابی سے بولا "کہاں ہے؟"

"تابوت خانے میں۔" وہ فاتحانہ لہجے میں بولی، "ہاں! ہاں! تابوت خانے میں ایسی جگہ پر جہاں کسی چور کا وہم و گمان بھی نہیں جا سکتا۔ تابوت خانے میں جہاں اس خاندان کے تمام لوگ سو رہے ہیں۔ جہاں تمھارا دادا، باپ اور بھائی ہے اور جہاں تمھارے لیے بھی ایک تابوت تیار ہے۔ وہ دولت تمھاری خالی "قبر" ہی میں رکھی ہے۔"

جبار نے زور دار قہقہہ لگایا۔ "پچاس ہزار روپے میری قبر میں۔ واہ! کیا خوب مذاق ہے چچی۔ ہاہاہا! جمیلہ اب تمھیں اندازہ ہوا کہ ہمارا خاندان کتنا پہنچا ہوا ہے۔ ہاہاہا!"

"جبار!" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "خدا کے لیے رقم لو اور جلد از جلد اس پاگل خانے سے نکلنے کی کرو۔ میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔"

"ہاں!" چچی نے کہا۔ "تمھیں یہ کام جلد کرنا ہوگا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی حصوں میں زبردست بارش ہو چکی کیونکہ دلدلوں میں پانی چڑھ رہا ہے۔ تابوت خانے کا فرش بھی درست حالت میں تھا مگر اب وہ بات نہیں رہی، اب میں فرش پر ایک ایک انچ پانی دیکھ کر آ رہی ہوں۔"

"چچی! ہم جاتے تو ہیں لیکن یہ جھوٹ ہوا تو....."

"پگلے! مجھے مردوں سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت؟ تم بڑے ضدی ہو، بات مانتے ہی نہیں۔ اگر تم خود کو مردہ مان لو تو سارا قصہ ہی ختم ہو جائے۔ ہم سب بڑے اطمینان سے رہ سکتے ہیں۔ پھر میں، تم اور ہم سب خوب مزے سے گفتگو کیا کریں گے۔"

دولت کے تصور نے جبار کے جسم میں نئی توانائی بھر دی تھی۔ چناں چہ اب اسے چچی کی باتوں پر غصہ نہ آیا بلکہ وہ ہنس دیا۔ جمیلہ نے بھی اس ہنسی میں شریک ہونے کی کوشش کی۔

www.pdfbooksfree.pk

جب گھر سے کلہاڑی اور ٹارچ لیے وہ تابوت خانے کی طرف جا رہے تھے، تو ان کے سر پر بادل ایک مرتبہ پھر گرجے۔ فضا تاریک تھی۔ تیز ہوا جیسے درختوں پر چابک برسا رہی تھی۔ موٹے موٹے قطرے زبردست بارش کا پیغام لا رہے تھے۔ تابوت خانے میں خاموشی اور گھٹن کے ساتھ ساتھ سیلن کی سردی بھی تھی اور ہوا جیسے مردہ جسموں کی بو سے بوجھل ہو۔ اس تاریکی میں ٹارچ کی روشنی کا دائرہ ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہا تھا۔

اس بند جگہ جبار کی آواز کھوکھلی اور اس کی گونج خوفناک تھی۔ جمیلہ تو ایک دم اچھل پڑی۔ ''اس کے پیچھے ایک تہ خانے میں ہمارے بزرگ آرام کر رہے ہیں۔ اس کا راستہ پتھر کی ایک سل سے بند کیا گیا ہے۔ تم ذرا یہ ٹارچ پکڑو، میں اسے کھولتا ہوں۔''

وہ ایک کونے میں جھک کر دیوار کے ساتھ کچھ ٹٹولتا رہا پھر ہلکی سی ''کلک'' کی آواز آئی۔

جب اس نے اپنے پاؤں کا دباؤ ڈالا، تو ایک مدھم شور سے گویا احتجاج کرتی سیاہ سل اوپر اٹھ گئی۔ نیچے تاریکی منہ پھاڑے جھانک رہی تھی۔ جبار نے سل پکڑ کے اوپر کر لی اور ''کلک'' کی دوسری آواز کے ساتھ سل اپنے بالائی خانے میں پیوست ہو گئی۔

ٹارچ کی روشنی تنگ اور پتلی سیڑھیاں ظاہر کر رہی تھی۔ نیچے تہ خانے سے متعفن اور مردہ ہوا کے پہلے جھونکے ہی سے جمیلہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ منت کرتے ہوئے بولی ''میں باہر رہتی ہوں، تم نیچے اتر جاؤ۔ اندر گھٹن اور سیلن ہو گی اور یہ مجھے ناپسند ہیں۔''

وہ تنک کر بولا ''ذرا سی گھٹن سے مر نہ جاؤ گی، چلو! آخر ٹارچ بھی تو کسی نے پکڑنی ہے۔''

جبار نے احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم رکھا، تو اندر سے شوں کرتی کوئی چیز اس کے منہ سے چھوتی گزر گئی۔ جمیلہ کی چیخ سے تابوت خانہ گونج اٹھا۔ جبار کے حواس بھی جاتے رہے۔ چند لمحے دونوں خاموشی سے کھڑے کانپتے رہے۔ جبار کے کپکپاتے ہاتھوں سے ٹارچ کی تھرکتی روشنی میں سیڑھیاں اور بھی ویران نظر آ رہی تھیں۔ اتنے میں ویسی ہی ایک اور چیز آئی، تو جبار نے دیکھا، وہ چمگادڑ تھی۔ وہ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ''اوہ اس کم بخت چمگادڑ نے تو جان ہی نکال دی۔'' مگر جمیلہ خاموش تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن ابھی تک قابو میں نہ تھی۔

جبار نے پھر اترنا شروع کیا۔ جمیلہ نے اعصابی تناؤ اور خوف کے مارے مٹھیاں اس زور سے بھینچ رکھی تھیں کہ ناخن ہتھیلیوں میں چبھ رہے تھے۔ وہ کانپتی ہوئی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے اترنے لگی۔ سیڑھیاں انھیں بالائی کمرے سے مشابہ کمرے میں لے آئیں۔ فرش پر دو انچ پانی تھا جو سیاہ معلوم ہوتا۔ جمیلہ آخری سیڑھی پر رک گئی، بولی ''میں اس سے نیچے نہ اتروں گی، میں یہیں سے روشنی کرتی رہوں گی۔''

جمیلہ کی چیخ سے تابوت خانہ گونج اٹھا۔ جبار کے حواس بھی جاتے رہے۔

''بہت اچھا!'' وہ ناگواری سے بولا اور ٹارچ اسے پکڑا کر کہنے لگا ''چلو یہیں سے روشنی کرتی رہو۔ ادھر روشنی کرو۔ ادھر اور ادھر۔ اب ذرا دیکھو، تو'' روشنی کے دائرے میں تابوتوں کے کتبے اور تعویذ چمک اٹھے۔ ''یہ ہیں میرے پردادا..... اور یہ..... یہ رہے میرے دادا جنھوں نے تابوت میں کروٹ بدلی تھی۔ یہ دیکھو ان کا کتبہ ''عبدالغفار پیدائش ۱۸۵۲ء، وفات ۱۹۳۷ء۔'' اور یہ رہا میرے والد کا تابوت۔ یہ ادھر، یہ ان کا کتبہ ہے ''عبدالوہاب پیدائش ۱۸۸۵ء

www.pdfbooksfree.pk

وفات ۱۹۴۵ء۔ اور یہ ہاں! یہی تو ستار کی قبر ہے۔ اور یہ ارے یہ کیا؟..... یہ خالی تابوت اور اس پر ایک کتبہ بھی ہے۔

''ارے!'' وہ ایک لمحے کو حیرت سے چپ رہا۔

جمیلہ گھبرا کر چیخی۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، یہ میرے لیے ہے۔''

''ہیں۔''

''ہاں! یہ قبر میرے لیے ہے بلکہ اس پتھر پر میرا نام بھی لکھا ہے۔''

''نام۔''

''ہاں! ہاں! یہ دیکھو۔ عبدالجبار پیدائش ۱۹۲۵ء..... وفات ۲۱ نومبر ۱۹۵۹ء'' وہ خود سے بولا۔ ''دیکھو چچی کی مکاری، یہ آج ہی کی تاریخ ہے۔''

''اف خدایا۔'' جمیلہ جیسے کراہی۔

''معلوم ہوتا ہے شام کو وہ یہی لکھنے آئی تھی کیونکہ یہ کوئلے سے لکھا ہے۔ میں اس منحوس بڑھیا کے مزاج درست کردوں گا۔''

''خدا کے لیے کام ختم کرو اور جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے!'' وہ جیسے بے صبری سے بولا۔ ''میں بھی کس چکر میں پڑ گیا۔'' اس نے تابوت پر سے پتھر کی سلیں اٹھائیں دونوں کی نگاہیں اس کی تہ میں کبھی جارہی تھیں ٹارچ کی روشنی میں واقعی نوٹ پڑے تھے۔ بہت سلیقے سے بنڈل قطار در قطار رکھے تھے۔ جمیلہ کی سانس تیز تھی۔ جبار بھی خاموش کھڑا گھور رہا تھا۔

بالآخر وہ بولا ''تو گویا چچی ٹھیک کہہ رہی تھی، مگر اب یہ سب کچھ کیسے لے کر جائیں گے؟'' پھر خود ہی ہنس کر اپنا کوٹ اتارا، اس کے بٹن بند کیے، بازوؤں کو گرہ دے کوٹ کو ایک تھیلے میں تبدیل کر دیا اور جمیلہ سے مخاطب ہوا ''اب تم ادھر آجاؤ اور اس میں نوٹ ڈالتی جاؤ۔''

''اوں اوں۔'' جمیلہ جیسے منمنائی۔

''شاباش!'' وہ خوشدلی سے بولا۔ ''ٹھنڈ سے نہ گھبراؤ، پچاس ہزار کے نوٹوں کی کافی گرمی ہوتی ہے۔''

کسی نامعلوم جگہ سے آنے والا پانی بتدریج بڑھ رہا تھا۔ جمیلہ نے کانپتے ہوئے سیاہ پانی میں پاؤں ڈالا، تو وہ اس کے ٹخنوں تک آرہا۔ ابھی اس نے چند ہی قدم اٹھائے تھے کہ شور کے ساتھ اوپر راستہ کی سل دوبارہ اپنی جگہ پر آ گئی۔ جمیلہ نے چیخ ماری جس کے جواب میں مردہ ہڈیوں ایسی کھڑکھڑاہٹ سے مشابہ چچی کی ہنسی سنائی دی۔

''چچی!'' جبار پوری قوت سے چیخ اٹھا۔

وہ پانی میں سے شڑاپ شڑاپ کرتا گزرا اور سیڑھیاں چڑھ کر پوری قوت سے سل اٹھانے لگا۔

''چچی!'' اب اس نے زور سے آواز دی۔

زور لگانے سے چہرہ سرخ ہو گیا اور گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ ''چچی! چچی!''

لیکن سل اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

''چچی! خدا کے واسطے! چچی۔'' وہ ایک مرتبہ پھر چلایا۔

جواب میں دوبارہ وہی ہنسی آئی جو اب بتدریج دور ہو رہی تھی۔ وہ دوبارہ چیخا ''چچی!''

مگر اب باہر خاموشی تھی۔ دور سے بادل گرجنے کی آواز آرہی تھی اور فرش پر بڑھتے پانی کی۔

''جبار!'' اب جو جمیلہ بولی، تو اس کی کپکپاتی آواز محض ایک سرگوشی تھی۔ ''اس خبیث بڑھیا نے ہمیں یہاں بند کر دیا ہے۔ ان مردوں کے ساتھ۔ جبار اب ہم کبھی یہاں سے باہر نہ نکل سکیں گے۔'' وہ اب خوف سے چیخ رہی تھی۔ ''کبھی نہیں! جبار! کبھی نہیں۔''

اچانک وہ خاموش ہو گئی کیونکہ جبار ایک ہی جست

www.pdfbooksfree.pk

میں اس کے پاس تھا۔ اس نے وحشت کے عالم میں جمیلہ کو تھپڑ مارا اور پھر ایک اور، پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ جمیلہ نے سکتے کے عالم میں اپنی انگلیوں سے گالوں کو چھوا۔ اس کی پھیلی پتلیوں جبار پر مرکوز تھیں۔

وہ دھاڑا۔ ”بند کرو بکواس۔“

وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ پھر وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ”چیخنے چلانے سے کچھ نہ بنے گا، وہ سنکی ہے۔ بعد میں ہمیں نکال دے گی، لیکن ہمیں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس کلہاڑی ہے۔ تم ٹارچ کو ٹھیک طرح سے پکڑے رکھو۔“

اس نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ سل پر کلہاڑیاں برسا رہا تھا، تو نیچے پانی کا شور اور بھی بڑھ چکا تھا۔ دو چار ہاتھ ہی مارے تھے کہ کلہاڑی کا پھل دستے سے نکل کر پانی میں جا گرا۔ جبار کے حکم پر جمیلہ پانی میں اسے تلاش کرنے لگی۔

”مجھے نہیں مل رہا۔“ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ ”مجھے نہیں مل رہا جبار۔“

اب جبار خود بھی مغلظات بکتا اسے تلاش کرنے لگا۔ وہ سرد پانی کو بھول چکا تھا۔ اپنی دھن میں مگن کسی گدھے کی طرح ہاتھ اور پاؤں کے بل جھکا فرش ٹٹول رہا تھا۔

”چلو تم بھی جھکو۔“ وہ اب غضب ناک تھا۔ ”مجھے کوئی پروا نہیں کہ پانی کتنا سرد ہے نہ ہی مجھے تمہارے ٹھنڈ لگنے کا ڈر ہے۔ زندہ باہر نکلنا ہے، تو اسے تلاش کرو۔“

بڑبڑاتی ہوئی جمیلہ بھی اس کے ساتھ پانی میں جھکی ہاتھوں سے پانی میں ٹٹولنے لگی۔ دونوں کمر تک بھیگ چکے تھے۔ بالآخر جمیلہ کی ٹھنڈ سے سن انگلیوں نے کلہاڑی کا پھل تلاش کر لیا۔ جبار نے جھپٹا مار کر پھل لیا۔ اب وہ سیڑھیوں پر تھا۔ اس نے رومال میں پھل کا سرا لپیٹا اور لکڑی کے دستے میں ٹھونس نئی قوت سے سل پر وار شروع کر دیے۔ حتیٰ کہ سانس پھول گئی، پسینے میں شرابور اور تھکن سے چور ہو گیا۔ جب ہاتھ روک کر دیکھا، تو سل پر ایک نشان بھی نہ تھا۔

”یہ چھے انچ موٹی سل ہے۔“ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”چھے انچ۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ جمیلہ کا گیلا لباس اس کے جسم اور منتشر بال اس کے گالوں سے چپکے تھے۔ جبار کا جسم اور چہرہ گندا ہو رہا تھا، مگر آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ پھر اچانک وہ قہقہے لگانے لگا۔ وہ ہنستا گیا اتنا ہنسا کہ اس کی ہنسی کسی پاگل کی چیخوں میں تبدیل ہو گئی۔ ایسے لگتا جیسے وہ ہنستا ہنستا نیچے لڑھک جائے گا۔ جب وہ خاموش ہوا، تو بولا ”ابا۔“ وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔ ”ابا، ابا۔“

”کیا ہوا؟“ جمیلہ چیخی۔

”ابا کا تابوت، میں تو بھول ہی گیا۔ وہ دیکھو! وہ دیکھو!“ وہ اسی وحشیانہ ہنسی کے ساتھ پانی سے ہوتا ہوا اپنے باپ کی قبر کی طرف گیا۔ ”تم بھی آجاؤ۔“ وہ چیخا۔ ”دونوں مل کر کھولتے ہیں۔“

”مگر کیوں؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟“

وہ ہنس کر بولا ”فون۔ ٹیلی فون بھول گئیں۔ چلو ادھر آؤ! تابوت میں ٹیلی فون ہے۔“

دونوں پاگلوں کی طرح کلہاڑی سے تابوت کی سلیں ادھیڑتے رہے۔ آخر گھنٹوں کی مشقت کے بعد اسے کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ کفن میں لپٹی نعش کے سامنے آتے ہی کافور کی مردہ بو ان کے نتھنوں میں سرایت کر گئی۔ مردہ جسم کی بو اس پر مستزاد تھی۔

> کفن میں لپٹی نعش کے سامنے آتے ہی کافور کی مردہ بو ان کے نتھنوں میں سرایت کر گئی۔

www.pdfbooksfree.pk

جمیلہ کی آنکھیں بند تھیں۔ ”دیکھا؟“ وہ فاتحانہ انداز سے چیخا۔

”میں نے کیا کہا تھا۔ یہ ہیں ہمارے پاگل بزرگ! میرا باپ زندگی میں مجھ سے نفرت کرتا رہا، مگر اب وہی مجھے موت سے نجات دلائے گا۔“

اس نے چونگا اٹھا لیا۔ ”کوئی پاگل ہی اپنی قبر میں فون رکھ سکتا تھا۔ ہم تھانے اطلاع دیں گے۔ پولیس ضرور ہماری مدد کو پہنچے گی۔ سارا قصبہ چچی کی حماقتوں سے واقف ہے۔“ وہ بولا۔

”مگر اتنے طویل عرصے بعد تار میں.....“

مگر جبار نے اس کی بات کاٹی۔ ”گھنٹی بج رہی ہے۔“

”کمال ہے۔“

”ہاں! ہاں! واقعی۔“ وہ پرجوش آواز میں چلایا۔ ”آپریٹر جواب دے رہی ہے۔ ہیلو! ہیلو!“ وہ چلایا۔ ”آپریٹر!“ کیا آپ میری آواز صاف سن رہی ہیں؟“

”ہاں!“

”آپریٹر! میں عبدالجبار بول رہا ہوں۔“ اس نے اپنے گھر کا پتا بتایا۔ ”کیا تمھیں جگہ کا علم ہے؟“

”ہاں!“

”مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ آپ تھانے میں اطلاع کرائیں اور پولیس کو بتا دیں کہ میں اپنے خاندانی تابوت خانے کے تہ خانے میں بند ہوں۔ کیا تم سمجھ گئی ہو؟“

”ہاں!“

”انھیں جلد آنے کی تاکید کرنا، ہم خاصی دیر سے اندر بند ہیں۔ ویسے بھی ہم صرف چند گھنٹے ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ تہ خانے میں پانی بڑھتا جا رہا ہے، جلدی کرنا۔“

”اچھا!“

جبار نے ایک مرتبہ اسے پھر پتا سمجھایا۔ ”دیر نہ کرنا۔“

”اچھا۔“

اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے چونگا اپنے باپ کی نعش کے پاس رکھ دیا۔

وہ جمیلہ کو سمجھا رہا تھا۔ ”بس ابھی پولیس پہنچ جاتی ہے۔ اتنی دیر تک ٹارچ کی روشنی بھی ختم نہ ہو گی۔ یہ بہترین ٹارچ ہے۔ اب خود پر قابو پائے رکھو۔ اس کے بعد دولت ہی دولت ہو گی جانِ من! میں تمھاری ہر فرمائش پوری کروں گا۔ ساری عمر عیش و عشرت سے بسر ہو گی۔ بس کچھ دیر کے لیے صبر کر لو۔“

☆☆

سوگز کے فاصلے پر شکستہ مکان میں چچی نے بڑی آہستگی سے چونگا ٹیلی فون پر رکھ دیا اور تھکی تھکی آواز میں کہنے لگی۔ ”یہ جبار تھا۔ ابھی تک اسے مرنے اور دفن ہونے کے بعد والی زندگی کی عادت نہیں پڑی۔ باہر نکلنے کے لیے مدد طلب کر رہا تھا۔ اس نے مجھے آپریٹر سمجھ لیا۔ اب بھلا میں یہ ظلم کیسے کرتی کہ اسے یہ بتاتی، تم اور تمھاری بیوی مر چکے۔ اس لیے تمھارے باہر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے یہ امید دلا دی کہ لوگ ان کی مدد کو پہنچ رہے ہیں۔ اس سے ان دونوں کا دل بہلا رہے گا۔ پھر جب کل پرسوں تک وہ واقعی خاموش ہو جائیں گے، تو میں ان سے گفتگو کروں گی۔ اب تو وہ اتنی افراتفری میں تھے کہ ڈھنگ سے بات بھی نہ ہو سکی۔“

خالہ ارجمند بے نور آنکھوں سے چچی کو گھور رہی تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور دلدل پر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ چچی دھیمے سروں میں گنگنانے لگی:

”میرے مولا، مدینے بلا لو مجھے۔“

www.pdfbooksfree.pk

نیکی اور اخلاق کے مرقع

پانچ عظیم پاکستانی

ان عام پاکستانیوں کا تذکرہ جاں فزا
جن کے دم قدم سے خیر و بھلائی کا بول بالا ہوا

حبیب اشرف صبوحی

جاتا ہے انسان کو دو مواقع پر آزمانا چاہیے
کہا جب وہ اقتدار میں ہو یا اُس کے پاس دولت آ
جائے۔ دیکھنا چاہیے کہ تب اس کا رویہ ماتحتوں،
غریب رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ کیسا رہتا
ہے۔ وہ اگر اعلیٰ عہدیدار ہے تو انصاف کے تقاضے
پورے کر رہا ہے یا نہیں کیونکہ دولت اور عہدہ آنی جانی
چیزیں ہیں۔ صرف انسان کا اخلاق اور نیکی یاد رہ جاتی
ہے۔ اسی سلسلے میں کچھ کردار میری زندگی میں آئے جنھیں
ضبطِ تحریر میں لا رہا ہوں۔

شریف النفس انسپکٹر

میں ایک ادارے میں بطور منیجر کام کر رہا تھا
اور میری تعیناتی شیخوپورہ میں تھی۔
فاروق آباد، ننکانہ صاحب،
شاہ کوٹ وغیرہ میں

www.pdfbooksfree.pk

ہمارے دفاتر تھے اور اُن کی نگرانی بھی میرے ذمے تھی۔

ایک دفعہ مجھے اطلاع ملی کہ شاہ کوٹ کے دفتر میں رات کو ایک ڈاکو آیا۔ عملے کو یرغمال بنا کر اُن سے نقدی و موٹر سائیکل چھینی اور فرار ہوگیا۔ واردات کی رپورٹ شاہ کوٹ تھانہ میں کرا دی گئی۔ کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ مجرم موٹر سائیکل سمیت گرفتار ہوچکا اور پولیس کی تحویل میں ہے۔

چھان بین سے معلوم ہوا کہ انسپکٹر سے ملاقات کے بعد ہی دفتر کی موٹر سائیکل مل سکے گی۔ چناں چہ ایک روز میں اپنے ماتحت کے ساتھ شاہ کوٹ تھانے پہنچا۔ نچلے عملے سے بات ہوئی، تو انھوں نے بتایا کہ موٹر سائیکل صرف انسپکٹر کی اجازت سے ملے گی۔ پتا چلا کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹا اُن کا انتظار کیا۔ جب وہ نہیں آئے، تو ہمت کر کے ان کے کمرے تک گیا اور دستک دی۔

میرا خیال یہی تھا کہ میرا استقبال مثلاً سے ہوگا جس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار تھا، لیکن جب انسپکٹر نے مجھے اندر آنے کی اجازت دی، تو مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے اخلاقاً معذرت کی کہ اُن کی نیند اور آرام میں خلل ڈال دیا۔ انھوں نے بڑے شائستہ طریقے سے بتایا ''یہ میرا سونے کا وقت نہیں، آپ نے اچھا کیا کہ مجھے اٹھا دیا۔ دیر تک سونے کی وجہ یہ تھی کہ میں ساری رات گشت پر تھا۔ اس لیے نیند پوری نہ ہوسکی۔ دوسرے میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ آپ کے عملے نے ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے مجرم کو گرفتار کرلیا ہے۔ یہ آپ کی احساسِ ذمے داری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اب آپ یہ مہربانی کریں کہ ہماری موٹر سائیکل واپس کروادیں۔

انھوں نے اس سلسلے میں کچھ تحریریں وغیرہ لکھوائیں اور بتایا کہ کل انشاءاللہ آپ کو موٹر سائیکل مل جائے گی۔ اس کے بعد ملازم کو چائے لانے کا کہا۔ جب چائے آئی، تو انھوں نے الماری میں سے مٹھائی کا ڈبا کھول کر رکھ دیا۔ میں نے معذرت کی اور بتایا کہ میں شوگر کا مریض ہوں، مٹھائی نہیں کھا سکتا۔ یہ سُن کر انھوں نے اپنے بستر کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی میز نکالی جس پر ایک پیزا رکھا تھا۔ کہنے لگے، اس سے تو انکار نہیں ہوگا؟

میں نے کہا ''انسپکٹر صاحب میں تھانے آیا ہوا ہوں یا کسی دعوت میں؟ میری آنکھیں اور کان گومگوں کی کیفیت میں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تھانے اور تھانیدار کا جو تصور ہے، آپ اُس سے ہٹ کر نظر آئے ہیں۔ کاش ہمارے مُلک کی ساری پولیس آپ جیسی شائستہ اور فرض شناس ہوجائے، تو تمام جرائم تقریباً ختم ہوجائیں۔''

وہ کہنے لگے ''اچھے اور بُرے انسان ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اس فانی دُنیا کی حقیقت سمجھ لے، تو برائی کا خیال اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے اور ہمیں اگلے جہان میں اپنے ہر قول و فعل کا جواب دینا ہے۔''

انسپکٹر کی باتیں اتنی دل نشیں تھیں کہ میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جب میں نے ان سے نام پوچھا، تو انھوں نے جو نام بتایا اس کے آخر میں ''عاصی'' (یعنی گناہ گار) آتا تھا۔ میں نے پوچھا کیا آپ شعر و شاعری کرتے ہیں کہ یہ تخلص رکھ لیا؟

کہنے لگے ''میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی طبیعت میں عاجزی اور انکسار پیدا کروں۔ اسی وجہ سے نام کے ساتھ ''عاصی'' کا اضافہ کر ڈالا۔''

www.pdfbooksfree.pk

بعد میں جب عملے سے انسپکٹر کے متعلق پوچھا تو سبھی نے بتایا کہ وہ انتہائی نیک دل، خدا ترس اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے والا افسر ہے۔ بدمعاش، چوروں اور اٹھائی گیروں کے لیے سخت گیر ہے۔ اپنے عملے کا بہت خیال کرتا اور اُن سے عزت سے پیش آتا ہے۔ تمام عملہ اُس سے بہت خوش ہے۔ میں اس انسپکٹر کی شخصیت اور کردار کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

ایمان دار چیف انجینئر

چند سال قبل ہمارے محلے کے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور بتایا' میٹر ریڈر نے یہ پیغام بھجوایا ہے کہ آپ سب لوگ ایک ہزار روپے مہینا مجھے دیا کریں' تو آپ کو بجلی کا بل آدھا آیا کرے گا۔ میں نے پڑوسیوں سے معذرت کی اور کہا کہ میں آپ کی اس غیر قانونی حرکت میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اُنھوں نے ایک دو دفعہ مزید کہلوایا لیکن میں نے ہر بار انکار کر دیا۔ اس پر مجھے میٹر ریڈر کی طرف سے پیغام آیا کہ آپ کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں نے کہلوایا کہ میں نقصان اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔

کچھ عرصہ بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کے ساتھ دو ماہ کے لیے کراچی چلا گیا۔ واپس آیا' تو ایک روز محکمہ بجلی کا آدمی آیا اور کہنے لگا ''آپ کا میٹر بہت آہستہ چل رہا ہے اور دو ماہ سے آپ کا بل بھی کم آ رہا ہے۔''

میں نے اُسے بتایا کہ ہم لوگ کراچی گئے ہوئے تھے۔ آپ محلے والوں سے پوچھ لیں۔ دفتر والوں سے بھی تصدیق کروا دیتا ہوں کہ میں لاہور نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ہماری معائنہ ٹیم نے چھاپہ مارا ہے اور آپ کے میٹر کی سیل ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ بجلی چوری کرتے ہیں۔ وہ یہ پیغام دے کر چلا گیا۔

دوسرے روز محکمے کی طرف سے ایک خط آیا کہ ہماری معائنہ ٹیم نے آپ کے گھر چھاپا مارا تھا۔ آپ کے میٹر کی سیل ٹوٹی ہوئی پائی گئی۔ لہٰذا آپ کو ۱۸۰۰۰ روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ یہ نوٹس دیکھ کر میں بہت تلملایا۔ محکمہ کے ایس۔ڈی۔او سے ملا اور ساری صورت حال سمجھائی' لیکن اُس نے بے بسی ظاہر کی اور کہا کہ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ رقم بھرنی پڑے گی۔ میں ایکسین سے ملا' تو انھوں نے بھی ہاتھ اُٹھا دیے۔

آخر میں چیف انجینئر کے پاس چلا گیا۔ اُنھیں گزشتہ پانچ سال کے بجلی کے بل دکھائے اور بتایا کہ میرا خاندان صرف تین افراد پر مشتمل ہے۔ میرے گھر دو میٹر لگے ہوئے ہیں۔ ہم بہت محتاط طریقے سے بجلی استعمال کرتے ہیں۔ اب ہم پر میٹر کی سیل توڑنے کا الزام لگا کر ۱۸ ہزار روپے جرمانہ کر دیا گیا جو سراسر ناانصافی ہے۔

> آپ بھی اس پریشانی کی تکلیف اٹھائیے۔ آپ میرے جیسے کئی شریف آدمیوں کو تنگ کرتے ہوں گے۔ یہ آپ کی سزا ہے۔

اُنھوں نے تمام باتیں تفصیل سے سنیں۔ اُس کے بعد متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کے تمام عملے کو بلوا لیا اور انھیں کہا ''میں نے ساری بات سن لی۔ ان پر ۱۸ ہزار کا جرمانہ سازش کے تحت ڈالا گیا ہے۔ یہ جرمانہ آپ لوگ دیں گے، یہ صاحب نہیں۔'' پھر خاص طور پر میٹر ریڈر سے کہا کہ آدھا جرمانہ آپ دیں اور باقی آدھا جرمانہ عملہ مل کر دے۔ یہ فیصلہ سُن کر وہ لوگ بہت پریشان ہوئے۔ جب ہم باہر نکلے تو وہ مجھ سے معافیاں مانگنے لگے۔

میں نے کہا کہ یہ فیصلہ آپ کے افسر نے کیا ہے۔ میں جس طرح پریشان رہا ہوں، آپ بھی اس پریشانی کی تکلیف اٹھائیے۔ آپ میرے جیسے کئی شریف آدمیوں کو

www.pdfbooksfree.pk

تنگ کرتے ہوں گے۔ آپ کی سزا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اُن کی یونین والے آگئے اور منت سماجت کرکے کہنے لگے کہ آپ چیف انجینئر سے کہہ کر مسئلہ ختم کروائیے۔ وہ آپ کی سفارش ضرور مانیں گے۔ آخر میں چیف انجینئر سے پھر ملا اور کہا کہ وہ اپنی غلطی مان گئے ہیں۔ اب اُن پر نظرِ کرم کیجیے۔

انھوں نے متعلقہ لوگوں سے تحریر لکھوائی کہ آئندہ ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ہم اپنا کام ایمانداری اور محنت سے کریں گے۔ تب انھوں نے جرمانہ معاف کر دیا۔ چیف انجینئر کا نام رانا محمد اسماعیل تھا۔ ایسے نیک لوگوں کا وجود صارفین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ اس شخصیت کا میں احسان مند ہوں اور اُن کی نیکی کبھی نہیں بھول سکتا۔

نذر سے بے نیاز پیر

میں اپنے دفتری کام کے سلسلے میں ایبٹ آباد مقیم تھا۔ میرے ایک ساتھی جو پیروں اور فقیروں کو ماننے والے تھے، ایک روز مجھ سے کہنے لگے ''ہری پور میں ایک پیر صاحب کی نیکی و پارسائی کے واقعات زبان زدِ عام ہیں۔ اُن کے پاس پاکستان کے صدر غلام اسحاق خاں مع اہل خانہ بھی آتے تھے۔ اُن سے ملا جائے۔

چناں چہ ایک روز راولپنڈی جاتے ہوئے راستے میں ہم نے اُن سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ لوگوں سے پوچھتے ہوئے اُن کے پیر خانے تک پہنچ گئے۔ بہت بڑے احاطے میں پیر خانہ تھا۔ جب ہم گاڑی سے اُترے تو اُن کا ایک ملازم بھاگا ہوا آیا اور کہا کہ آپ کو کس سے ملنا ہے اور کہاں سے آئے ہیں؟ ہم نے بتایا کہ ایبٹ آباد سے آئے ہیں اور پیر صاحب سے ملنا ہے۔ اُس نے کہا کہ پیر صاحب کا حکم ہے کہ جو کوئی بھی آئے، پہلے اُسے کھانا وغیرہ کھلا دُاور اُس کے بعد مجھ سے ملواؤ۔

ملازم نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر میں پانی وغیرہ لے کر آیا اور کہا کہ آپ لوگ منہ ہاتھ دھو لیں، میں کھانا لے کر آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ اور آگئے۔ انھیں بھی ہمارے ساتھ بٹھایا گیا۔ دسترخوان بچھا تو اُس پر گوشت اور سبزی کا سالن چُن دیا گیا۔ دونوں سالن تازہ پکے ہوئے تھے۔ جلد گرما گرم روٹیاں بھی آگئیں۔ کھانا بڑا ذائقے دار تھا۔ کھانے کے دوران کچھ لوگ اور آگئے۔ وہ بھی شاملِ طعام ہوئے۔ کھانے کے بعد حلوہ پیش کیا گیا اور آخر میں سبز چائے۔

جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو پیر صاحب کے ملازم نے کہا کہ اب نمازِ ظہر کا وقت ہو چکا۔ آپ سب لوگ مسجد پہنچیں۔ پیر صاحب وہیں آئیں گے۔ اُسی احاطے میں ایک خوبصورت مسجد واقع تھی۔ ہم لوگ وہاں پہنچے۔ پیر صاحب نے ہمارے ساتھ نماز ادا کی، پھر سب سے فرداً فرداً مصافحہ کیا۔

نماز کے بعد سب لوگ پیر صاحب سے ملنے اُن کے کمرے میں گئے۔ کمرا بالکل سادہ تھا۔ جب سب لوگ آگئے تو پیر صاحب نے مختصر سی تقریر کی جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ سب سے بڑی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ عزت اور وہی ذلت دیتا ہے۔ اُس کی ذات سب کی مشکل کشائی کرتی ہے۔

اُس کے بعد اُنھوں نے اجتماعی دُعا مانگی جو بڑی رقت آمیز اور دل نشین تھی۔ اس کے بعد اُنھوں نے کہا کہ اپنے مسائل مختصر ترین الفاظ میں بتائیے۔ وہ فرداً فرداً سب کو بلاتے، نماز کی تلقین کرتے اور اللہ کا کلام بتاتے کہ یہ پڑھیے۔ کسی کو کوئی مشورہ دینا ہوتا، تو وہ بھی دیتے۔

مجھے سب سے زیادہ اس بات نے متاثر کیا کہ اُن

www.pdfbooksfree.pk

کے سامنے نہ تو کوئی صندوقچی رکھی ہوئی تھی کہ نیاز یا نذرانہ اُس میں ڈالا جائے اور نہ وہ کسی سے کوئی رقم لیتے تھے۔ بلکہ واضح الفاظ میں جگہ جگہ لکھا تھا: "یہاں نذر اور نیاز دینے کی کوشش نہ کریں۔" میں نے زندگی میں پہلا ایسا پیر دیکھا جو ان تمام چیزوں سے مستثنیٰ تھا۔ ورنہ بیشتر پیروں کا یہ اُصول ہوتا ہے کہ آؤ گے تو کیا لے کر جاؤ گے تو کیا دے کر؟ میں یہ کردار بھی نہیں بھول سکتا۔

غریب دوست صنعت کار

کچھ عرصہ قبل اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ لاہور کے ایک پسماندہ علاقے باداہی باغ میں ایک صنعت کار نے واٹر منرل پلانٹ ایک کروڑ روپے کی لاگت سے لگایا ہے جس کا مقصد لوگوں کو صاف شفاف پانی مہیا کرنا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ لوگ ان تمام بیماریوں سے بچ سکیں جو صاف پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے چمٹتی ہیں۔ یہ پانی بغیر کسی معاوضے کے صبح تا شام ملتا ہے۔

خبر میں یہ بھی لکھا تھا کہ لوگوں کو دس لیٹر کے کنٹینر بھی بالکل مفت مہیا کیے گئے ہیں تاکہ پانی لے جانے میں آسانی ہو۔ اُس صنعت کار نے اپنا نام پوشیدہ رکھا۔ بجلی جانے کی صورت میں دو عدد بڑے جنریٹر بھی لگائے گئے تاکہ آنے والوں کو پانی لینے میں دشواری نہ ہو۔

خبر میں یہ بھی بتایا گیا کہ صنعت کار نے پہلے وہاں کے اہلِ ثروت لوگوں سے مدد مانگی، لیکن جب کسی نے تعاون نہ کیا اور کوئی دلچسپی نہیں لی، تو انھوں نے تنہا ہی اس کام کو کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا۔ پلانٹ جدید ترین مشینری سے مزین ہے۔

پلانٹ پر جو عملہ دن رات اس کام میں مصروف ہے، وہ بھی خدمتِ خلق کے جذبے سے عوام الناس کی خدمت کر رہا ہے۔ میرے ایک دوست اُس محلے میں رہتے ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ یہ پلانٹ ہمارے علاقے کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہم اس صنعت کار کا احسان کبھی نہیں بھول سکتے۔

اتفاق سے کچھ عرصہ قبل اُس علاقے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ پانی لینے والوں کی پرسکون قطاریں لگی ہیں اور لوگ بڑے اطمینان سے پانی بھر رہے ہیں۔ اُس صنعت کار سے بھی ملاقات ہوئی جن کا نام محمود رمضان چشتی ہے۔ وہ بہت مخیر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ لاہور میں دو اور جگہوں پر ایسے پلانٹ لگا رہے ہیں: ایک جوڑے پُل پر اور دوسرا عیسائیوں کی بستی، یوحنا آباد میں۔

جوڑے پُل پر پلانٹ کے لیے ۳۲ لاکھ روپے کی زمین خریدی جا چکی اور وہاں پانی کے لیے بورنگ ہو رہی ہے۔ یوحنا آباد میں چند ہفتوں تک کام شروع ہو جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں کسی نیک کام کا ارادہ کروں، تو اللہ تعالیٰ میری مدد کرتا اور مجھے غیبی امداد ملنے لگتی ہے۔

میں اس شخصیت سے بہت متاثر ہوا کہ اُن کا اوڑھنا بچھونا "خدمتِ خلق" ہے۔

کراچی کا بے نام مخیر

چند سال قبل میں نے ایک خبر پڑھی تھی کہ کراچی میں ایک شخص نے اپنے دو بنگلے جو ڈیفنس میں واقع ہیں اور جن کی مالیت بیس کروڑ روپے ہے، ایدھی ٹرسٹ کو تحفتاً دے دیے اور کہا ہے کہ اس کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ بعد میں بنگلوں کی تصاویر اخبارات میں آئیں اور اُن کی تفصیل بھی۔ اُن بنگلوں میں جدید ترین آرائش کی گئی ہے۔ اُس کے فرش ٹیک کی لکڑی کے ہیں اور تمام درآمدی سامان لگا ہوا ہے۔

حکم یہ ہے کہ اللہ کے نام پر وہ چیز خیرات کرو جو تمھیں سب سے زیادہ عزیز ہو۔ عظیم اور یادگار ہیں ایسے لوگ جو "خدمتِ خلق" کا جذبہ رکھتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

دورِ جدید کا انوکھا دھندا

تہمت لگا، پیسا کما

ایک بیروزگار اپنا ضمیر مار کر عجب انداز میں روکڑا کمانے لگا

کنہیالال کپور

رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بڑے آرام سے ہیں۔ اب سوچتے ہیں کہ شروع سے یہ دھندا اختیار کیا ہوتا، تو اب تک ایک ڈی لکس امریکن کار کے مالک ہوتے۔ خیر اب گھوڑا گاڑی ہی غنیمت ہے۔ ان شاء اللہ کار اگلے سال خرید لی جائے گی۔

ہمارے اخبار میں صرف تہمتیں چھپتی ہیں۔ تہمت میں یہ خرابی ہے کہ کسی بھی شخص پر لگایا جا چکا ہو۔ آخر ذاتِ خدا کے علاوہ کون عیوب سے مبرا ہے؟ بڑے سے بڑے دیش بھگت کو بگلا بھگت ثابت کیا جا سکتا ہے۔ وہ صاحب جنھوں نے یتیم خانہ کھول رکھا ہے، ان کے متعلق لکھا جا سکتا ہے کہ موصوف خود یتیموں کی کمائی پر پل رہے ہیں۔

امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم آئے دن کس لیے سنسنی خیز انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم محض سنسنی پھیلاتے ہیں، تو یقیناً آپ حق بجانب نہیں۔ اسی طرح اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مقصد لوگوں کو بے نقاب کرنا ہے، تو اس ضمن میں عرض

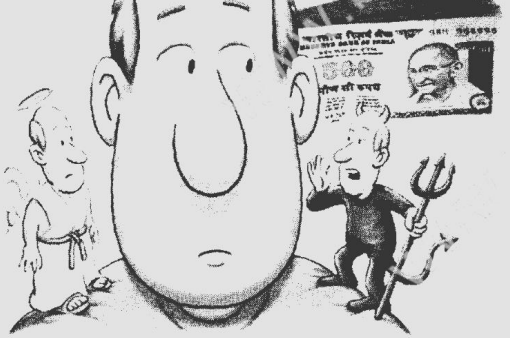

ہمارا خیال ہے، آپ ہم سے غائبانہ طور پر متعارف ہوں گے۔ اگر نہیں تو پھر آپ اس شہر میں نہیں رہتے یا آپ کی واقفیت کا دائرہ ضرورت سے زیادہ محدود ہوگا۔ آخر ہم بھی کوئی معمولی انسان نہیں، ہفتہ وار ''تہمت'' کے ایڈیٹر ہیں۔

ہم نے یہ اخبار کیوں نکالا؟ یہ مت پوچھیے۔ نہایت درد بھری داستان ہے۔ بی۔ اے میں چار بار فیل ہونے کے بعد جب ظالم سماج نے ہمیں چپراسی تک کی نوکری دینے سے انکار کیا، تو تنگ آمد بجنگ کے مصداق ہم نے ہفتہ وار ''تہمت'' کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ پچھلے تین سال سے یہ اخبار نکال

www.pdfbooksfree.pk

ہے، ہم واعظ ہیں نہ ناصح۔ ہم تو فقط ایک کاروباری آدمی ہیں اور ہر سمجھدار بیوپاری کی طرح زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا ہمارا نصب العین ہے۔

ہم روپیہ کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ یہ بھی سن لیجیے۔ اس بڑے شہر میں جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں، سیکڑوں اشخاص ایسے بھی ہیں جن کے اعصاب پر احساس جرم سوار رہتا ہے۔ جنھیں ہر وقت پولیس یا خفیہ پولیس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ یہی لوگ ہمارے ان داتا ہیں کیونکہ ہم ان کی نفسیات خوب سمجھتے ہیں۔ آپ شاید ہمارا مطلب نہیں سمجھے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

چند مہینے ہوئے ہم نے جلی حروف میں ایک سرخی چھاپی: ''شہر کے معزز ترین رئیس کی کارستانی۔ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے جعلی رجسٹر۔'' اس سرخی کے تحت ہم نے اپنے خاص نامہ نگار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا (یاد رہے، ہم خود ہی اپنے اخبار کے خاص نامہ نگار، منیجر اور چیف ایڈیٹر بھی ہیں) ہاں تو ہم نے انکشاف کیا کہ ایک رئیس پچھلے پانچ سال سے محکمہ انکم ٹیکس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ حالانکہ اس کی آمدنی دو لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن اس نے افسروں کو دھوکا دینے کے لیے جعلی رجسٹر بنا رکھے ہیں۔ سازش میں اس کی بیوی کے علاوہ بڑا بیٹا بھی شامل ہے۔ ممکن ہے، اس کی بہو کا بھی ہاتھ ہو۔ مزید انکشاف کی توقع ہے۔

جس دن یہ خبر چھپی، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ایک درجن روسا اخبار ''تہمت'' کے دفتر میں (جو ہمارا غسل خانہ بھی ہے) ہم سے ملاقات کرنے آ پہنچے۔ لطف یہ کہ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو معزز ترین سمجھتا تھا۔ قریب قریب ہر ایک نے منت سماجت کے لہجے میں درخواست کی ''ہم اس کا نام اور پتا اخبار میں شائع نہ کریں نہیں تو غضب ہو جائے گا۔''

اس سے پیشتر کہ ہم اس خدمت کا معاوضہ طلب کرتے، ہر کسی نے بڑی شرافت سے معقول رقم نذر کرتے ہوئے کہا کہ میری عزت آپ کے یعنی اخبار ''تہمت'' کے ہاتھ میں ہے۔

دو ہفتے قبل کا ذکر ہے، ہماری اس سرخی نے قیامت برپا کر دی: ''نوجوان بہو کو قتل کرنے کی خطرناک سازش۔'' دو کالم کی اس چٹ پٹی خبر میں ہم نے ایک فرضی سسر اور ساس کا ذکر کیا جو روپے کے لالچ میں اپنی نوجوان اور خوبصورت بہو کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہم نے لکھا ''محض اس لیے کہ وہ بدبخت جہیز میں موٹر کے بجائے اسکوٹر لائی تھی، حریص ساس اور سسر اس کا قصہ تمام کرنا چاہتے ہیں۔ قارئین تفصیل کا انتظار کریں۔''

یہ خبر پڑھ کر ایک سیٹھ صاحب ہانپتے کانپتے وارد ہوئے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم کہ ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے حالانکہ دسمبر کا مہینا تھا۔ اکھڑے اکھڑے انداز میں کہنے لگے ''ایڈیٹر صاحب! خدا کے لیے اس قصے کی تفصیل چھاپنے سے احتراز کیجیے نہیں تو میری آبرو مٹی میں مل جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کبھی اپنی بہو کو تنگ نہیں کروں گا۔ اس کو اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔ اگر وہ جہیز میں موٹر کے بجائے اسکوٹر لائی ہے، تو میں اسی پر قناعت کر لوں گا۔

ہم نے کہا ''یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن آپ کو معلوم ہے، جب اخبار ''تہمت'' اپنی زبان کھولتا ہے تو اسے خاموش کرانے کے لیے... آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں نا... یعنی...''

''جی ہاں! میں آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ فی الحال پچاس ہزار روپے کی حقیر رقم حاضر ہے۔ اگر یہ کافی نہیں تو کچھ اور۔''

www.pdfbooksfree.pk

”بس مبلغ پچاس ہزار اور بھجوا دیجیے، معاملہ رفع دفع کر دیا جائے گا؟“

آپ شاید یہ پوچھنا چاہیں گے کہ ہمارے قارئین نے اس قصے کی مزید تفصیل پڑھنے پر کیوں اصرار نہیں کیا؟ تو صاحب، وجہ یہ ہے کہ ہم نے اگلے شمارے میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ قصوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک کا عنوان تھا ”چار سوبیس کی دلچسپ مثال۔“

”پنسلین کے بجائے پانی کے ٹیکے۔“ دوسرے کی سرخی تھی: ”افیم چھڑانے کے لیے افیم کی گولیوں کا استعمال۔“ ظاہر ہے کہ جب قارئین کو رونگٹے کھڑے کر دینے والی خبریں پڑھنے کو ملیں، تو وہ ساس اور بہو کے جھگڑے میں کیوں دلچسپی لیں گے؟ اپنے خاص الخاص نامہ نگار (یعنی اپنی) ہی وساطت سے ہم نے ایک ڈاکٹر کی خباثت کا بھانڈا پھوڑتے ہوئے لکھا کہ وہ مریضوں کو پنسلین کے بجائے پانی کے ٹیکے لگاتا ہے۔ ہم نے مطالبہ کیا کہ معاملے کی فوری تحقیق کر کے بدطینت ڈاکٹر کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ موخرالذکر خبر میں ہم نے ایک یونانی حکیم کی قلعی کھولتے ہوئے بتایا کہ وہ افیم چھڑانے کے لیے افیم ہی کی گولیوں پر شکر کی تہ چڑھا کر، استعمال کراتا ہے۔ اب آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتنے ڈاکٹر اور حکیم معاملہ طے کرنے بھاگم بھاگ ہمارے پاس پہنچے اور کس کس چیز کا واسطہ دے کر انھوں نے درخواست کی کہ ہم ان کے تجارتی راز فاش کرنے کی مزید کوشش نہ کریں۔ ہم نے انھیں کاروبار جاری رکھنے کی اس شرط پر اجازت دی کہ ”تہمت“ کے بھونچال فنڈ میں، تین تین سو روپے چندہ جمع کرائیں۔ ”تہمت بھونچال فنڈ“ ہماری جدت اور ایجاد ہے۔ یہ فنڈ اس ”بھونچال“ کے لیے جمع کیا جا رہا ہے جو کبھی آیا ہے نہ آئے گا۔

تو صاحب! یہ ہے ہمارا دولت کمانے کا طریقہ! آپ کی دعا سے ایسا دماغ پایا ہے کہ ہر روز نئی نئی سرخیاں سوجھتی ہیں۔ قارئین کو سنسنی خیز خبریں پڑھنے کا ایسا چسکا پڑ چکا کہ اخبار ملنے میں دیر ہو جائے تو کھوئے کھوئے نظر آتے۔ یہ بالکل ایسی ہی ہے جیسا ہونا چاہیے۔ آخر ”تہمت“ کے علاوہ کون سا اخبار ہے جو انھیں اس پائے کی سرخیاں دے سکے؟ ایک کم سن پروفیسر کا تیسرا معاشقہ...... بوڑھے خاوند کی نوجوان بیوی کا پُراسرار فرار...... خادمہ سے محبت کرنے کا شاخسانہ، وغیرہ وغیرہ۔

ہم جانتے ہیں، آپ کے ذہن میں یہ سوال چٹکیاں لے رہا ہے کہ ہمارا ضمیر یہ سب چھاپنے کی اجازت کس طرح دیتا ہے؟ تو صاحب اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرحوم ضمیر کو خدا بخشے، ہمیں مدتوں سمجھاتا رہا۔ ہم نے اس بھلے مانس کو صرف ایک مصرع سنا کر خاموش کر دیا۔ یعنی اب تو آرام سے گزرتی ہے۔

مادی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو لوگ ضمیر کی ضرورت سے زیادہ پروا کریں، عموماً بزدل ہونے کے علاوہ تنگدست بھی ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے، ہم پر بزدلی کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی اور ہم نے دین و دنیا میں سے موخرالذکر کا انتخاب کیا ہے۔ صاحب ہمارا تو تجربہ ہے کہ آدمی ضمیر کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ یقین نہ آئے تو خود تجربہ کر کے دیکھ لیجیے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ آپ کے مرنے پر سنگ لحد پر یہ شعر لکھ دیا جائے گا۔

تہمت چند اپنے ذمہ دھر چلے
جس لیے آئے تھے، ہم سو کر چلے

اچھا صاحب تو یونہی سہی! کم از کم آپ یہ تو تسلیم کریں گے کہ بہت اچھا شعر ہے اور اتنے اچھے شاعر کا! ہماری مانیے تو لوگوں کو یہ شعر گنگنانے دیجیے اور خود سکون سے قبر میں آرام کیجیے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

شعرِ اقبال راہنمائے ملت ہے

"بانگِ درا" سے ولولہ انگیز اور سیرت ساز اشعار کا خوبصورت انتخاب

محسن فارانی

علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؒ ملی شاعر، مفکرِ اسلام اور مصورِ پاکستان ہیں۔ انھوں نے جب شعور کی آنکھ کھولی، عالمِ اسلام تباہ حال تھا۔

اپنے فاضل استاد، مولوی سید میر حسن کی فکری راہنمائی میں انھوں نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کا مطالعہ کیا اور ملت اسلامیہ کی موجودہ حالتِ زار کو دیکھا، تو گہرا تاثر لیا۔ انھیں مبدأ فیاض سے سخن فہمی اور شعر گوئی کا وافر حصہ عطا ہوا تھا جسے انھوں نے ملت کی ترجمانی، اتحادِ اُمت، اسلامی فکر اجاگر کرنے، مغربی فکر اور فرنگی سامراج پر تنقید، مسلمانانِ ہند کو خوابِ غفلت سے جگانے اور انھیں ملی شعور سے آشنا کرنے کے لیے وقف کر دیا۔

علامہ اقبالؒ نے دیکھا کہ کریمیا، چیچنیا، ہندوستان، عدن (یمن)، ترکستان، انڈونیشیا، ملایا، الجزائر اور دیگر کئی اسلامی خطوں پر یورپی مسیحی اقوام قابض ہو چکیں اور مسلمان اپنی عظمت رفتہ کھو چکے۔ اس کا اقبالؒ کو بڑا قلق تھا۔ وہ "یادِ ایامِ سلف" سے اپنا دل تڑپاتے تھے اور "تصویرِ درد" میں تمام عالمِ اسلام کا درد ان کے اس شعر میں سمٹ آیا۔

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا!
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

علامہ نے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کی فکر کرنے، فرقہ آرائی اور تعصب سے بچنے اور "راہِ عمل میں گامزن" ہونے کی تلقین کرتے ہوئے انتباہ کیا۔

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

www.pdfbooksfree.pk

اقبالؒ کے نزدیک ''قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ'' کی بنیاد عقیدۂ توحید اور دینِ اسلام ہے، چناں چہ وہ وطنیت (نیشنلزم) کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری
جذبِ حرم سے ہے فروغِ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے

علامہ اقبالؒ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بذریعہ بحری جہاز انگلستان روانہ ہوئے۔ بحیرۂ روم کے اطالوی جزیرے، سسلی (صقلیہ) کے قریب سے گزرے، تو وہ بے اختیار وہاں کے اسلامی دور (۸۲۷ء تا ۱۰۹۱ء) کی یاد میں تڑپ اٹھے اور کہنے لگے۔

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

مغرب کے یہود و نصاریٰ کو شاعر قوم نے یوں انتباہ کیا۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

علامہ اقبالؒ وطنیت اور قوم پرستی کے شدید مخالف تھے۔ وہ اسے ''بت تراشیدۂ تہذیبِ نوی'' اور ''غارت گر کاشانۂ نبوی'' قرار دیتے۔ ان کے نزدیک وطنیت کا پیرہن مذہب کا کفن ہے، فرماتے ہیں۔

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' میں علامہ اقبالؒ ''نوجوان مسلم'' کو غور و تدبر کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارہ
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں، تو دل ہوتا ہے سیپارا

انہی دنوں مصطفیٰ کمال پاشا نے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کی علامت عثمانی خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس پر اقبالؒ نے بڑی دردمندی سے کہا۔

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

طویل نظم ''شمع و شاعر'' میں علامہؒ نے مسلمانانِ ہند کے ہندوانہ رسوم اپنانے پر یوں دکھ کا اظہار کیا۔

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں
وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اگلے بند میں قوم کو اتحادِ ملت کی اہمیت اور ضرورت کا

www.pdfbooksfree.pk

احساس دلاتے ہیں۔

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آخری بند میں وہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہونے کا منظر یوں دکھاتے ہیں۔

آ ملیں گے سینہ چاکانِ وطن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

توحید اور اس پر کاربند رہنا کلامِ اقبالؒ کا خاص موضوع ہے۔ وہ نظم ''مسلم'' (جون ۱۹۱۲ء) میں کہتے ہیں۔

ہم نشیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

علامہ اقبالؒ تصور میں رسالت مآب ﷺ کے حضور جا پہنچتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ پوچھتے ہیں: ''ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے آئے؟'' اقبالؒ عرض کرتے ہیں: ''حضور! ہزاروں لالہ وگل ہیں ریاضِ ہستی میں۔

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی

بادشاہی مسجد لاہور کے مجمع میں اقبالؒ نے جب یہ شعر پڑھا، تو لوگ چونک اٹھے کہ بھلا وہ کیا شے ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی۔ علامہ نے پھر نہایت دلسوزی سے یہ شعر پڑھا۔

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

راوی لکھتے ہیں کہ اس شعر پر حاضرین دھاڑیں مار مار کر رونے اور دیواروں سے ٹکریں مارنے لگے کہ انہی دنوں اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر قبضہ کرنے کے لیے وحشیانہ فوجی قوت استعمال کرتے ہوئے ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔

علامہؒ اپنی شہرۂ آفاق نظم، جوابِ شکوہ کے ایک بند میں فرائضِ دین کی پابندی اور اتحادِ ملت کا سبق یوں دیتے ہیں۔

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے، ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمھی کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے!
قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

فرقہ بندی اور ذات پات کے افتراق اور قبر پرستی سے نجات پانے کی اس طرح تلقین کرتے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبال نہایت دردمندی سے مسلمانوں کو اغیار کے طور طریق اپنانے سے باز رہنے کا احساس دلاتے ہیں۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

وہ ہمارے ''سراپا کردار'' اسلاف کا موجودہ ''سراپا

www.pdfbooksfree.pk

گفتار" مسلمانوں سے تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اگلے اشعار میں "ابراہیمی ایمان" رکھنے اور "نورِ توحید" کو دنیا بھر میں پھیلانے کی تاکید کرتے ہوئے فرمانِ الٰہی ان الفاظ میں سناتے ہیں ۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں عشقِ محمدؐ سے اُجالا کر دے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہؒ نے عالمِ اسلام پر مسلط شدہ مغربی نظامِ تعلیم کے مضر اثرات سے نجات پانے پر یوں توجہ دلائی ۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم!
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

۱۹۱۲ء ہی میں اقبالؒ نے "فاطمہ بنت عبداللہ" نامی مجاہدہ پر نظم لکھی جو معرکۂ طرابلس (لیبیا) میں غازیانِ اسلام کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی۔ اس میں کہتے ہیں ۔

فاطمہ! تُو آبروئے اُمت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

فردوس میں ایک مکالمہ "میں اقبالؒ جدید مغربی تعلیم کے منفی پہلو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی طائرِ دیں کر گیا پرواز

دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

"بانگ درا" کی طویل نظم "خضرِ راہ" میں خضر کی زبانی اقبالؒ نے مروجہ جمہوری نظام پر شدید تنقید کی ہے، ملاحظہ کیجیے ۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

جب علامہؒ نے یہ نظم لکھی، وہ جنگِ عظیم اوّل (۱۴۔۱۹۱۸ء) کا زمانہ تھا۔ ترکی جرمنی کا حلیف تھا اور انگریز جاسوس لارنس آف عریبیا نے شریفِ مکہ حسین بن علی ہاشمی اور اس کے بیٹوں عبداللہ، فیصل اور زید کو ترکی کے خلاف غداری پر آمادہ کر لیا جس کے نتیجے میں ترکوں کو حجاز، فلسطین، اردن، شام اور عراق خالی کرنے پڑے اور ان پر برطانیہ اور فرانس نے قبضہ کر لیا۔ البتہ حجاز میں غدارِ ملت حسین ہاشمی کی بادشاہت قائم ہو گئی۔ اس پر اقبالؒ نے "خضرِ راہ" میں کہا ۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

www.pdfbooksfree.pk

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

خضر نے اقبالؒ کو "رازِ دوامِ زندگی" بتاتے ہوئے کہا۔

برتر از اندیشۂ سُود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ!
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے، ضمیر کُن فکاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تُو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

خضر "میراثِ خلیل" یعنی بیت المقدس (فلسطین) پر برطانوی صلیبیوں کے قبضے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تُو کہ تیرا دل نہیں رازِ

ان ناساز گار حالات میں خضر نے مسلمانوں کی نجات کا جو گُر بتایا وہ آج بھی اُمت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

رابط و ضبطِ ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

سنہری باتیں

☆ اے ایمان والو! تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔

☆ بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔

☆ اپنے رب سے گڑگڑا کر چپکے چپکے دعا کرو۔

☆ ہمیشہ انصاف کی بات کرو چاہے تمھارے کسی عزیز کو نقصان نہ پہنچ جائے۔

☆ تم نماز ادا کرو، زکوٰۃ دو اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

☆ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔

☆ مسلمانو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

(ماریہ ملک، لاہور)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

"بانگ درا" کی آخری طویل نظم "طلوعِ اسلام" میں علامہؒ نے مردِ مسلماں کو تلقین کی ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
تمدن سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

www.pdfbooksfree.pk

ایک بچے کا انوکھا سفر

مجھے سمندر کی تلاش ہے

اس دور کا فسانہ عجب جب انسان کائنات کی وسعتوں میں منتشر ہو چکا

ملک محمد شاہد اقبال

"مجھے سمندر دیکھنا ہے۔ میں اسے دیکھے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔" اس نے اپنے آپ سے عہد کیا اور صبح سویرے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کئی دن سے اس مہم کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ اس نے پوری رات جاگ کر گزاری اور وہ تمام ضروری اشیا اپنے بیگ میں رکھ لیں جن کی طویل سفر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس کی طبیعت کا ضدی پن والدین کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث بنتا تھا۔ آج یہی ضد اسے سب کچھ چھوڑ کر سمندر دیکھنے گھر سے باہر لے جا رہی تھی۔

صبح پانچ بجے اس نے آہستہ سے اپنا بھاری بیگ کندھے پر اٹھایا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ والدین ابھی سو رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں سات بجے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ تب تک یقیناً وہ بہت دور جا چکا ہوگا۔

اس کا گھر وسیع میدان پر واقع تھا۔ گھر سے باہر نکل کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ "سمندر کس سمت ہو سکتا ہے؟" اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا، کتاب میں پڑھا

www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ سورج مغرب میں سمندر کے اندر غروب ہوتا ہے۔ لہٰذا مغرب کی سمت چلنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی بہتر تھا کہ طلوع ہونے کے بعد سورج کی طرف اس کی پشت رہتی۔ یوں وہ سورج کی براہ راست تمازت سے محفوظ رہتا۔ لڑکے نے فیصلہ کرنے کے انداز میں گہرا سانس لیا اور مغرب کی سمت تیزی سے چلنے لگا۔

اس کی عمر صرف آٹھ سال تھی لیکن آنکھوں میں نوجوان کا عزم صاف جھلکتا۔ اس نے اپنی درسی کتاب میں سمندر کی صرف تصویریں دیکھی تھیں۔ ان کے مطابق سمندر نیلے پانی کا ایسا بڑا ذخیرہ تھا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہ آتا۔ اس کے شفاف پانی میں وہیل اور شارک جیسے دیوہیکل حیوان گھومتے پھرتے۔ اس نے تیرتے آکٹوپس اور رنگ برنگی ننھی مچھلیوں کے غولوں کی تصاویر بھی دیکھیں۔ سمندر میں تیرتے ایسے بڑے بحری جہاز بھی دیکھے جن پر ہزاروں افراد سوار ہوتے۔

> وہ اکثر خواب دیکھتا، ساحل پر کھڑا ہے اور موجیں اس کے پاؤں میں گدگدی کر رہی ہیں۔

وہ سوچتا کہ حدِ نگاہ تک پھیلا پانی، اٹھکیلیاں کرتی موجیں اور ساحل پر بکھری خوبصورت سیپیاں کیسا خوبصورت منظر پیش کرتی ہوں گی۔ وہ اکثر خواب دیکھتا، ساحل پر کھڑا ہے اور موجیں اس کے پاؤں میں گدگدی کر رہی ہیں۔ وہ سوچتا کہ ساحل پر کھڑے ہو کر حدِ نگاہ تک پھیلے سمندر کو دیکھنا کیسا دلکش لگتا ہوگا۔ اس کا ننھا دماغ اتنے زیادہ پانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے دماغ میں وسیع نیلے سمندر کا یہ تصور لیے وہ پختہ عزم کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

جب قصبے کی حدود سے باہر نکلا، تو صبح کا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا لیکن سورج نہیں نکلا تھا۔ قصبے کے باہر اس نے ایک بوڑھے کو دیکھا۔ وہ ہمیشہ سڑک کنارے چہرہ آسمان کو تکتا رہتا۔ بوڑھے کو دیکھتے ہی لڑکے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''شاید یہ مجھے روکنے کی کوشش کرے۔'' اس نے سوچا اور قدموں کی رفتار کچھ تیز کر لی، لیکن اسی وقت بوڑھے نے بھی اسے دیکھ لیا۔

''اے لڑکے! اتنی صبح کہاں جا رہے ہو؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''سمندر دیکھنے۔'' لڑکے نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''سمندر؟'' بوڑھے نے پوپلا منہ کھولا اور ہنس پڑا۔ ''اچھا خیال ہے۔ مگر تمھیں اوپر جانا ہوگا۔'' اس نے کپکپاتی انگلی سے دور واقع اونچے پہاڑ کی سمت اشارہ کیا۔

لڑکے نے اوپر دیکھا، آسمان پر ستارے غائب ہو چکے تھے اور سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ لڑکے نے بوڑھے کی بے معنی بات کا جواب دینے کے بجائے دوڑ لگا دی۔ ''اس بوڑھے کا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے۔ سمندر پہاڑ پر کیسے ہو سکتا ہے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ پہاڑ مغرب کی سمت ہی واقع تھا، لہٰذا اس کا سفر جاری رہا۔

کچھ دور جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، بوڑھا پہاڑ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ''یہ واقعی سٹھیا گیا ہے۔'' لڑکے نے سوچا۔

تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول گیا اور زبان خشک ہو گئی۔ اس نے رک کر بیگ سے بوتل نکالی اور چند گھونٹ پانی پیا۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اپنا کھانا بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ ''نجانے سمندر کتنی دور ہو، مجھے اپنی غذا احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا ہوگی۔'' لڑکے نے سوچا۔

جلد وہ ایک چھوٹی پہاڑی تک پہنچ گیا۔ چوٹی پر

www.pdfbooksfree.pk

کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کسی بھی سمت سمندر کی علامت نظر نہ آئی۔ اب سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ لڑکے کو بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پشت پر لدا بیگ اتارا اور تھوڑا سا کھانا کھا لیا۔ پہاڑی سے اترنے کے بعد سامنے ایک وسیع چٹیل میدان اور دوسری طرف پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ نظر آرہا تھا۔ جب وہ میدان عبور کر کے ان پہاڑیوں کے قریب پہنچا، تو سورج ڈھلنے لگا تھا۔

"یقیناً ان پہاڑیوں کے پیچھے سمندر ہوگا جس میں یہ سورج غروب ہوتا ہے۔" اس نے سوچا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے پہاڑی سلسلہ عبور کرنے لگا۔ جب وہ آخری پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا، تو یہ دیکھ کر اس کے ہونٹ سکڑ گئے کہ سامنے ایک اور وسیع و عریض چٹیل میدان موجود تھا۔ اسی کے کنارے وہ بلند پہاڑ واقع تھا۔ غروب ہوتے سورج کی سرخ روشنی میں وہ بڑا عظیم الشان لگ رہا تھا۔

لڑکے نے چلنا جاری رکھا۔ وہ حیران تھا کہ اتنے طویل سفر کے دوران راستے میں نہ کوئی قصبہ آیا تھا اور نہ ہی کسی انسان کی شکل دکھائی دی۔ خوراک کا ذخیرہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ سمندر اتنی دور کیوں ہے؟ بہرحال وہ چلتا اور مسلسل چلتا رہا۔ اسے یاد بھی نہیں رہا کہ راستے میں کتنی بار سویا۔ سوتے جاگتے اس کے ننھے ذہن میں صرف سمندر دیکھنے کی تمنا بسی تھی۔ اسے کسی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اسے ایک بار بھی اپنے ماں باپ کا خیال نہ آیا جو اس کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔

تکان کی وجہ سے جب بھی اسے نیند آتی، وہ خواب میں سمندر میں تیرتی مچھلیاں دیکھتا، خود کو لہروں سے کھیلتا پاتا اور نیلگوں پانی میں تیرتے ہوئے لطف اٹھاتا۔ اسے اردگرد رنگ برنگی مچھلیاں گھومتی نظر آتیں جو اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتیں۔

سفر کے دوران وہ یہی سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار سمندر کو دیکھے گا، تو اس کی دلی کیفیت کیا ہوگی؟ تب کیا سمندر کی لہریں بپھری ہوں گی یا پانی خاموش کھڑا ہوگا؟ کیا ساحل پر اسے اپنے جیسے کچھ اور لوگ بھی ملیں گے جو سمندر کو تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچے اور اس کی خوبصورتی دیکھ کر ہمیشہ کے لیے وہیں رہنے پر مجبور ہو گئے؟

ٹانگوں میں چلنے کی سکت ختم ہو رہی تھی لیکن وہ دانت بھینچے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ پانی اور خوراک کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سامان کا تھیلا راستے ہی میں پھینک دیا۔ یوں کاندھوں کا بوجھ کچھ کم ہوا اور وہ مزید کچھ دیر چلنے کے قابل ہو گیا۔ جب وہ پہاڑ کی چوٹی سے کچھ ہی دور تھا، تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، وہاں دو چاند چمک رہے تھے۔ ان کی روشنی میں وسیع و عریض چٹیل میدان کی سرخ مٹی حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہ سانس لینے میں دشواری محسوس کرنے لگا۔ اس کے خلائی لباس میں موجود آکسیجن کا ذخیرہ ختم ہونے کو تھا۔

اسی لمحے لڑکے کو جانب مغرب عجب نظارہ نظر آیا..... وہاں ایک نیلا تارہ افق پر جگمگا رہا تھا۔ اس نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً وہ رات کو پہاڑ کی اوٹ میں چھپ جاتا تھا۔

یہ زمین تھی اور سمندر بھی وہیں واقع تھا۔ جو اسے دور نظر آ گیا۔ لیکن لڑکا کبھی وہاں نہ پہنچ سکا۔ اب مریخ سے کسی انسان کے لیے واپس زمین پر جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ قدرتی آفات کے باعث وہاں سے نوع انسانی مٹ چکی تھی۔ اور مریخ پہ آباد انسان ایسے ذرائع نہیں رکھتے تھے کہ اپنی جنم بھومی لوٹ جاتے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

سقراط نے کہا تھا کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں سب کو بدل بدل کر بانٹی جائیں، تو جو لوگ اس وقت خود کو بدنصیب سمجھ رہے ہیں، وہ نئی تقسیم کو مصیبت اور پہلی کو نعمت سمجھیں گے۔ اسی موضوع پر ایک انگریز ادیب، جوزف ایڈیسن نے مضمون لکھا "The Endeavour of mankind to get rid of their burden"۔ اسی سے متاثر ہو کر محمد حسین آزاد نے ایک تمثیلی مضمون لکھا "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا"۔ یہ مضمون اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکا اور ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کے نصاب میں شامل رہا ہے۔ زیر نظر مضمون بھی اسی سلسلے میں نئے انداز اور خیال سے لکھا گیا۔

ہم نے اس عالم رنگ و بو میں جس میاں بیوی کو دیکھا، وہ ایک دوسرے سے تنگ ہی نظر آئے۔ بظاہر خوش و خرم نظر آنے والے جوڑے کو دیکھ کر غلط فہمی ہوتی کہ میاں بیوی واقعی ایک دوسرے سے خوش ہیں۔ لیکن جب ذرا قریب ہو کے حقیقت حال دریافت کیا، تو یہی پتا چلا، اگر دنیا میں مصیبت کی کوئی مجسم شکل ہے، تو وہ اس کا ساتھی۔

یہ طرفہ تماشا بھی دیکھا کہ ہر کوئی اپنے ساتھی کو، تو مصیبت اور دوسرے کے ساتھی، کو نعمت سمجھتے ہوئے حسد میں بھی مبتلا ہے۔ وہ تمنائی ہے کہ کاش میں کسی طریقے سے اپنا ساتھی بدل سکتا۔ یورپ میں اسی سوچ کے تحت ایسے کلب قائم ہیں جہاں میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو کر جسے پسند کریں، اس کے ساتھ ناچ بھی سکتے

شادی شدہ جوڑے کسی حال میں خوش نہیں رہتے

مغربی بے غیرتی اختیار کرنے سے بھی نتیجہ ڈھاک کے تین پات نکلا

خادم حسین مجاہد

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ اگر دل مل جائیں، تو اکٹھے وقت بھی گزار سکتے ہیں۔ بس کلب کی رکنیت لیجیے اور فائدہ اٹھائیں، طلاق کی ضرورت نہ نئے معاہدہ نکاح کی! چونکہ انسان فطرتاً تغیر پسند ہے اور مرغ بھی روز ملے، تو دال کی خواہش کرنے لگتا ہے، اسی انسانی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر کلب والے نوٹ چھاپتے ہیں۔

شاید انہی مغربی اثرات کے تحت حکومت آزادستان کی پارلیمنٹ کے بعض ارکان نے بل پیش کیا کہ ہر شادی شدہ مرد و عورت کو زندگی میں کم از کم ایک بار باہمی رضا مندی سے ساتھی بدلنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ بعض بزرگ اور کنوارے ارکان نے اس بل کی مخالفت کی مگر شادی شدہ مرد اور عورتیں اکثریت میں تھے۔ چونکہ جمہوریت میں دو احمقوں کی رائے ایک دانا کی رائے سے بالاتر ہوتی ہے، اسی لیے بل پاس ہی نہیں بلکہ نافذ بھی ہو گیا۔

پارلیمنٹ کے اندر اور باہر مذہب پسندوں نے بہت ہنگامہ کیا کہ جب طلاق اور عقد ثانی کا باعزت راستہ موجود ہے، تو اس مغربی بے غیرتی کی کیا ضرورت؟ چونکہ وہ اقلیت میں تھے، اس لیے ڈنڈوں کے زور پہ انھیں خاموش کرا دیا گیا۔

جلد ہی ہر شہر میں بڑے بڑے پنڈال، میدان، ہال، کنونشن سنٹر، اسٹیڈیم اور آڈیٹوریم وغیرہ آباد ہو گئے جہاں لوگ اپنے ناپسندیدہ ساتھی کو چھوڑ کر مرضی کا ساتھی چن سکتے تھے۔ اب ہوا یہ کہ کسی مرد نے اپنی بدزبان بیوی کو چھوڑا، تو کسی نے لگائی بجھائی کی ماہر کو..... کسی نے بدصورت بیوی چھوڑی، تو کسی نے سیاہ رنگت والی۔ کسی نے مسکین بیوی چھوڑی، تو کسی نے غیبت کرنے والی۔ کسی نے لڑاکا بیوی چھوڑی، تو کسی نے حاکمانہ مزاج والی۔ کسی نے پھوہڑ بیوی کو چھوڑا، تو کسی نے بدکردار کو۔ کسی نے سازشی بیوی کو چھوڑا، تو کسی نے جاہل کو۔ کسی نے ان پڑھ بیوی کو خیر باد کہا، تو کسی نے زیادہ پڑھی لکھی کو۔ کسی نے ملازمت پیشہ بیوی چھوڑی، تو کسی نے چیخم دھاڑ کرنے والی کو!

اسی طرح کسی عورت نے کنجوس مرد کو چھوڑا، تو کسی نے فضول خرچ کو، کسی نے کالے مرد کو چھوڑا، تو کسی نے گھنگنے کو۔ کسی نے شکی مزاج مرد چھوڑا، تو کسی نے بزدل۔ کسی نے سخت غیر مرد سے چھٹکارا پایا، تو کسی نے ہتھ چھٹ سے۔ کسی نے نکھٹو شوہر چھوڑا، تو کسی نے دل پھینک! کسی نے ان پڑھ مرد چھوڑا، تو کسی نے غریب! کسی عورت نے نشئی مرد چھوڑا، تو کسی نے جواری! کسی نے بدتہذیب مرد کو چھوڑا، تو کسی نے ظالم کو! غرض ہر کسی نے کسی ناپسندیدہ خصلت یا خامی کے سبب اپنا جیون ساتھی چھوڑ دیا۔

یہ قدم اٹھانے والے سبھی مرد و زن نے نہایت خوشی و آزادی محسوس کی۔ حتیٰ کہ اکثریت تنہا ہی واپس جانے لگی، مگر حکومتی کارندوں نے روک لیا کہ بدلے میں ساتھی ضرور منتخب کرنا پڑے گا کہ قانون یہی کہتا ہے۔ اکثریت اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتی تھی مگر حاکم حکم مرگ مفاجات سے مجبور ہو کر لوگ نئے ساتھی تلاش کرنے لگے۔

اب ہوا یوں کہ جس مرد نے کالی بیوی چھوڑی تھی اس نے گوری چٹی کا انتخاب کیا۔ مگر جلد ہی اس کے نخروں سے عاجز آ گیا۔ جس نے بدزبان بیوی چھوڑ کر خاموش طبع بیوی پسند کی، وہ لگائی بجھائی کی ماہر اور سازشی نکلی۔ جس نے بدصورت بیوی چھوڑ کر خوب صورت کا انتخاب کیا، وہ بدکردار نکلی۔ اسے ہر وقت اس کا پہرہ دینا پڑا۔ جس نے سادہ مزاج بیوی چھوڑی تھی، اس کی نئی بیوی حد سے زیادہ لڑاکا نکلی۔ جس نے پھوہڑ بیوی چھوڑی تھی اس کی نئی بیوی

www.pdfbooksfree.pk

حاکمانہ مزاج والی اور خود سر نکلی۔ جس نے ان پڑھ بیوی چھوڑ کر پڑھی لکھی پسند کی، اس نے چند ہی دن میں بحث و تکرار سے اس کا ناطقہ بند کر دیا۔

جس نے گھریلو بیوی چھوڑ کر ملازمت پیشہ پسند کی، موصوفہ نے اس کی اور گھر والوں کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا۔ الٹا اسے اس کی خدمت کرنا پڑی حتیٰ کہ ناشتہ تک بنا کے دینا پڑتا اور کبھی کبھی تو اس کا سر اور ٹانگیں بھی دبانا پڑتیں۔ جس نے علم دشمن بیوی کو چھوڑ کر مطالعے کی شوقین عورت کا انتخاب کیا، وہ ہر وقت کتابوں اور رسالوں میں گھسی رہتی حتیٰ کہ دودھ اور ہانڈی چولھے پر ابل جاتی۔

اسی طرح جس عورت نے کنجوس مرد کو چھوڑا، اس کا نیا شوہر فضول خرچ نکلا۔ جس نے فضول خرچ کو چھوڑا تھا، اسے کنجوس مل گیا۔ جس نے کالے کو چھوڑ کر گورے کا انتخاب کیا، لڑکیاں اس کا پیچھا ہی نہ چھوڑتی تھیں۔ جس نے ٹھگنے مرد کو چھوڑ کر اونچے لمبے مرد کا انتخاب کیا، وہ اس کے ساتھ چلتی خود کو چھوٹا محسوس کرتی۔ ٹھگنا مرد، تو اس سے دب کر رہتا تھا مگر لمبو جی اسے خاطر ہی میں نہ لاتے۔

جس عورت نے شکی مزاج مرد کو چھوڑا تھا، اس کا نیا شوہر حد سے زیادہ لاپروا نکلا۔ جس نے بزدل خاوند کو چھوڑا تھا، اس کا نیا مرد ظالم اور ہتھ چھٹ نکلا۔ جس نے سخت گیر مرد کو چھوڑا تھا، اسے بے غیرت مل گیا۔ جس نے نکھٹو شوہر چھوڑ کر کماؤ ڈھونڈا، وہ اتنا مصروف رہتا کہ اس کے پاس بیوی کے لیے وقت ہی نہ تھا۔ جس عورت نے ان پڑھ مرد کی جگہ عالم فاضل مرد چنا، وہ اتنا بڑا دانشور تھا کہ اسے اندرون و بیرون ملک دوروں اور لیکچرز ہی سے فرصت نہ تھی۔

جس عورت نے دل پھینک مرد کو چھوڑا تھا، اس کا نیا شوہر سنگدل نکلا۔ جس نے غریب خاوند چھوڑ کر امیر پسند کیا، وہ اس کی ضروریات تو پوری کرتا، مگر اسے ذرا برابر اہمیت دینے کو تیار نہ تھا۔ جس نے نشئی مرد چھوڑا تھا، اس کا نیا مرد جواری نکلا۔ جس نے جواری چھوڑا تھا، اس کا نیا خاوند نشئی نکلا۔ جس نے سادہ مزاج مرد چھوڑا تھا، اسے جو مرد ملا وہ چالاک و بدکردار تھا۔ اگر کسی عورت کا پرانا مرد زن مرید تھا، تو نیا مرد عورت ذات ہی کے خلاف نکلا۔ اگر کسی کا پرانا مرد بے روزگار تھا، تو نیا سسرال میں پڑا رہتا اور خود کوئی کام کرنا گناہ سمجھتا۔

غرض جس نے بھی کسی خامی کی وجہ سے پرانے ساتھی کو چھوڑا تھا، نئے ساتھی میں بھی کوئی نہ کوئی خرابی پائی۔ وہ اکثر حالات میں پرانی سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے سبھی اپنے پرانے ساتھیوں کو یاد کرنے لگے کیونکہ اب وہ انھیں نئے ساتھیوں سے بہتر لگے۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ نئے جوڑے ایک دوسرے کی شکل سے بھی بیزار ہو گئے۔ ان کے لیے ساتھ ساتھ چند لمحے گزارنا دوبھر ہو گیا۔ دراصل سبھی اپنے پرانے ساتھی کے عادی تھے، چاہے وہ جیسے بھی ہوں۔ جو جوڑا اللہ تعالیٰ تخلیق کرے، اکثر اوقات انھیں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ ہر انسان میں خامیاں ہی نہیں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان کو تحسین کی نظر سے دیکھا جائے، تو خامیاں بھی قابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ بہرحال یہ لاوا ایک دن پھوٹ پڑا۔ مختلف شہروں میں جگہ جگہ ہنگامے اور احتجاجی جلوس شروع ہو گئے۔ سبھی کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ یہ بے ہودہ بل ختم کر کے سابقہ جوڑوں کو بحال کیا جائے۔ اب وہ لوگ بھی اس کے خلاف ہو گئے جنھوں نے اسے منظور کرایا تھا۔ لہٰذا بل ختم کر کے پرانے رشتے بحال کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس پر سب نے کلمہ شکر پڑھا اور خوشی خوشی پرانے ساتھیوں کو لیے گھر روانہ ہو گئے۔

◆●●

www.pdfbooksfree.pk

رنگ برنگ

نوع بہ نوع تحریروں میں سے انتخاب

ہاتھ رہتا تھا دعا کی طرح سر پہ

(بیگم صفدر بیگ۔ لاہور)

ماں اپنے بچوں کی پرورش ایثار، قربانی، محنت اور محبت سے کرتی ہے۔ میری امی جان بھی ایسی ہی ماں تھیں۔ ہوش سنبھالتے ہی انھیں دن رات محنت کرتے دیکھا۔ وہ ایک استاد تھیں، اپنے اسکول کی صدر مدرس اور کچھ اسکولوں کی انتظامی ذمے دار بھی رہیں۔ اس طرح انھوں نے دہری ذمے داریاں ادا کیں۔ والد صاحب کے ساتھ گھر کا معاشی بوجھ بھی بانٹا۔ وہ محنتی استاد تھیں، پڑھائی میں کمزور طالبات پر خصوصی توجہ دیتیں اور دوسری اساتذہ کو بھی اس کی تلقین کرتیں۔

وہ صبح سویرے بیدار ہو کر پہلے نماز فجر ادا کرتیں، تلاوت کلام پاک کرتیں اور پھر ہمارے لیے ناشتا بناتیں۔ گھر کے دیگر کام بھی انجام دیتیں۔ بعض اوقات صبح سویرے کپڑے بھی دھوتیں۔ اس زمانے میں کپڑے ہاتھ سے دھلتے۔ پانی کے لیے ہاتھ سے چلنے والا نل ہوتا۔ گھر کے کام کاج کرنے کے بعد اسکول چلی جاتیں۔ کچھ عرصہ تو ایسا بھی ہوا کہ اسکول دوسرے گاؤں میں ہونے کی وجہ سے مجھے چھے میل روزانہ پیدل چلنا پڑتا۔ اسکول سے واپسی پر عموماً کسی عزیز سے ملنے چلی جاتیں یا کوئی اور معاشرتی مصروفیت ہوتی۔

گھر واپس آ کر کھانا پکاتیں اور بچوں کو سنبھالتیں۔ اس کے علاوہ سلائی کڑھائی بھی کرتیں۔ ہمارے بچپن میں انھیں اپنی والدہ سے مدد حاصل رہی۔ لیکن ظاہر ہے، زیادہ ذمے داری تو انہی کی تھی۔ ہماری پڑھائی کا خیال رکھنا، تربیت اور گھر کی جملہ ذمے داری انہی کے کاندھوں پر تھی کیونکہ والد صاحب تو روزگار کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں رہے۔ ہماری ضروریات بن مانگے پوری کرتیں۔ محبت کا زبانی اظہار کم لیکن عملی مظاہرہ زیادہ تھا۔ بچوں کی تکلیف پر تڑپ اٹھنا، تو ہر ماں کا خاصہ ہے۔ لیکن

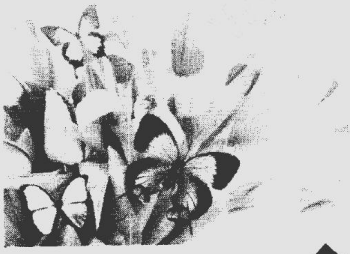

www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے اس سے بڑھ کر ہماری تعلیم و تربیت پر زور دیا۔ بچوں کی پڑھائی میں سستی یا کمزوری سے کبھی مایوس نہ ہوئیں۔ جہاں تک ممکن ہوا، پڑھائی جاری رکھی۔

والدہ کی زندگی میں بڑا صدمہ چھوٹی بہن، بہنوئی اور ان کے چار بچوں کا ریل میں بم پھٹنے سے انتقال ہو جانا تھا۔ اس صدمے نے تو ان کی کمر ہمت پر کاری ضرب لگائی۔ اس حادثے کے کچھ عرصے بعد وہ بیمار ہو گئیں۔ پچھے سات سال بعد ہمارے والد کا انتقال ہوا، تو وہ تنہا رہ گئیں۔ بیماری بڑھتی گئی اور وہ کمزور ہوتی گئیں۔ ان کی زندگی کا آخری صدمہ بھی دوسری بہن کا انتقال تھا۔ اس وقت وہ خود بھی بیمار تھیں۔ کمزور صحت کے پیش نظر ڈاکٹروں نے بہن کی وفات کی خبر انھیں نہ ہونے دی۔

وہ اس دن بہت بے چین تھیں اور بار بار بہن کو یاد کرتیں۔ بعد میں انھیں بتایا گیا تو بہت صبر کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دل کا دکھ اشعار کی صورت اختیار کر گیا۔ انھیں اپنی بہنوں سے بہت محبت تھی۔ اپنی زندگی کے آخری دو ماہ اسی بہن کے گھر گزارے اور انہی کی بیٹی نے امی کی خدمت کی۔ میں جو اپنے پانچ بچوں کی پیدائش کے مواقع پر ان کی شفقت کا فائدہ اٹھاتی رہی، ان کی خدمت نہ کر سکی۔ اس بات کا ہمیشہ دکھ رہا۔

اک ہاتھ جو رہتا تھا دعا کی طرح سر پر
سایہ تھا وہ ماں کا کہ جو اب اٹھ گیا سر سے

پنجرے کھول دیجیے

(محمد طاہر ضیا، اسلام آباد)

بنی نوع انسان کی طرح بقیہ کائنات کے اندر ہر ذی روح آزادی پسند ہے۔ ایک تتلی کو چند لمحوں کے لیے پکڑ لیجیے، آزاد ہونے کے لیے وہ بے طرح پھڑ پھڑائے گی۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگوں نے محض شوقیہ معصوم پرندوں کو پکڑ کر قفس میں ڈال رکھا ہے جہاں وہ ہم جولیوں سے دور غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

یہ کس قدر فضول اور بے رحمانہ شوق ہے جس نے ہمیں بے حد خود غرض اور سنگ دل بنا کر رکھ دیا۔ اپنے اس فضول شوق کی تکمیل کی خاطر ہم ان معصوم پرندوں کی آزادی کے دشمن بن بیٹھے جنھیں قدرت نے آزاد پیدا کیا اور کھلی فضاؤں میں اڑنے کے لیے بال و پر عنایت فرمائے۔ اپنی قبیح حرکت پر نادم ہونے کے بجائے ہم قدرت کی طرف سے عطا کردہ ان معصوم پرندوں کی آزادی سلب کر کے خوش ہوتے ہیں۔

اگر آپ کو پرندوں کی آوازوں سے پیار ہے، تو کوہساروں اور نخلستانوں کا رخ کریں اور قدرت کی خوبصورتیوں کے مظاہر دیکھنے کے علاوہ حسین اور رنگ برنگے پرندوں کی میٹھی بولیوں سے محظوظ ہونا سیکھیں۔ گھروں کے اندر پرندوں کو پنجروں میں بند کر کے ہم نادانستہ فطرت کے ساتھ سرد جنگ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ کیا اس جنگ میں ہم فطرت کو شکست دے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ لیکن ایک نہ ایک دن قانون قدرت کی گرفت میں ضرور آ سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے تمام لوگ جو نادانستگی میں اس گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، آج ہی پہلا کام یہ کریں کہ گھروں میں قید پرندوں کے پنجرے کھول دیں تاکہ معصوم اور بے گناہ پرندے اس آزادی سے مستفید ہوں جو قدرت نے ان کی تقدیر میں لکھی ہے۔

آیئے یہ عہد کریں کہ ہم پرندوں سے سچی دوستی کریں گے۔ اس کے لیے گھروں کی چھتوں اور دیواروں پر پرندوں کے لیے دانہ دنکا اور پانی سے بھری پراتیں رکھوائیے۔ معصوم پرندے قید کرنے والوں کو پیار سے سمجھائیے

www.pdfbooksfree.pk

اور انھیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ مقید پرندوں کو آزاد کر دیں۔ میرا حکومت سے مطالبہ ہے، وہ ایسا قانون بنائے کہ لوگ پرندوں کو پکڑ کر ان کا کاروبار نہ کر سکیں۔ جو اس قانون کی خلاف ورزی کرے، عدالت اسے قرار واقعی سزا دے۔

مسح اور پاؤں دھونے کی حکمتیں

(علامہ محمد الیاس عطار، ڈی جی خان)

سر اور گردن کے درمیان ''حبل انورید'' یعنی شہ رگ واقع ہے۔ اس کا تعلق ریڑھ کی ہڈی اور حرام مغز اور جسم کے تمام تر جوڑوں سے ہے۔ جب وضو کرنے والا گردن کا مسح کرے، تو ہاتھوں کے ذریعے برقی رو نکل کر شہ رگ میں ذخیرہ ہو جاتی ہے۔ یوں ریڑھ کی ہڈی کے ذریعے ہمارے پورے اعصابی نظام کو توانائی ملتی ہے۔

پاؤں سب سے زیادہ گرد آلود ہوتے ہیں۔ پہلے پہل چھوت پاؤں کی انگلیوں کے درمیانی حصے ہی سے شروع ہوتی ہے۔ وضو میں پاؤں دھونے سے گرد وغبار، جراثیم اور بچے کھچے گندگی کے ذرات پاؤں کی انگلیوں کے درمیان سے نکل جاتے ہیں۔ لہٰذا وضو میں سنت کے مطابق پاؤں دھونے سے نیند کی کمی، دماغی خشکی، گھبراہٹ اور مایوسی (Depression) جیسے پریشان کن امراض دور ہو جاتے ہیں۔

آٹزم..... بچوں کی بیماری

([illegible] گوجرانوالہ)

آٹزم دماغی نشوونما سے وابستہ بچوں کی بیماری ہے۔ اس میں مبتلا بچے لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے اور ایک ہی طرح کا رویہ یا حرکت بار بار دہراتے ہیں۔ ان بچوں کو رویے اور خیالات عیاں کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔ آٹزم ایک بیماری نہیں بلکہ مختلف طبی علامات کا ایک مجموعہ ہے جن میں دماغ وصحت کے مسئلے، توجہ کی کمی اور حرکات میں مشکلات کے مسائل شامل ہیں۔

آٹزم کی علامات ۳ سال کی عمر تک کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتی ہیں۔ کچھ بچوں میں ۲ سال تک یہ علامات ظاہر نہیں ہوتیں اور وہ اس عرصہ میں جو کچھ سیکھتے ہیں، بھول جاتے ہیں۔

تحقیق کے مطابق لڑکوں میں یہ بیماری لڑکیوں کے مقابلے میں چار پانچ گنا زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ۳۵۰،۰۰۰ بچے آٹزم کا شکار ہیں اور یہ تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس بیماری کی خاص علامات یہ ہیں:

☆ بے چین رہنا یا حرکت کرنے کی خواہش نہ کرنا۔
☆ کسی سے چھونے سے الجھن محسوس کرنا۔
☆ ایک ہی حرکت کو بار بار دہرانا جیسے کسی چیز کے گرد گھومنا۔
☆ بہت آہستہ یا بہت اونچا سننا۔
☆ بے مقصد رونا اور ہنسنا۔
☆ ڈر اور خطرے کی سمجھ نہ رکھنا۔

پاکستان ناگزیر تھا

(ہاشم خان، گورنمنٹ ڈگری کالج، بٹ خیلہ)

بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا، تو بھارتی مسلمانوں کے ساتھ پاکستانی حصے کے مسلمان بھی مل کر مؤثر اقلیت بن جاتے اور یوں بہتر طور پر اپنے مفادات کی حفاظت کرتے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کچھ بھی ہو، بھارت میں ہندوؤں ہی کی اکثریت ہوتی۔ وہ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق حکومت کرتے اور کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے۔

www.pdfbooksfree.pk

بھارت میں مسلمان اب بھی مؤثر اقلیت یعنی آبادی کے 19 فیصد ہیں لیکن اُن کا معیارِ زندگی شودروں سے بھی بدتر ہے۔ ان پر ترقی کا ہر دروازہ بند ہے۔ سرکاری ملازمین میں اُن کا حصہ ایک فیصد بھی نہیں۔ تعلیم، معیشت، صحت، صنعت تجارت کسی جگہ ان کو آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا۔ اور یہ بات خود بھارتی حکومت کے قائم کردہ سچر کمیشن کی رپورٹ میں درج ہے کہ مسلمان بدترین حالات سے دوچار ہیں۔

ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہمیں پاکستان ملا اور ہم مسلمان یہاں سکون سے اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔

قرآن پاک اور سائنس

(ڈاکٹر ندیم اکرام، راولپنڈی)

سائنس کے موضوعات کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا خطِ روش کا متقاضی ہے۔ لیکن یقیناً یہ تحقیق رجوع الی القرآن کی دعوت دیتی ہے۔ بقول اقبالؒ:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزِ دیگر است
صد جہانِ تازہ در آیات اوست
عصر ہا پوشیدہ در آیات اوست
بندہ مومن ز آیات خدا است
ایں جہاں اندر براہ چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
مے دہد قرآن جہاں دیگرش
یک جہانے عصر حاضر را بس است
گیرا گر در سینہ دل معنی رس است

(اگر تو مخلص مسلمان کی زندگی گزارنا چاہتا ہے، تو وہ قرآن کو چھوڑ کر ممکن نہیں۔ کیا میں تجھے اپنے دل کی سچائی بتاؤں؟ قرآن پاک صرف ایک کتاب نہیں بلکہ یہ تو کچھ اور ہی ہے۔ ہزارہا جہانِ تازہ اس کی آیات میں پوشیدہ ہیں اور اس کی آیات ہزاروں سالوں کے رازوں کو آشکار کرتی ہیں۔ بندہ مومن اللہ کی آیات میں سے ایک ہے اور اس کے اعمال اس کے مطابق ہیں، جب بھی مسلمان کسی مسئلے سے دوچار ہوتا ہے، تو قرآن اس کے سامنے اس کے کئی نئے حوالے کھولتا ہے، اس میں دی ہوئی راہنمائی انسانیت کے تمام مسائل کا حل ہے۔ اگر تیرے سینے میں دل زندہ ہے، تو اس کی راہنمائی کو تھام لے۔)

حمد و ثنا کی فضیلت

(گل رسول، سیدو شریف)

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں حضرت نوح علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے فرمایا ہے: ترجمہ ''بے شک نوح ہمارے شکرگزار بندے تھے۔'' بعض مفسرین نے فرمایا ہے، حضرت نوح ہر حالت میں اللہ کی تسبیح و تمہید بیان کرتے تھے۔ کھانے پینے اور لباس غرض ہر نعمت و غیر نعمت پر اللہ کا شکر ادا فرماتے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''بے شک اللہ ایسے شخص کو اپنی رضا و خوشنودی کا پروانہ عطا فرما دیتے ہیں جو ہر کھانے اور پینے پر اللہ کی حمد و ثنا بیان کرے۔''

آپ کا ایک نام شاکر بھی تھا۔ شاکر اس شخص کو کہتے ہیں جو دل اور اپنے اعمال سے ہمہ تن اور ہمہ وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت و فرمان برداری میں مصروف و منہمک رہے۔

www.pdfbooksfree.pk

کرپشن کا خاتمہ بذریعہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی

(غضنفر علی، کراچی)

پاکستان میں کرپشن کا زہر سرکاری اداروں میں سرطان کی طرح سرایت کر چکا۔ کئی عام شہری یا کاروباری حضرات بھی ٹیکسوں کی بچت، غیر قانونی ذرائع یا غیر دستاویزی کاروبار سے جو دولت اکٹھی کرتے ہیں، ان کا حساب بھی مشکل ہو چکا۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ہم کاروبار اور معیشت کو دستاویزی بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ان جرائم کی تفتیش اور پھر عدالتوں میں کرپشن کو ثابت کرنا کیس میں ممکن نہیں ہوتا۔

سرکاری اداروں اور نجی کاروبار میں کرپشن اور غیر قانونی معاملات کی روک تھام کے لیے ستر کی دہائی میں ایف آئی آر اور نوے کی دہائی میں احتساب بیورو کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان اداروں نے پچھلے کئی عشروں میں تفتیش کو جدید خطوط پر استوار کیا اور چالان عدالتوں میں پیش کیے۔ لیکن دستاویزی ثبوت کی کمی کی بنا پر زیادہ تر کیسوں میں عدالتیں ملزمان کو سزا نہیں دے سکیں۔ بلکہ کئی کیسوں میں ملزمان یا تو ضمانتوں پر رہا ہوئے یا الزامات سے بری ہو گئے۔ ظاہر ہے جو شہادتیں عدالتوں میں پیش کی گئی تھیں، وہ دستاویزات کے ساتھ مکمل ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہیں۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں ضروری ہے کہ وطن عزیز میں آمدن اور خرچ کے طریقہ کار کو مکمل طور پر دستاویزی بنایا جائے تاکہ غیر قانونی کام کی گرفت آسان ہو اور انھیں عدالتوں میں بھی قابل قبول بنایا جائے۔ یہ طریقہ قابل عمل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے مدد لیں۔ اس کے لیے ہم نادرا کے ریکارڈ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس میں تمام پاکستانیوں کا ریکارڈ (Record/ Data Base) موجود ہے۔ اس طریقہ کار پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہو گا کہ تمام پاکستانیوں سے ایک فارم پُر کرایا جائے جس میں درج ذیل تفصیلات پوچھی جائیں:

۱۔ تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد کی تفصیل۔

۲۔ ہر قسم کی آمدنی کے ذرائع۔ ۳۔ اخراجات۔ ۴۔ بینک اکاؤنٹس۔ ۵۔ ٹیکس کی ادائیگی، ۶۔ کریڈٹ کارڈ، ۷۔ کلب کی ممبر شپ اگر کسی کی ہے، ۸۔ تعلیمی اخراجات، ۹۔ انشورنس، ۱۰۔ حج و غیر حج سفر، ۱۱۔ واجبات کی ادائیگی، ۱۲۔ نوکری یا کاروبار کی تفصیلات۔

یہ فارم پُر ہونے سے ہر پاکستانی کے اثاثہ جات، آمدنی و اخراجات، نوکری و کاروبار وغیرہ کی تفصیلات نادرا کے ریکارڈ میں شامل ہو جائیں گی۔ پھر کرپشن کے ذریعے حاصل کردہ اثاثہ جات، آمدنی اور اخراجات کو چھپانا ممکن نہ ہو گا بلکہ بلیک اکانومی بھی دستاویزی ہو جائے گی۔ اس پروگرام کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ تمام بے نام و گمنام اثاثہ جات کو دستاویزی بنایا جائے۔ انتقال جائداد کا طریقہ کار تیز رفتار، سادہ اور کم خرچ کیا جائے تاکہ تمام جائداد کی تفصیلات موجود ہوں۔

پھر کوئی شخص قانون کی خلاف ورزی کر کے جائداد بناتا ہے اور اس کے اخراجات آمدن سے زیادہ ہیں، تو ایسے شخص پر قانونی گرفت نہ صرف آسان ہو گی بلکہ عدالت سے اسے سزا دلانا بھی سہل ہو گا۔ امید ہے، ارباب اختیار تجویز کردہ طریقہ کار پر سنجیدگی سے غور کریں گے تاکہ ملک سے نہ صرف کرپشن کا خاتمہ ہو بلکہ ملزموں کو عدالتوں سے سزا دلانا بھی یقینی بن سکے۔

www.pdfbooksfree.pk

دکھی شوہر کی فریاد سن کر

شاکی بیوی کا جواب

ازدواجی زندگی میں تلخیاں گھولنے والے عیاں و مستور نکتے..... ایک قاریہ کے قلم سے

پروفیسر شبانہ اصغر

شمارہ مارچ میں جناب سراج دین کا تحریر کردہ مضمون ''ایک دکھی شوہر کی فریاد'' زیر مطالعہ رہا۔ موضوع اہم تھا، آغاز دلچسپ اور اختتام اثر انگیز..... تاہم تحریر پڑھنے کے بعد تشنگی کا احساس ہوا جس کی ممکنہ غالباً صورت حال کی جانبدارانہ پیشکش تھی۔

صاحب مضمون نے روایتی انداز اپناتے ہوئے مسئلے کی تمام تر ذمے داری نصف بہتر کے کاندھوں پر ڈال نہ صرف شوہر حضرت کو معصوم ثابت کرنے کی کوشش کی بلکہ اپنی کردہ اور ناکردہ غلطیوں کے لیے بھی ''ظالم'' بیوی کو ذمے دار قرار دینے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگا ڈالا۔ غالباً وہ اس اصول سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے ''پروپیگنڈے میں جیت پہل کرنے والے کی ہوتی ہے۔''

میرے محدود علم اور مشاہدے کی روشنی میں یہ صورت حال جنم لینے کے اسباب کا مختصر جائزہ پیش ہے۔ وہ اس اہم موضوع کا مکمل احاطہ تو شاید نہ کر پائے تاہم دوسرے اہم فریق کے نقطہ نظر کی ترجمانی کا حق کسی حد تک ادا ہو جائے گا۔

ہمارا معاشرتی اور خاندانی نظام اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے باوجود چند نقائص کا حامل بھی ہے۔ مثال کے طور پر میاں بیوی کے ذاتی تعلق اور خلوت (Privacy) کا خیال کسی بھی سطح پر نہیں رکھا جاتا۔ واضح دینی احکامات کے باوجود ذاتی کمروں میں آمدورفت کی اخلاقیات (Etheis) کا تصور ہی ناپید ہے۔ بہت سے تجربہ کار (شادی شدہ) اور صاحبان علم بھی بنیادی اخلاقی اقدار سے لاعلم ہیں یا ان پر عمل درآمد سے قصداً پہلو تہی اختیار کرتے ہیں۔

خلوت کی کمی اور اہل خانہ کی مداخلت میاں بیوی کے

www.pdfbooksfree.pk

خصوصی تعلق کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں غلط فہمیاں اور رنجشیں بھی پیدا کرتی ہے۔ نتیجتاً ان کے درمیان غیر محسوس خلیج جنم لیتی ہے۔ جب غلط فہمیاں دور نہ ہوں، تو بدقسمتی سے خلیج بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے، بچوں کی پیدائش کے بعد عورت کی محبت اور توجہ تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن تقسیم کا یہ عمل اس لحاظ سے نہایت منفرد ہے کہ پیار اور وفاداری کے خمیر سے گندھے نسوانی وجود میں محبت کا عنصر کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ بدقسمتی سے خود مرد کی ذات کم از کم اظہار کی حد تک ان خوبصورت جذبوں سے محروم ہو جاتی ہے۔

ازدواجی زندگی کے آغاز میں چاند تارے توڑ کر لانے کی باتیں کرنے والے چھوٹی چھوٹی مگر اہم خوشیوں کے مواقع پر تحائف دینا، تو درکنار تاریخیں یاد رکھنا بھی بھول جاتے ہیں۔ احادیث نبوی ﷺ سے ثابت ہے کہ تحائف کا لین دین آپس میں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے اور یقیناً میاں بیوی کا تعلق اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ تحائف سے مراد قیمتی زیورات یا لباس نہیں..... خلوص نیت سے کہے گئے چند الفاظ اور مسکراہٹ بھی اظہار محبت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ حقیقتاً یہ ایسا ٹونکا ہے کہ ”ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آوے۔“

روزمرہ زندگی میں جیون ساتھی سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ، تعریف اور حوصلہ افزائی خاتون کو خوش رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ مزاج کی خوشگواری گھر کا ماحول آسودہ رکھنے کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کے تعلق کو مضبوط بناتی ہے۔ کسی قیمت کے بغیر حاصل ہونے والی یہ خوشی بھی ہمارے ہاں نایاب ہو چکی۔

ایک اہم وجہ کی نشاندہی صاحب مضمون نے تمہید میں خود ہی کر ڈالی۔ یہ وہ کیفیت ہے جس سے موصوف ایک نامعلوم پیغام موصول ہونے پر گزرے۔ بلند گرداری کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے پیغام نظر انداز کر دیا، لیکن مستقبل میں کسی خوش آئند توقع کے پیش نظر اسے موبائل سے حذف نہیں کیا۔ مردوں کی اکثریت (معذرت کے ساتھ) ایسے مواقع پر علی الاعلان یا پوشیدہ طور پر بیوی کے ساتھ بے وفائی کی مرتکب ہوتی ہے۔ جبکہ عورت سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ شوہر کی عدم توجہی کے باوجود، نیز تمام تر گھریلو ذمے داریوں کی ادائیگی کے بعد تھکے جسم اور ناخوش ذہن کے ساتھ اس ”ذمے داری“ کو بھی فرض کی طرح (محض مشین کے مانند) پورا کرے جو درحقیقت میاں بیوی کے درمیان تعلق مضبوط بنانے کا ذریعہ ہے۔

المیہ یہ ہے کہ ہم قرآن و احادیث نبوی ﷺ سے ایسے حوالے تلاش کرنے میں بہت ماہر ہیں جو ہمارے مفاد اور نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہوں۔ اس قرآنی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے ”عورت مرد کی کھیتی ہے“ ہم یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی معاملات میں راہنمائی فراہم کرنے والی اس کتاب روشن میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ اسی کتاب ہدایت کی تفسیر قرار دی گئی ہستی مبارک ﷺ نے بھی عورت کو آبگینہ قرار دیا اور ازدواجی تعلق کی پائیداری کے لیے مختلف مواقع پر بحیثیت شوہر بہترین مثالیں قائم کیں۔

مثال کے طور پر ایک حدیث نبوی ﷺ کا مفہوم ہے: ”تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا ہے اور بے شک میں اپنے عیال کے ساتھ سب سے اچھا ہوں۔“

بات ختم وہیں ہوتی ہے کہ شاہراہ زندگی کے طویل سفر میں ہمسفر کے ساتھ اچھے تعلقات ہوں، تو وقت خوشگوار گزرتا ہے۔ سفر غیر دلچسپ اور پر تکان لگنے لگے، تو روزمرہ کی مصروفیات سے وقت نکال کر شریک حیات پر کچھ توجہ دیجیے تاکہ ”حادثات“ سے بچا جا سکے۔ سب سے اہم بات یہ کہ گاڑی کے پہیوں میں توازن ضرور رہنا چاہیے ورنہ وہ ہچکولے کھانے لگتی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

نام کتاب: نبی ﷺ کا انداز تعلیم و تربیت، مصنف: قاضی محمد مطیع الرحمن۔ ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، قیمت: ۱۲۰ روپے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تبلیغ کا آغاز فرمایا، تو آپ ﷺ کے ساتھی محض بھر صحابہ ہی تھے۔ لیکن محض بیس سال بعد دس لاکھ مربع میل رقبے پر اللہ اکبر کی مبارک آواز گونجنے لگی اور عرب کے طول و عرض میں لاکھوں لوگ مسلمان ہو گئے۔ یہ معجزہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم و تربیت کے سبب ہی رونما ہوا۔ یہ آپ ﷺ کی تعلیمات کا فیض تھا جن میں ہمارے لیے دنیا و آخرت کی کامیابیاں پوشیدہ ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے دوران تبلیغ کفار عرب کو راہ راست پر لانے کے لیے تعلیم و تربیت کے مختلف انداز اختیار فرمائے۔ جناب مطیع الرحمن نے اپنی تصنیف میں انہی کو عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔ شروع کے ابواب اسلامی تعلیم کی تعریف و تاریخ کے لیے مخصوص ہیں۔ اگلے ابواب میں تربیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔

کتاب کے اہم باب ملاحظہ فرمائیے: ''اسلام میں علم کی اہمیت، تعلیم کے اجزائے ترکیبی، تعلیم و تربیت کی پہلی درس گاہ، طالبان صفہ کی مالی حالت، شفقت و رحم دلی، عورتوں کی تعلیم، سوالیہ انداز تعلیم، تربیت بذریعہ قصہ گوئی، تربیت بذریعہ شدت و سختی اور تربیت میں حکیمانہ انداز۔'' کتاب میں احادیث نبوی ﷺ متن کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ کرتی ہے۔

یہ کتاب خوبصورت انداز میں معیاری کاغذ پر طبع

www.pdfbooksfree.pk

ہوتی ہے۔ قیمت کم رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔

نام کتاب: حافظان سیری ملواں، مصنف: محمد رشید علوی۔ ملنے کا پتا: مکان نمبر ۲۴۸، بلاک ۲، سیکٹر سی ۱۱، ٹاؤن شپ، لاہور۔ قیمت: درج نہیں۔

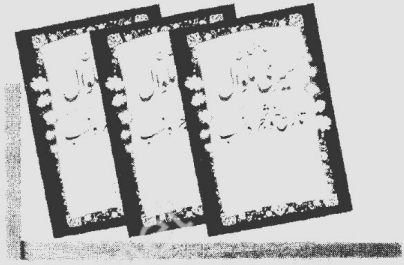

سیری ملواں سابق ریاست امب کا ایک گاؤں ہے۔ یہ گاؤں ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ حافظ برخوردار نامی ذہنی

شخصیت نے بسایا تھا۔ ان کی اولاد خوب پھلی پھولی اور ”حافظان سیری ملواں“ کے نام سے مشہور ہوئی۔ مصنف کے اجداد بھی اس گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ اب انھوں نے زیرتبصرہ کتاب میں اپنے خاندان، ریاست امب اور سیری ملواں سے متعلق دلچسپ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

کتاب کی رو سے سلطان محمود غزنوی کے ایک نامور فوجی سردار، میر قطب حیدر شاہ، حضرت علیؓ کے تیسرے بیٹے، حضرت محمد بن حنفیہؒ کی اولاد میں سے تھے۔ جب محمود غزنوی نے ہندوستان فتح کیا، تو میر قطب وادی سون سیکسر میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ان کی اولاد ہی پھر ”اعوان“ کہلائی۔ حافظ برخوردار بھی انھی کی اولاد میں شامل تھے۔

مرتب نے متفرق کتب سے استفادہ کرتے ہوئے قیمتی معلومات جمع کی ہیں۔ اس کی طباعت معیاری ہے اور کاغذ عمدہ۔ ہزارہ اور ریاست امب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اسے مفید کتاب پائیں گے۔

☆☆☆

نام کتاب: پلیز مسٹر پریزیڈینس اور ملک الف ل م۔ مصنف: محمد شاہد، ناشر: ۵۔۶، پہلی منزل، اندرون فریئر مارکیٹ، ڈیف اینڈ ڈمپ سنٹر، شاہراہ لیاقت، کراچی۔ قیمت: ۵۰۰ روپے

ایک حساس اور دردمند پاکستانی ملکی حالات پر کڑھتا رہتا ہے۔ اگر کوئی قلم کار بھی ہو، تو وہ اپنے خیالات و جذبات صفحہ قرطاس پر لے آتا ہے۔ زیرتبصرہ کتاب کے مصنف کا شمارہ بھی انھی پاکستانیوں میں ہوتا ہے۔

جناب محمد شاہد وطن عزیز کے سیاسی، معاشرتی و معاشی حالات سے خوش نہیں۔ لہٰذا انھوں نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور غور و فکر کے موتی صفحات پر بکھیر دیے۔ کتاب کے مضامین میں ارباب علم و دانش کے لیے

مشورے ہیں اور نصیحتیں بھی۔ کتاب کی طباعت و کاغذ معیاری ہے۔

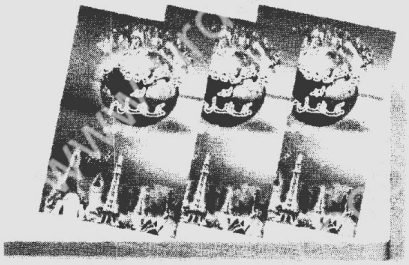

☆☆☆

نام کتاب: تاریخ جھجر، مصنف: مرزا بشارت علی۔ ملنے کا پتا: ۳/۵۴۹، لیاقت آباد، کراچی۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

یہ انیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے جب ۱۸۱۳ء میں ریاست جھجر کی بنیاد پڑی۔ یہ دہلی کے قریب ہی علاقہ

www.pdfbooksfree.pk

ہریانہ میں واقع تھی۔ ریاست کا پہلا حکمران، نواب نجابت علی خان اور آخری نواب عبدالرحمن خان تھا۔ ان نوابوں نے ریاست میں کئی عمارتیں تعمیر کرائیں جو اب بھی قائم ہیں۔

نواب عبدالرحمن خان نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنرل بخت خان سے قبل جنرل عبدالصمد خان دہلی میں شاہی افواج کے کمانڈر تھے۔ ان کا تعلق ریاست جھجر ہی سے تھا۔

بدقسمتی سے جنگ میں انگریز فتح یاب ہوئے۔ انھوں نے نواب عبدالرحمن کو پھانسی دے کر شہید کیا اور ان کی ریاست سکھ سرداروں میں تقسیم کر دی۔

زیر تبصرہ کتاب اسی ریاست جھجر کی تاریخ ہے۔ مصنف اسی ریاست میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی، پاکستان چلے آئے۔ کتاب چھے ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں ریاست جھجر کے محل وقوع، قدیم عمارت، نظام حکومت، اہم شخصیات، ایام جنگ آزادی، حالات بزرگان دین، تذکرہ مشاہیر اور ثقافت و معاشرت کے بارے میں سیر حاصل معلومات دی گئی ہیں۔

طباعت و پیش کش معیاری ہے۔ اسلامی تاریخ و تہذیب سے رغبت رکھنے والے اسے دلچسپ و معلومات افزا کتاب پائیں گے۔

☆☆☆

نام کتاب: میں.....ابن آدم!

مصنف: ذیشان شاہد۔ ناشر: ماورا پبلشرز۔ ۶۰، دی مال، لاہور۔ فون: ۳۶۳۰۳۳۹۰، قیمت: ۲۵۰ روپے

حساس اور سوچنے والا انسان اپنے من میں نئی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ اس نرالی دنیا میں نت نئے خیالات اور نظریات ملتے ہیں۔ بعض انسان اپنی بسائی دنیا لیے چل بستے ہیں۔ کچھ اسے صفحۂ قرطاس پر اُتار کر سبھی کے سامنے لے آتے ہیں۔ انھی ہستیوں میں ذیشان شاہد کا بھی شمار ہوتا ہے۔

ذیشان شاہد معلم ہیں۔ نیز پنجاب یونیورسٹی سے سالماتی حیاتیاتی میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ معلمی کے ساتھ زیر تبصرہ کتاب بھی تخلیق کر ڈالی۔ اس میں واصف علی واصف کی طرح انھوں نے زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو ہلکے پھلکے جملوں میں بیان کیا ہے۔ یہ جملے انسان کو غور و فکر

پر ابھارتے اور اسے نیکی سے قریب کرتے ہیں۔ چند جملے بطور نمونہ پیش ہیں:

☆ معلوم نہیں، متکبروں کے تکبر کو عاجزوں کے احساس کمتری نے بڑھایا یا اسی احساس کی وجہ سے ان کے تکبر نے جنم لیا۔

☆ انسان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے اشیا پرکھنے کے لیے سائنس کا معیار مل گیا اور یہ بدنصیبی کہ وہ ہر چیز کو

www.pdfbooksfree.pk

سائنس سے پرکھنے لگا۔

☆ میں جاہل کو بات سمجھا سکتا ہوں لیکن کم علم شخص کو میرے حوالے نہ کرنا...... میں اسے نہیں سمجھا پاؤں گا۔

کتاب میں اسی قسم کے جملے بکھرے پڑے ہیں جو قاری کو نئے جہان میں لے جاتے ہیں۔ کتاب کی پیش کش عمدہ ہے اور قیمت مناسب! سنجیدہ تحریریں پسند کرنے والوں کے لیے یہ عمدہ تحفہ ہے۔

☆☆

نام کتاب: معصوم اور پریچے

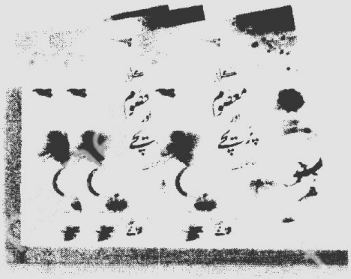

مصنف: گلزار۔ ناشر: بک کارنر، بالمقابل اقبال لائبریری، بک اسٹریٹ جہلم، فون: ۰۵۴۴-۶۱۴۹۷۷۔
قیمت: ۶۰۰ روپے۔

بھارت میں اردو جن ادبا کے دم قدم سے زندہ ہے، ان میں سمپورن سنگھ اور المعروف گلزار کا نام نامی نمایاں ہے۔ آپ ہندو ہونے کے باوجود اردو بولتے، لکھتے پڑھتے اور اس زبان سے محبت کرتے ہیں۔ ہرفن مولا شخصیت ہیں۔ شاعری کرتے، افسانے لکھتے اور فلموں کے ہدایت کار بھی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں گلزار کی دو فلموں ''معصوم اور ''پریچے'' کے منظر نامے طبع ہوئے ہیں۔ منظر نامے سے مراد ایسی کہانی ہے جو مناظر میں بیان کی جائے۔ انگریزی میں یہ اصطلاح ''سینیریو'' (Scenerio) کہلاتی ہے۔ اگر منظر نامے میں ہدایت کار کی خاطر تکنیکی ہدایات مثلاً ''کٹ'' وغیرہ لکھ دی جائیں، تو وہ ''اسکرین پلے'' کہلاتا ہے۔

پریچے فلم ۱۹۷۲ء میں سامنے آئی۔ اس کا اسکرین پلے گلزار صاحب نے لکھا اور ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ فلم معصوم ۱۹۸۲ء میں بنی۔ اس کا اسکرین پلے بھی گلزار نے تحریر کیا۔ ان دونوں فلموں نے بہت شہرت پائی۔ چناں چہ اب ان کا منظر نامہ پڑھنا قاری کو گلزار کی تحریری چاشنی اور ندرت فکر سے آشنا کراتا ہے۔ کتاب میں گویا یہ دو مختصر ناولوں کا روپ دھار چکے۔

کتاب خوبصورت انداز میں طبع ہوئی ہے۔ کاغذ معیاری ہے۔ خوش فکر و خوش رنگ کتب کے شائقین اسے عمدہ پائیں گے۔

☆☆

نام کتاب: نوآبادیاتی عہد میں مسلمانانِ جنوبی ایشیا

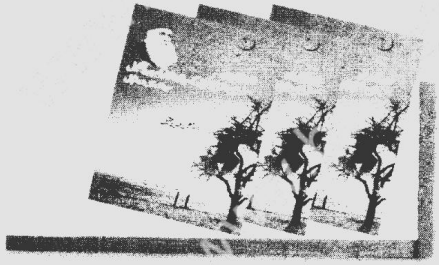

کے سیاسی افکار کی جدید تشکیل۔ مصنف: ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ڈی-۳۵، بلاک ۵، ایف بی ایریا کراچی، فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰۔
قیمت: درج نہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے آٹھ برس تک حکومت

www.pdfbooksfree.pk

کی اور اس ملک کے چپے چپے پر اپنی تہذیب و ثقافت کے نشان چھوڑے۔ جب وہ زوال پذیر ہوئے، تو انگریز آن دھمکے۔ یہ انگریز ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسے اقدامات کرنے لگے کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا، ہندوستان سے مسلمان مٹ جائیں گے۔

ایسی گھمبیر صورت حال میں سرسید احمد خاں نے مسلمانانِ ہند کو بقا کی راہ دکھائی۔ ان کی سعی سے مسلمانوں کے دل میں انگریزوں کے لیے بغض و نفرت کم ہوئی۔ سرسید نے مسلمانوں کو زوال سے بچایا، تو ایک اور مصلحِ قوم، علامہ اقبال نے انھیں ترقی و سربلندی کی راہ دکھائی۔ گویا مسلمانانِ ہند کے جدید سیاسی و فکری افکار کی تشکیل میں سرسید اور علامہ اقبال نے نمایاں کردار ادا کیا۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں دونوں مصلحین کے افکار و نظریات پر گہرائی و گیرائی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل ممتاز دانشور، نقاد اور معلم ہیں۔ انھوں نے بڑے مدلل اور دل نشیں انداز میں کتاب کے موضوع سے پورا انصاف کیا ہے۔ کتاب معیاری انداز میں طبع ہوئی ہے۔

٭٭٭

نام کتاب: کلیات فراق گورکھپوری۔ مرتب: مطرب نظامی۔ ناشر: بک کارنر‘ بک اسٹریٹ‘ جہلم۔ فون: ۰۵۴۴-۶۱۴۹۷۷۷۔ قیمت: درج نہیں۔

اردو غزل کے بہترین شعرا کا انتخاب کیا جائے‘ تو اس میں فراق گورکھپوری لازماً شامل ہوں گے۔ یہ عظیم اردو شاعر ۱۸۹۶ء میں پیدا ہو کر ۱۹۸۲ء میں جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ آپ ہندو ہونے کے باوجود عمر بھر اردو کی ترقی و ترویج میں سرگرم رہے۔

کم لوگ جانتے ہیں کہ فراق بھارتی سول سروس کے لیے منتخب ہو گئے تھے۔ مگر جب گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون شروع کی‘ تو انھوں نے سرکاری ملازمت کو لات دے ماری۔ وہ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بطور پروفیسر منسلک ہو گئے اور انگریزی ادب پڑھانے لگے۔

فراق صاحب زود نویس تھے۔ غزل کے علاوہ نظم‘ رباعی اور قطعے بھی کہے۔ اُن کی شاعری کے درجن سے زائد مجموعے شائع ہوئے۔ نثر کی چھے کتب چھپیں۔ انگریزی اور ہندی زبان میں بھی شاعری کی۔ گل نغمہ‘ گل رعنا‘ شبستان آپ کی شاعری کے مقبول مجموعے ہیں۔

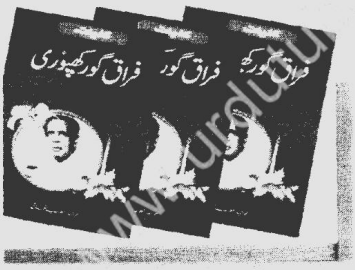

زیرِ تبصرہ کتاب‘ فراق گورکھپوری کی غزلوں‘ نظموں اور قطعات کا انتخاب ہے۔ اسے بھارت کے ممتاز شاعر

مطرب نظامی نے مرتب کیا ہے۔ پونے پانچ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں فراق کی بہترین شاعری جمع کردی گئی ہے۔ مرتب لکھتے ہیں کہ غزل کو جو گیرائی و گہرائی‘ نرمی‘ معصومیت اور گداز فراق نے عطا کیا‘ وہ اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

ناشر نے کتاب خوبصورتی و عمدگی سے شائع کی ہے۔ فونٹ بڑا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی رہے۔ طباعت معیاری ہے۔ کلاسیک رنگ میں شاعری کے شوقین اسے دل پسند کتاب پائیں گے۔ (تبصرہ نگار: سید عاصم محمود)

www.pdfbooksfree.pk

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس کی ۳ بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بغور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۲ سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو اردو ڈائجسٹ کے ۶ شماروں کی اعزازی ترسیل کے علاوہ مطبوعات کی ۲ خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتا: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ ۳۲۵۔ جی ٹھری جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ اپریل میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۷۳ء (ب) عالمگیری مسجد (بادشاہی مسجد)

قصہ کوئز ۲۔ (الف) بابری مسجد (ب) ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء

قصہ کوئز ۳: (الف) قطب الدین ایبک (ب) قطب منار، دہلی

درست جوابات دینے والوں کے نام

عاصمہ عمران (بہاولنگر)، احمد فرقان (بہاولنگر)، آمنہ نورین (بہاولنگر)، احقر العباد (میلسی)، ملک عدیل الرحمٰن (خانیوال)، اقصیٰ ظفر (راولپنڈی)، محمد حمزہ قادری (حیدرآباد)، محمد یوسف قریشی (حیدرآباد)، طاہرہ عنایت (پشاور)، منور سعید خانزادہ (سکرنڈ)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، کمانڈر (ر) محمد سلیمان (اٹک)، ولی حسین (حیدرآباد)، عبدالنعیم انصاری (حیدرآباد)، محمود منور خان (سرگودھا)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، طہٰ یٰسین (حیدرآباد)، حیان کاشف (حیدرآباد)، محمد احمد (کراچی)، آصف کریم (حیدرآباد)، منظر حسین (حیدرآباد)، عاطف ممتاز (چکوال)، محسن حبیب (فیصل آباد)، شمیم اختر (فیصل آباد)، محمد حبیب (فیصل آباد)، عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، عبدالحمید (کراچی)، منظور احمد بھٹیو (نواب شاہ)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، محمد تنزیل عباس (سرگودھا)، محمد بلال حسن (سرگودھا)، محمد شکیل عباس (سرگودھا)، محمد صدیق عرفان (یو ایس اے)، نعیمہ تبسم چودھری (جہلم)، محمد الیاس (منڈی بہاؤالدین)، محمد افضل بھٹی (خانیوال)، عادل فرقان (چشتیاں)، رضوان اکرم (میرپور)، فیصل قریشی (راولپنڈی)، خضریٰ بتول (مظفر گڑھ)، حسن روحانی (گوجرانوالہ)، حسن البناء (اسلام آباد)، مریم شیخ (ملتان)، بشریٰ حبیب (کراچی)، شارق اعجاز (لاہور)، ڈاکٹر عبدالعزیز چشتی (جھنگ)، امتیاز حفیظ یوسف (سیالکوٹ)، اقصیٰ امتیاز (سیالکوٹ)

دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

انچارج کوئز:
غلام سجاد

یہی ہے قصۂ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

آپ کو ۶ ماہ تک اردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- خضریٰ بتول (مظفر گڑھ)
- احمد فرقان (بہاولنگر)

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتا اور موبائل یا پی ٹی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچ پاتا۔ (ایڈیٹر)

www.pdfbooksfree.pk

قصہ کوئز/۱

بابا فرید، صوفی بزرگ، فرید الدین لقب۔ ۵۶۹ھ/۱۱۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ اس قصبے کا موجودہ نام چاؤلی مشائخ ہے۔ والد جمال الدین سلیمان بھی صوفی تھے۔ والدہ قرسم خاتون زہد وتقویٰ کی بنا پر رابعہ عصر کہلاتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم کھوتووال میں اور پھر ملتان میں مولانا منہاج الدین ترمذی سے ان کی مسجد میں اسلامی فقہ کی مشہور کتاب ''النافع'' پڑھی۔ وہیں ان کی ملاقات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ہوئی۔ چناں چہ انہی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ علوم ظاہری و باطنی کے لیے غزنی، بغداد، سیستان، بدخشاں اور قندھار کا سفر اختیار کیا اور اس زمانے کے مشہور صوفیا سے اکتساب فیض کیا۔ ۱۲۳۹ء میں آپ کو خرقہ خلافت ملا، تو آپ نے پاک پتن کو، جو اس زمانے میں اجودھن کہلاتا تھا، مستقل اقامت بنایا۔ زیادہ تر وقت جنگلوں میں گزارا۔

(الف) آپ کا اصل نام کیا تھا اور آپ کہاں پیدا ہوئے؟

(ب) آپ کہاں مدفن ہیں اور آپ کا مزار کس نے بنوایا؟

قصہ کوئز/۲

بابر ظہیر الدین، مغل بادشاہ۔ ماں پیار سے بابر (شیر) کہتی تھی۔ باپ عمر شیخ مرزا فرغانہ (ترکستان) کا حاکم تھا۔ بابر باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی طرف سے چنگیزی چنگیزی تھا۔ بارہ برس کا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ چچا اور ماموں نے شورش برپا کر دی، جس کی وجہ سے گیارہ سال تک پریشان رہا۔ بالآخر ۱۵۰۴ء میں کابل اور بلخ کا حاکم بن گیا۔ فتح سمرقند کے بعد قندھار پر حملہ کیا تاکہ آبائی مقبوضات ہاتھ آ جائیں۔ آخری ناکامی کے بعد ہندوستان کا رخ کر لیا۔ پہلے باجوڑ، علاقہ سرحد بھیرہ، سیالکوٹ فتح کیا۔ ۱۵۲۴ء میں دولت خان لودھی کی دعوت پر لاہور آیا اور دیپالپور فتح کر لیا۔ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو (پانی پت کی پہلی لڑائی میں) شکست دے کر دہلی و آگرہ پر قابض ہوا۔

(الف) تاریخ پیدائش بتائیں اور مشہور خودنوشت کا نام بتائیں؟

(ب) کب اور کہاں وفات پائی؟

قصہ کوئز/۳

فیلڈ مارشل، ایوب خان، سابق صدر پاکستان۔ قیام پاکستان کے بعد وزیرستان میں بریگیڈیئر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان میں میجر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ ۱۹۵۰ء کے وسط میں پاکستان آرمی کے ایڈجوٹنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۷/جنوری ۱۹۵۱ء کو پاک آرمی کے پہلے مسلمان کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں محمد علی بوگرہ کی کابینہ میں ملک غلام محمد گورنر جنرل کی سفارش پر وزیر دفاع مقرر ہوئے۔ اسی وزارت نے ''ون یونٹ'' کا منصوبہ تیار کیا۔ ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صدر مملکت سکندر مرزا نے مارشل لا نافذ کیا اور جنرل محمد ایوب خان کا تقرر سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کیا گیا، لیکن یہ دوعملی آپ کو پسند نہ آئی اور بیس روز بعد ۲۷/اکتوبر کو آپ نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ سکندر مرزا کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ وہ ملک سے باہر چلے گئے۔ اب جنرل محمد ایوب خان پاکستان کے صدر بھی تھے۔

(الف) کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(ب) آپ نے کب وفات پائی اور کہاں دفن ہیں؟

انعامات کے لیے تعاون

منشورات

خوبصورت اور معیاری کتب کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور

042-35434909

042-35425356

www.pdfbooksfree.pk

قدرتی وسائل سے مالا مال "بدقسمت" پاکستان

وطن عزیز قدرتی وسائل کے اعتبار سے دنیا کے امیر ترین ممالک میں شامل ہے۔ پاکستان میں کوئلے اور گیس کے وسیع ذخائر واقع ہیں، لیکن ہم لوڈشیڈنگ کے عذاب سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تانبے و سونے کی کانیں بھی ہیں، لیکن ہماری معیشت آئی ایم ایف کے دیے گئے قرضوں سے چلتی ہے۔

پاکستان میں پانچ دریا واقع ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ان پر ڈیم بنا کر ۵۰ ہزار میگا واٹ بجلی بن سکتی ہے۔ مگر ہم بجلی کی کمی کو روتے ہیں۔ ہم ایٹمی طاقت اور چھٹی بڑی فوج رکھتے ہیں مگر کئی برس دہشت گردوں کے یرغمال بنے رہے۔ گندم اور چاول کی پیداوار میں ہمارا شمار بڑے ممالک میں ہوتا ہے۔ لیکن آئے دن لوگ بھوک و غربت کے باعث خودکشیاں کرتے ہیں۔

درج بالا خرابیاں اس لیے پیدا ہوئیں کہ ہمیں اہل و ایمان دار قیادت میسر نہ آسکی۔ حکمرانوں کی توجہ اپنے مفادات کی سمت مرکوز رہی اور وہ ملک کا اچھا انتظام (گڈ گورننس) نہیں کر سکے۔ اب بھی ہمیں محب وطن حکمران مل جائیں جو قدرتی وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھائیں، تو پاکستان ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔ (سارہ خالد، کراچی)

قومی تمغے یا مذاق

ہم سنتے آئے ہیں کہ حکومت کے کارپرداز ہر سال من پسند شخصیات میں قومی تمغے تقسیم کرتے ہیں۔ ایک شخصیت کے کارناموں اور خدمات کی جانچ پرکھ کا کوئی معیار نہیں اور یہ ایوارڈ ذاتی تعلقات کی بنیاد پر ریوڑیوں کے مانند بانٹے جاتے ہیں۔ اس سال یہ بات درست ثابت ہوئی۔

روزنامہ ڈان کی خبر کے مطابق اس سال پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرنگ اینڈ ایپلائیڈ سائنسز کے ایک ایسے پروفیسر کو تمغہ امتیاز دیا گیا جو مرتے میں ملوث ہے۔ اس کو ہائیر ایجوکیشن کمیشن "بلیک لسٹ" کر چکا تھا۔ اسے کہتے ہیں:

www.pdfbooksfree.pk

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی...... ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا! (سعید احمد، لاہور)

اسلام آباد میں ’’ون ڈش‘‘

۲۰۰۶ء میں سپریم کورٹ پاکستان نے حکومت کو حکم دیا تھا کہ اسلام آباد کے وفاقی علاقے میں قائم شادی ہالوں میں ایک کھانے (ون ڈش) کو رواج دیا جائے۔ لیکن بااثر و طاقتور انتظامیہ نے اس حکم پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اب نواز شریف حکومت نے حکم دیا ہے کہ عدالتی فیصلے پر سختی سے عمل درآمد کرایا جائے۔ یہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔

پاکستان میں شادی کی تقریبات میں بے انتہا فضول خرچی ہوتی ہے۔ کئی طرح کے کھانے پکتے اور غیر ضروری بتیاں لگائی جاتی ہیں۔ میرا مطالبہ ہے کہ پورے پاکستان پر درج بالا عدالتی فیصلہ لاگو کیا جائے۔ ہم ایک غریب ملک کے باسی ہیں اور سادگی کو رواج دینے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ (خان اعظم، اسلام آباد)

قارئین کے تبصرے

اردو ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں۔ پڑھتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کرتا ہوں۔ شمارہ اپریل میں سورۂ یٰسین کی کرامت، لال جوڑا اور بوڑھی کی تنہائی عمدہ تحریریں تھیں۔

(عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ، لاہور)

شمارہ پسند آیا

شمارہ اپریل پسند آیا۔ ’’مشورہ حاضر ہے‘‘ شروع کر کے ہماری خواہش کی تکمیل کر دی گئی۔ شکاریات اور سفر نامہ پر بھی تحریریں دیجیے۔

(محمد منور خان، کوٹ سنبلانوالہ، میانی، ضلع سرگودھا)

پاکستان کو بلبن مل گیا

ہندوستانی بادشاہ غیاث الدین بلبن کے زمانے (۶۶۔۱۲۸۶ء) میں خونخوار منگولوں نے ہندوستان پر یلغار کیے رکھی۔ تب بلبن نے سب سے زیادہ اندرونی استحکام کی طرف توجہ دی تاکہ بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

پاکستانی قوم کو خوش خبری ملے کہ جنرل راحیل شریف کی صورت ہمیں بھی ایک بلبن مل گیا۔ ۲۳؍مارچ کو ان کی زیرقیادت پاک افواج نے اپنی طاقت و صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ ایٹمی پاکستان اندرونی و بیرونی دشمنوں کو منہ توڑ جواب دے سکتا ہے۔

آئی ایس پی آر کے سابق سربراہ، میجر جنرل (ر) اطہر عباس کا یہ بیان چشم کشا ہے کہ سابق سربراہ، جنرل اشفاق کیانی جنوبی وزیرستان میں عسکری آپریشن شروع کرنے سے ہچکچاتے رہے۔ اس ہچکچاہٹ کو تحریک طالبان نے بزدلی سمجھا اور وہ دیدہ دلیری سے پاکستانی قوم پر حملہ آور ہو گئے۔

اب یہ امر خوش آئند ہے کہ سیاسی اور عسکری قیادت شانہ بشانہ کھڑی ہے۔ ان کی کوششوں سے عوام کا اعتماد بحال ہوا ہے۔ نیز حکومت کی بھرپور سعی ہے کہ ملک میں امن و امان قائم کیا جائے۔ (عباس زیدی، لاہور)

محمد علی نیکوکارا کی برطرفی

اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت کو دیانت داری اور اہل سرکاری افسروں کی تلاش میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ دوسری طرف اسلام آباد کے نیک نام ایس ایس پی، محمد علی نیکوکارا کو برطرف کر دیا گیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پچھلے دو سال میں اسلام آباد کے آئی جی دو بار تبدیل ہو چکے۔

وزیراعظم نواز شریف کے پہلے دور حکومت میں صدر غلام اسحاق خان سے اختلافات رہے۔ دوسرے دور حکومت میں چیف جسٹس سجاد علی شاہ، صدر فاروق لغاری اور پھر جنرل جہانگیر کرامت سے تعلقات خراب رہے۔ جنرل پرویز مشرف سے مجادلہ ہوا، تو انھوں نے ان کا بوریا بستر ہی گول کر ڈالا۔

اب تک وزیراعظم کو سمجھ جانا چاہیے کہ ملک ’’ون مین

شو" کی بنیاد پر نہیں چلائے جاتے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک میں آزاد و خودمختار سرکاری ادارے قائم ہوں جن کی سربراہی ایمان دار و اہل افسروں کے ذمے لگائی جائے۔ پھر کسی افسر کی تعیناتی، تبادلے اور برطرفی کے فیصلے متعلقہ ادارے ہی کریں، یہ وزیراعظم یا صدر کا کام نہیں۔

(صائمہ نواز، کوئٹہ)

والدہ کا انتقال

میری والدہ شرافت، دیانت اور محنت کا حسین مرقع تھیں جو تین ماہ پہلے وفات پا گئیں۔ لگتا ہے کہ ہم ایک گھنے سایہ دار شجر سے محروم ہو گئے۔ میرا سائبان مجھ سے چھن گیا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے اور مرحومہ کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

(رانا محمد شاہد، گلستان کالونی، بورے والا)

ٹی وی چینلوں کا حال

پچھلے ماہ یہ سننے میں آیا کہ حکومت ٹی وی چینلوں کو اخلاقیات و اصولوں کے دائرے میں لانے کے لیے ایک قانون بنا رہی ہے۔ مجھے علم نہیں کہ یہ کس قسم کا قانون ہو گا، تاہم یہ حقیقت ہے کہ سبھی پاکستانی ٹی وی چینل ناپختہ اور ناتجربے کار ہیں۔ یہ بی بی سی اور سی این این کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن نتیجہ اس ضرب المثل کے مطابق نکلتا ہے: "کوا چلا ہنس کی چال، تو اپنی بھی بھول گیا۔"

مثال کے طور پر انھیں "بریکنگ نیوز" کا پتا تو چل گیا مگر اب تک اسے نہیں سمجھ سکے۔ وہ ہر حادثے کو "بریکنگ نیوز" سمجھ کر ایک آدھ گھنٹے تک مسلسل چلاتے ہیں۔ انھیں احساس تک نہیں ہوتا کہ کوئی خبر اس معیار پر پوری اترے بھی، تو بریکنگ نیوز چند منٹ میں باسی ہو جاتی ہے۔

مزید برآں پیش کار عموماً مہذب اور پُرسکون انداز میں خبریں نہیں سناتے۔ چہرے کے تاثرات اور آواز کے زیر و بم سے لگتا ہے کہ اگلے ہی لمحے آسمان گرنے والا ہے۔ حتیٰ کہ سنجیدہ خبریں بھی بے چینی اور گھبراہٹ میں سنائی جاتی ہیں۔

جرائم کی خبروں کو خوب اہمیت دی جاتی ہے۔ انھیں مرچ مسالا لگا کر سنایا جاتا ہے۔ لیکن جرائم کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا نئی نسل کو بگاڑنے کے مترادف ہے۔

مجھے یاد ہے، پی ٹی وی کے زمانے میں خبرنامہ آدھے گھنٹے کا ہوتا تھا۔ تب شروع میں قومی اور عالمی نوعیت کی خبریں سنائی جاتیں۔ پھر صوبائی خبروں کا نمبر آتا۔ آخر میں کھیل اور فلم کی خبریں سننے کو ملتیں۔

اب یہ ہو رہا ہے کہ ٹی وی چینل سب سے پہلے کھیلوں اور فلموں کی خبریں سناتے ہیں۔ کیا ہمارا ذوق اتنا خراب ہو چکا؟ ٹی وی چینلوں کی بدروش دیکھ کر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں: "گھوڑے کو دوڑنے دو، ٹی چینلوں کو لگام ضرور دو۔"

(شفیق احمد خان، حیدرآباد)

وطن عزیز کا نظامِ تعلیم

ایک قوم کو ترقی یافتہ اور خوشحال بنانے کے لیے معیاری تعلیم نظام انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن پاکستان میں الٹی گنگا بہ رہی ہے۔ پچھلے بیس پچیس برس کے دوران گلی محلوں میں اسکول، کالج، ٹیوشن سنٹر اور اکیڈمیاں کھل چکیں۔ ان میں سے بیشتر کا مدعا پیسا کمانا ہے، اچھے طلبہ و طالبات پیدا کرنا نہیں۔

یہی وجہ ہے، طلبہ کی اکثریت رٹا لگا یا نقل مار کر پاس ہوتی ہے۔ وہ تقریباً صفر تعلیمی قابلیت رکھتے ہیں، مگر دولت یا سفارش کے بل پہ ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یوں محنت کر کے کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات کی حق تلفی ہوتی ہے۔

حکومت پاکستان سے میرا مطالبہ ہے کہ قومی نظامِ تعلیم کا معیار بلند کیا جائے۔ اسے کم از کم پڑوسی ممالک مثلاً بھارت، سری لنکا اور بنگلہ دیش کی سطح پر ضرور آنا چاہیے۔

(ثمینہ، گجرات)

www.pdfbooksfree.pk

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ اپریل میں دیے گئے اسلامی کوئز کے صحیح جوابات

اسلامی کوئز ۱۔ (الف) ابوحذیفہ (ب) جنگ یمامہ اسلامی کوئز ۲۔ (الف) ابوذرغفاری (ب) مدینہ میں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ کمانڈر (ر) محمد سلیمان (اٹک) 2۔ شارفہ الیاس (منڈی بہاؤالدین) 3۔ مدثرہ خلیل (جہلم) 4۔ حسن البنا (اسلام آباد)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

محمد صدیق عرفان (یو ایس اے)، نفاست حنیف احمد (کراچی)، عبیر حنیف احمد (کراچی)، کوثر حنیف احمد (کراچی)، کمانڈر (ر) محمد سلیمان (اٹک)، ناعمہ تحریم (کراچی)، منظر حسن (کراچی)، ماہ رخ (حیدرآباد)، طٰہٰ یسین (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، حیان کاشف (حیدرآباد)، ولی حسین (حیدرآباد)، توصیف احمد (حیدرآباد)، عاطف ممتاز (چکوال)، محسن حبیب (فیصل آباد)، عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، محمد بلال حسن (سرگودھا)، محمد تنزیل عباس (سرگودھا)، محمد مبشر عباس (سرگودھا)، محمد شکیل عباس (سرگودھا)، شارفہ الیاس (منڈی بہاؤالدین)، مدثرہ خلیل (جہلم)، رضوان اکرم (حیدرآباد)، فیصل قریشی (راولپنڈی)، صائم ظفر (راولپنڈی)، حسن روحانی (گوجرانوالہ)، حسن البنا (اسلام آباد)، مریم شیخ (ملتان)

اسلامی کوئز ۱

سورۂ روم مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورۃ کے آغاز میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آج رومی مغلوب ہو گئے ہیں لیکن چند سال بعد وہ پھر غالب آ جائیں گے اور لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت ہوگا کہ اب ان کی سلطنت کا خاتمہ قریب ہے۔ وہی وقت مسلمانوں کے لیے اپنے دشمنوں پر غلبے کا ہوگا۔ اس سورۃ میں غلبہ اسلام کی صریح پیش گوئی ایک مقررہ وقت تک کے لیے کی گئی ہے۔ پہلے رکوع میں رومیوں کے مغلوب ہونے کے بعد غالب آنے کی پیشگوئی کر کے اس کی معیاد نو سال قرار دے کر اس بات کی تصریح کر دی گئی کہ مسلمانوں کی کامیابی کا وقت بھی یہی ہوگا۔

(الف) اس سورۃ میں کتنے رکوع ہیں؟ (ب) یہ سورۃ قرآن پاک کے کون سے پارے میں ہے؟

اسلامی کوئز ۲

جلال الدین رومی بلخ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سلطان العلما بہاؤالدین مشہور و معروف عالم تھے۔ انھیں ترک وطن کر کے روم (ایشیائے کوچک) کے شہر قونیہ میں آباد ہونا پڑا۔ والد اور سید برہان الدین محقق سے علوم معقول منقول پڑھے۔ حصول علم کے لیے حلب اور دمشق میں بھی سات سال گزارے اور پھر تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۲۴۴ء میں شمس تبریزؒ سے ملاقات ہوئی، جس سے رومی کی زندگی میں ایک روحانی انقلاب آیا۔ علوم کو چھوڑ کر تصوف و عرفان میں ڈوب گئے۔ شمس تبریزؒ سے جدائی کے بعد ان کی یاد میں پرسوز غزلیں لکھیں۔ مولانا کا شاہکار ''مثنوی معنوی'' ہے۔ اس میں حقائق معرفت، تصوف کے حکیمانہ مسائل اور گراں بہا نیز اخلاقی مضامین جمع ہو گئے۔

(الف) آپ کی تاریخ پیدائش و وفات بتائیں؟ (ب) آپ کے دیوان کا نام کیا ہے؟

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے ورنہ TCS پہنچ نہیں پاتا اور گزشتہ کئی ماہ سے ہمیں TCS واپس مل رہے ہیں۔ (مدیر اردو ڈائجسٹ لاہور)

انعامات سے بہ تعاون
اسلامک پبلی کیشنز
منصورہ ملتان روڈ لاہور

www.pdfbooksfree.pk